شوکت تھانوی

ڈاکٹر
سعید مُرتضیٰ زیدی

✿

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ◎ لاہور

شوکت تھانوی

ڈاکٹر
سعید مرتضیٰ زیدی

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ◎ لاہور

ڈاکٹر سید معین الرحمن

اور

اپنی رفیقۂ حیات

عشرت سلطانہ

کے نام

جملہ حقوق محفوظ

تحقیقی مقالات (۱)
سلسلۂ مطبوعات : ۷۷

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
جنرل سیکرٹری ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
۰۳۷- این/سمن آباد ، لاہور
طابع : طارق نصیر بیگ
مطبع : جدید اردو ٹائپ پریس ، ۹۳۰- چیمبرلین روڈ ، لاہور
تعداد : ایک ہزار
صفحات : ۸+۲۸۲
قیمت : ۸۰ روپے

ترتیب

صفحہ

پہلی بات ح
پہلا باب : (۱) حالات زندگی ۱
(۲) شخصیت
دوسرا باب : تصنیفی سرمایہ ۶۱
تیسرا باب : شاعری ۸۷
چوتھا باب : (۱) مضمون نگاری ۱۱۷
(۲) افسانہ نگاری
پانچواں باب : ناول نگاری ۱۵۹
چھٹا باب : ڈراما نگاری ۱۸۳
ساتواں باب : (۱) خاکہ نگاری ۲۱۹
(۲) آپ بیتی
آٹھواں باب : صحافت ۲۳۷

پہلی بات

شوکت تھانوی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت اردو ادب کی بہت سی اصناف میں خدمات سرانجام دی ہیں ۔ ان کی متنوع ادبی خدمات کے پیش نظر اس وسیع موضوع کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود حتی الامکان میں نے تحقیقی کاوش و جستجو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔

تحقیقی مقالے کی تحریر کے دوران میں مجھے شوکت تھانوی کی بعض ایسی تحریریں بھی دستیاب ہوئیں جو ان کی کسی تصنیف یا مجموعے میں شامل نہیں ۔ میں نے اپنے مقالہ میں منجملہ دوسرے مآخذ کے اس مواد سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ مجھے یہ مواد شوکت تھانوی کی دوسری بیگم زہرہ شوکت اور منجھلے صاحبزادے خورشید شوکت نے فراہم کیا جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں ۔

اس مقالے کی تیاری میں استاد مکرم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی ہدایات مقالہ کے خاکے سے لے کر اس کے اختتام تک میرے لیے مشعل راہ رہی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی ان گنت مصروفیات کے باوجود اس کے اہم مقامات مکمل طور پر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی اور رہنمائی بھی کی ۔ ان کی توجہ اور عنایات سے اگرچہ اکثر بہرہ اندوزی کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن اس کرم گستری کو میں اپنے لیے بالخصوص سرمایۂ افتخار سمجھتا ہوں ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن نے فراہمیٔ مواد کے سلسلے میں میرا بڑا ہاتھ بٹایا ۔ میں جب بھی اور جس وقت بھی پہنچا انھوں نے بکمال مہربانی میری مشکلات حل کیں ۔ بعض موقعوں پر اپنی وقت بے وقت کی ملاقاتوں کا مجھے احساس بھی ہوا مگر شاید میں بھی اپنی جگہ ''حق بجانب'' تھا ۔ میں ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹنے دیا اور مقالے کی تیاری میں جو کچھ ممکن تھا اس سے استفادے کا موقع دینے میں کسی طرح کا حجاب نہیں رکھا ۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جمع کرایا گیا ، جولائی ۱۹۸۶ء میں ڈگری عطا ہوئی۔ اب کچھ ضخامت کم کرکے ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' کی جانب سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ استاد محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کے پرخلوص مشوروں ، تعاون اور ترغیب کے بغیر یہ کتاب نہ تو ترتیب دی جا سکتی تھی اور نہ اس نفاست سے شائع ہی ہو سکتی تھی۔ اُن کا بار بار شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔

سعید مرتضیٰ زیدی

۲۹ جون ۱۹۸۸ء

حالات زندگی اور شخصیت

پہلا باب

حالات زندگی اور شخصیت

شوکت تھانوی کا آبائی وطن یو۔ پی کے ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ تھانہ "بھون" ہے۔ شوکت تھانوی کے والد منشی صدیق احمد کے تین بھائی تھے۔ حبیب احمد، سلطان احمد اور فیاض احمد۔ سب سے چھوٹے بھائی فیاض احمد تمام عمر تھانہ "بھون" میں رہے جبکہ باقی تین بھائی ملازمت کے سلسلہ میں تھانہ "بھون" سے باہر رہے۔ شوکت تھانوی کے والد منشی صدیق احمد آغاز جوانی میں ایک معاشقہ میں ناکامی کے بعد وطن سے لکھنؤ چلے گئے جہاں محکمہ پولیس میں ملازم ہو گئے اور لکھنؤ کے ایک ممتاز صدیقی خاندان میں شادی کر لی۔ صدیق احمد یوں تو ملازمت کے سلسلہ میں یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں رہے لیکن انھوں نے مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کی۔ جہاں سبزی منڈی کے پاس اپنا ذاتی مکان بنوایا جو زرد کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کوٹھی کے ایک طرف آغا باقر کا امام باڑہ تھا دوسری طرف جنت کی کھڑکی تھی اور تیسری طرف چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی تھی۔

شوکت تھانوی اپنی ولادت اور تاریخ ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "بندرا بن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد صاحب مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اب اولاد کی تمنا تو پوری ہو گئی مگر ہمارے بزرگ لڑکی کو نصف اولاد سمجھا کرتے تھے۔ جس طرح لڑکی کا شوہر آج بھی اس کو نصف بہتر سمجھنے کا قائل ہوتا ہے۔ منشی صدیق احمد صاحب اس طرح نصف صاحب اولاد ہو کر اپنی نصف بہتر کے $\frac{1}{2}$ قائل ہو سکے اور اپنے ارمان کی تکمیل کے لیے پھر چار سال تک بے چارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ دو فروری انیس سو چار عیسوی کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی

> پوری ہوگئی اور اولاد نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پر ہوگئی۔“[1]

شوکت تھانوی نے ریڈیو کی ایک تقریر میں اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے بھی اپنی تاریخ ولادت دو فروری انیس سو چار عیسوی ہی بتائی ہے۔ اس سرگذشت کو محمد طفیل صاحب نے ”نقوش“ کے ”شوکت نمبر“ میں شامل کیا ہے۔ اس سرگذشت میں شوکت تھانوی بتاتے ہیں:

> ”یہ حادثہ دو فروری انیس سو چار عیسوی کو بندرا بن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے ہی اور اگر کوئی اس کو گستاخی کہے تو بھی اس بے ساختہ گستاخی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔“[2]

شوکت تھانوی نے تقریباً ہر جگہ اپنی تاریخ ولادت دو فروری انیس سو چار عیسوی ہی تحریر کی ہے۔ لیکن ان کے تایا زاد بھائی اور بہنوئی ارشد تھانوی نے ان کی تاریخ ولادت فروری انیس سو پانچ عیسوی بتائی ہے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”میرے والد شیخ سلطان احمد بھوپال ہائیکورٹ کے مشہور وکیل فوجداری تھے۔ ماہ فروری انیس سو پانچ عیسوی میں ان کو اپنے چھوٹے بھائی صدیق احمد کا تار ملا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ان دنوں چچا جان بندرا بن ضلع متھرا میں کوتوال تھے۔ میرے والد نے اس نومولود کا نام ”تسخیر احمد“ از روئے اعداد ابجد نکالا جس سے تیرہ سو تئیس ہجری برآمد ہوتا ہے۔ چچا جان، ان کی بیگم اور دوسرے افراد خاندان ایک تارک الدنیا بزرگ کے جو بڑے مولانا صاحب کہلاتے تھے، بہت معتقد تھے۔ ان ہی مقدس انسان کے صاحبزادے حضرت مولانا عین القضاۃ بانیٔ مدرسۂ قرآن تھے۔ جہاں سے حفاظ قرآن کی دیندار جماعتیں اب بھی نکلتی رہتی ہیں۔ چچا جان کے یہاں شادی کے بعد عرصۂ دراز تک اولاد نہ ہوئی، بڑے مولانا

۱۔ شوکت تھانوی: ”مابدولت“ ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۱۸۔

۲۔ شوکت تھانوی: ”میری سرگذشت“ مطبوعہ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۔

> صاحب سے دعا کرائی گئی اور انیس سو ایک عیسوی میں چچا جان کے یہاں رنکتہ ضلع آگرہ میں ایک بیٹی پیدا ہوئی چونکہ یقین یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اولاد بڑے مولانا صاحب کی دعا قبول فرما کر دی ہے ، انہی سے نام رکھنے کی استدعا کی گئی ۔ انہوں نے ''ظہورآ'' نام تجویز کیا ۔ میرے والد نے بھتیجی کے نام کو سابقے کا بنا کر تاریخی حیثیت دے دی اور ظہورآ کو ظہور فاطمہ بیگم بنا دیا جس سے سنہ پیدائش تیرہ سو اٹھارہ ہجری برآمد ہوتا ہے ۔ اس بچہ کا نام بھی بڑے مولانا صاحب کے ارشاد کے مطابق محمد عمر رکھا گیا ۔''[1]

اس اقتباس میں ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کی تاریخ پیدائش فروری انیس سو پانچ بتائی ہے ۔ ان کا نام ''تسخیر احمد'' ہے اور ہجری سن کے اعتبار سے سن پیدائش تیرہ سو تئیس ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ ''تسخیر احمد'' کے اعداد نکلنے سے تیرہ سو تئیس ہی برآمد ہوتا ہے ۔ تقویم تاریخی از عبدالقدوس ہاشمی مطبوعہ مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی ، کراچی انیس سو پینسٹھ عیسوی اور

The Muslim and Christian calendars by G. S. P. Freeman Grenville Oxford University Press, New York, Toronto, 1963.
کے مطابق تیرہ سو تئیس ہجری کے عیسوی آغاز اور اختتام کی تاریخیں یہ ہیں :

> ۱۳۲۳ھ ، ۸ مارچ ۱۹۰۵ء تا ۲۴ فروری ۱۹۰۶ء (تیرہ سو تئیس ہجری ، آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی تا چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی) ۔

اس کا مطلب یہ ہوا تیرہ سو تئیس ہجری کا آغاز آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی سے ہوا اور اختتام چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی کو۔ شوکت تھانوی کے تاریخی نام ''تسخیر احمد'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش یعنی دو فروری انیس سو چار عیسوی درست معلوم نہیں ہوتی ۔ ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کی تاریخ پیدائش فروری انیس سو

---

[1] ارشد تھانوی : ''شوکت سلمہ'' مطبوعہ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء ، لاہور ، صفحہ ۴۳۶ ۔

پانچ عیسوی تحریر کی ہے۔ جبکہ تیرہ سو تئیس ہجری کا آغاز ۸ مارچ انیس سو پانچ سے ہوتا ہے۔ گویا ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کا سال پیدائش انیس سو پانچ عیسوی تو درست لکھا لیکن مہینہ صحیح طور پر انہیں بھی یاد نہیں رہا۔

اس رائے کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ارشد تھانوی نے اپنے ایک اور مضمون میں، جو ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ کے شوکت تھانوی نمبر میں شائع ہوا ہے، شوکت تھانوی کی پیدائش کے بارے میں صرف سال لکھا ہے مہینہ یا تاریخ بیان نہیں کی۔ وہ لکھتے ہیں: ''شوکت کی ولادت آغاز انیس سو پانچ عیسوی میں بندرا بن ضلع متھرا میں ہوئی۔''[۱]

ارشد تھانوی نے ظہور فاطمہ بیگم کا سال پیدائش انیس سو ایک عیسوی بتایا ہے۔ تاریخی نام کے حوالہ سے اس بات کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ ظہور فاطمہ بیگم کی ولادت یکم جنوری انیس سو ایک عیسوی سے ۱۹، اپریل انیس سو ایک عیسوی تک کے عرصہ میں ہوئی چونکہ تیرہ سو اٹھارہ ہجری کا آغاز یکم مئی انیس سو عیسوی سے ہوتا ہے اور یہ ہجری سال انیس اپریل تک جاری رہتا ہے۔

شوکت تھانوی نے ''مابدولت'' میں تحریر کیا ہے کہ منشی صدیق احمد کے بارہ سال تک اولاد نہ ہوئی۔ بہت منتوں مرادوں کے بعد ظہور فاطمہ بیگم پیدا ہوئیں جن کی تاریخ ولادت ارشد تھانوی کے مطابق تیرہ سو اٹھارہ ہجری یا انیس سو ایک عیسوی ہے اسی طرح شوکت تھانوی کی تاریخ آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی کے بعد اور چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی سے پہلے ہو سکتی ہے۔ شوکت تھانوی کی بیگمات اور ان کے قریبی عزیزوں سے گفتگو کرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اولاد اور بیگمات اس سلسلہ میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔ شوکت تھانوی کی شخصیت اور کردار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ان کا ''برج'' تلاش کیا جائے تو وہیں ان کا برج ''حوت'' نظر آتا ہے۔ ''حوت مردوں'' میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں وہ سب کی سب ہی شوکت تھانوی میں نظر آتی ہیں اور برج حوت سے تعلق رکھنے والے لوگ بیس فروری تا بیس مارچ کی تاریخوں میں پیدا ہوتے

---

[۱] ارشد تھانوی: ''برادر عزیز'' مطبوعہ ماہنامہ کتاب لکھنؤ شوکت تھانوی نمبر، جولائی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۹۔

ہیں ۔ اس اعتبار سے بھی غالب یہی ہے کہ شوکت تھانوی کی پیدائش مارچ انیس سو پانچ عیسوی میں ہوئی ۔

شوکت تھانوی کی پیدائش کے چار سال بعد منشی صدیق احمد کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی (انیس سو نو عیسوی میں) جس کا نام منظور فاطمہ رکھا گیا ۔ انیس سو بارہ عیسوی میں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شفیق احمد رکھا گیا ۔ اس طرح منشی صدیق احمد کے یہاں چار اولادیں ہوئیں ۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں ۔ ظہور فاطمہ بیگم کی شادی ، ارشد تھانوی سے ہوئی جو بھوپال میں وکالت کرتے تھے اور اپنے وقت کے مشہور شاعر و ادیب تھے ۔ منظور فاطمہ کی شادی انعام الحق صدیقی سے ہوئی ۔ صدیقی صاحب آج کل کینیڈا میں ہیں جبکہ منظور فاطمہ کا انتقال ہو چکا ہے ۔ ان کے یہاں صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام نور فاطمہ ہے ، ان کی شادی قیصر حسن انصاری سے ہوئی جو آڈیٹر جنرل کے دفتر میں آفیسر ہیں اور لالو کھیت کراچی میں رہتے ہیں ۔

شفیق احمد ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ”فالج“ جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے جس کی وجہ سے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں بیکار ہوگیا تھا ۔ اس مرض کی وجہ سے ان کی شادی بھی نہیں ہو سکی اور بتیس سال کی عمر میں یعنی انیس سو چوالیس عیسوی میں ان کا انتقال ہوگیا ۔

شوکت تھانوی کی پیدائش کے چند ہی روز بعد منشی صدیق احمد بندرا بن کو چھوڑ کر ریاست بھوپال آ گئے جہاں پہلے وہ میونسپل بورڈ کے سرکاری چیئرمین ہوئے اور پھر منتظم پولیس کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوگیا ۔ یہ عہدہ سپرنٹنڈنٹ ضلع اور انسپکٹر جنرل کے درمیان وزارت کی زیر نگرانی ہوتا تھا ۔ ارشد تھانوی کے والد اور منشی صدیق احمد کے بھائی شیخ سلطان احمد پہلے ہی سے بھوپال میں ہائی کورٹ کے وکیل فوجداری تھے ۔ منشی صدیق احمد کے وہاں آ جانے سے شوکت تھانوی کو ارشد تھانوی جیسا بھائی ناز برادری کے لیے مل گیا ۔ ارشد تھانوی نے ایک مضمون میں اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ”میں خود بھی نوعمر یعنی ۱۸ ، ۱۹ سال کا تھا اور ریاست کے قوانین رٹ رٹ کر امتحان وکالت کی تیاری کر رہا تھا ۔ اس مصروفیت سے جتنا وقت ملتا ممدوح یعنی کم عمر کی ناز برادری میں گذرتا ۔ اسے گھٹنوں پر بٹھا کر جھو جھو کرتا ، کندھے پر بٹھا کر صحن

میں ٹہلتا، دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھالتا، جب وہ کھلکھلا کر ہنستا تو میں باغ باغ ہو جاتا۔''[1]

ارشد تھانوی اپنے ننھے منے بھائی کی ناز برداری میں مصروف تھے کہ دو سال بعد یو۔ پی۔ گورنمنٹ نے منشی صدیق احمد کو واپس طلب کر لیا۔ چونکہ بھوپال میں انہیں ایک وسیع حلقۂ احباب مل گیا تھا اس لیے واپس آ کر انگریز کی نوکری میں ان کا دل نہ لگا اور قبل از وقت پنشن لے کر پھر بھوپال آ گئے۔ یہاں کچھ عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک اہم خفیہ خدمت پر مامور رکھا۔ اس دوران پولیس کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا اور ایک سی۔ پی پولیس کے تجربہ کار عہدہ دار خان بہادر شیخ محمد سرور انسپکٹر جنرل مقرر ہو کر ریاست میں آ گئے اور افسر اعلیٰ نظام پولیس کہلاتے تھے۔ منشی صدیق احمد ان کے نائب یعنی ڈپٹی انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ارشد تھانوی نے منشی صدیق احمد کی بذلہ سنجی کا ایک واقعہ اپنے مضمون میں بیان کیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے اختیارات الگ الگ تھے۔

''پھر بھی دونوں میں چپقلش ہو جاتی تھی۔ اس کی بنیاد بعض لچی باتوں پر بھی استوار ہوتی چلی گئی۔ افسر اعلیٰ سیاہ فام، موٹے تازے اور کافی عمر کے انسان تھے۔ داڑھی منڈاتے، مونچھوں پر خضاب لگاتے اور سر کے بال بہت چھوٹے مشینی قینچی سے کترے ہوئے رکھتے تاکہ سفیدی زیادہ نمایاں نہ ہو۔ ایک روز چچا جان ان کے بنگلے پر گئے، وہ ننگے سر، کرتہ پہنے بیٹھے تھے، نائب افسر اعلیٰ صاحب کی اطلاع پر اسی طرح باہر نکل آئے۔ چچا جان نے دیکھتے ہی بڑے سادہ انداز میں کہا، میں ٹھہر جاتا۔ آپ نے ناحق غسل خانے سے آنے کی زحمت کی۔ افسر اعلیٰ نے کہا، نہیں تو۔ چچا جان بولے سر پر صابن کا پھین سا لگا ہوا ہے اس سے میں نے سمجھا۔ افسر اعلیٰ صاحب نے گھبرا کر سر پر ہاتھ پھیرا، معاف کیجیے گا، سفید چھوٹے بالوں پر مجھے پھین کا شبہ ہوا۔ افسر اعلیٰ اس پھبتی کو سمجھ تو گیا مگر کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر جواب دیا۔ آپ کی نظر زیادہ کمزور ہو گئی ہے، چشمہ لگایا کیجیے''۔[2]

اس قسم کی بذلہ سنجی صدیق احمد صاحب کو بہت مہنگی پڑی۔ چونکہ

۱۔ ارشد تھانوی: شوکت سلمہ'، مطبوعہ نقوش شوکت نمبر، ص ۳۳۶۔

۲۔ ارشد تھانوی، شوکت سلمہ، نقوش شوکت نمبر، ص ۳۳۷۔

شیخ محمد سرور صاحب سے ان کے تعلقات روز بروز کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے اور باہمی تلخی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ منشی صدیق احمد کو مستعفی ہوکر لکھنؤ جانا پڑا۔ لکھنؤ آنے کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''انیس سو چودہ عیسوی میں والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر بجائے تھانہ بھون جانے کے لکھنؤ کا رخ کیا۔ لکھنؤ سے ان کو سوائے سسرالی دلچسپی کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔''

شوکت تھانوی بچپن میں بیمار رہے اس لیے تعلیم کا سلسلہ ذرا دیر سے شروع ہوا۔ ان کی تعلیم کا آغاز بھوپال میں ہوا۔ ایک ماسٹر صاحب گھر پر تعلیم دینے کے لیے آتے تھے جنھوں نے اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں سے پڑھانا شروع کیا۔ ابھی پڑھاتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک دن منشی صدیق احمد نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے تلفظ پر جو غور کیا تو ان کا تلفظ غلط محسوس ہوا۔ اسی دن ان ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ ایک اور ماسٹر صاحب بلائے گئے سو چوتھے روز اس لیے نکال دیے گئے کہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ ایک اور ماسٹر صاحب آئے جن کا نام میر امجد علی تھا۔ سبق یاد کرو یا نہ کرو انھیں کوئی سروکار نہیں، نیا سبق چاہے پڑھو نہ پڑھو ان کو پیسے دے دو۔ اپنے حصے کی مٹھائی کھلا دو اس کے بعد جو دل چاہے سو کرو۔ ان باتوں کا علم جب منشی صدیق احمد کو ہوا تو انھوں نے ماسٹر صاحب کو الگ کر دیا۔ بھوپال میں اس وقت دو ہائی اسکول تھے، ایک الیگزنڈرا ہائی سکول اور دوسرا جہانگیریہ ہائی اسکول۔ اول الذکر میں اونچے طبقے کے اور آخر الذکر میں نیچے طبقے کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ شوکت تھانوی کا داخلہ الیگزنڈرا ہائی اسکول کی جماعت اطفال میں ہوا لیکن اس اسکول میں پڑھتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ان کے والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور لکھنؤ آ گئے۔

قیام بھوپال کے دوران منشی صدیق احمد نے شوکت تھانوی کے لیے پرائیویٹ ٹیوٹر بھی رکھے اور اچھے سے اچھے اسکول میں داخل بھی کروایا لیکن زیادہ اثرات انھوں نے ارشد تھانوی کے قبول کیے۔ انھوں نے ''مابدولت'' میں لکھا ہے کہ:

۱۔ شوکت تھانوی: ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۳۰ - ۳۱۔

''اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جد و جہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو حاصل ہو رہی تھی۔ ہمارے ذہن میں نہ معلوم یہ کیوں جم گیا تھا کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی معراج یہ ہے کہ وہ بھائی جان کا ایسا ہو جائے۔ ارشد صاحب ہمارے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں اور ان کے والد ہمارے بڑے ابا، اس زمانہ میں بھوپال ہی میں وکالت کرتے تھے۔ بھائی جان کو ہم نے اپنے لیے ایک معیار بنا لیا تھا۔ وہ سوٹ پہنتے تھے۔ ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم بھی سوٹ پہنیں۔ وہ بڑے ٹھسے سے چاء پیتے تھے۔۔۔۔ بھائی جان کی ادبی مشاغل کا رعب بھی قائم تھا، ہم ان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے تھے اور وہ جو باتیں کرتے تھے ان کو ہم ذہن میں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔''[1]

لکھنؤ آ کر کچھ عرصہ تک سلسلۂ تعلیم منقطع رہا۔ ان کی والدہ صاحبہ نے حضرت مولانا عین القضاۃؒ کے مدرسۂ فوقانیہ میں بھیج دیا۔ جہاں شوکت تھانوی نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اس مدرسے کی تعلیم اور ماحول کے بارے میں شوکت تھانوی نے ''مابدولت'' میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے ''پڑھائی سے زیادہ برے لڑکوں کی بری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کر دیے، نہایت موٹی موٹی گالیاں سبق سے زیادہ یاد کر لیں۔ بغل بجانے کے کرتب سیکھے، سڑک پر کھڑے ہو کر مداریوں کے تماشے دیکھنے لگے۔ مدرسہ جانے کے لیے گھر سے چلے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے لیے اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی میدان میں پہنچ گئے۔۔۔۔ مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں جو تربیت حاصل کی اس کے بعد ہم اسی قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پراٹھے کی دکان رکھ کر بیٹھ رہتے۔''[2]

شوکت تھانوی کی اس حالت کو سدھارنے کے لیے ان کی والدہ صاحبہ نے قدم اٹھایا اور اپنے میکے والوں کی مدد سے ماسٹر چھوٹے لال عاصم کو پرائیویٹ ٹیوٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ماسٹر صاحب بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ طالب علم پر سختی بھی نہ کریں اور

۱۔ شوکت تھانوی: ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۷ - ۲۸۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، صفحہ ۳۱۔

سبق بھی یاد کروا دیں۔ ان کی محنت سے شوکت تھانوی نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب اور کچھ حساب وغیرہ سیکھ لیا۔ منشی صدیق احمد نے اپنی بیگم صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود شوکت تھانوی کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ آمد نامہ خریدا گیا۔ چونکہ ان کا قول تھا کہ کسی کو آمد نامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسانی سے شیخ سعدی بن سکتا ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ شوکت تھانوی کو شیخ سعدی بنانے کی فکر میں رہے۔ ایک دن شوکت تھانوی کو آمد نامہ کا پہلا سبق آمد، آمدند، آمدی، آمدید، آمدم، آمدیم دیا اور کہا کہ ایک گھنٹے تک یہ سبق یاد کرکے مجھے سناؤ۔ شوکت تھانوی نے آنکھیں بند کرکے اس سبق کو رٹنے کی کوشش کی لیکن دماغ کسی طرح اس غیر زبان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ سبق سننے کا وقت آیا تو شوکت تھانوی کورے کے کورے ہی تھے۔ والد صاحب بہت ناراض ہوئے۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ مع بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر، معلوم یہ ہوتا تھا کہ فارسی کی سب سے بڑی فضیلت حاصل کی ہے اور یہ کوئی خاص ایرانی چغہ ہے جو ہم پہنے بیٹھے ہیں۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے۔ والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ ۔ ۔ ۔ ماموں صاحب نے آ کر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچا دیا اور والدہ صاحبہ نے سچے دل سے توبہ کی کہ اب کبھی والد صاحب کو ہماری تعلیم کی طرف متوجہ نہ کریں گی گویا یہ سبق والد صاحب نے ہم کو کم اور والدہ صاحبہ کو زیادہ تھا۔''[۱]

فارسی پڑھانے کے لیے شوکت تھانوی کو مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کیا گیا۔ مولانا فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ فارسی میں شعر بھی خوب کہتے تھے اور اکثر رؤسا کے یہاں فارسی پڑھانے جایا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی مولانا کے پڑھانے سے کچھ مطمئن نظر آتے ہیں، اس لیے وہ لکھتے ہیں:

۱۔ شوکت تھانوی، ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۳۷۔

> ''مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کر دیا کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلنشین تھا اور وہ کچھ اس انداز سے سمجھاتے تھے کہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر ان کی بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لیے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔''[۱]

فارسی کے بل ہوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی اس لیے شوکت تھانوی کی والدہ نے اپنے ایک بہنوئی سید محمد رضا عرف مدن کے کہنے پر انہیں لال اسکول میں داخل کروا دیا۔ سرخ رنگ ہونے کی بناء پر اسے لال اسکول کہا جاتا تھا۔ یہ دراصل چرچ مشن ہائی اسکول کی برانچ تھا جہاں مدن صاحب مولوی تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے شوکت تھانوی کو چوتھے درجے میں لے لیا گیا اور پہلے ہی سال چوتھی جماعت پاس کرکے پانچویں جماعت میں آ گئے۔ شوکت تھانوی کی طبیعت پڑھائی میں نہ لگتی تھی اس لیے نئے نئے بہانے کرکے وہ اسکول جانے سے بچ جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انھوں نے سینہ میں درد کے بہانے کی بہت کامیاب طریقے سے ایکٹنگ کی۔ وہ خود مابدولت میں اس اداکاری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''سینہ میں درد کے دورے پڑنے لگے۔ الامان و الحفیظ، اس قدر شدید درد کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ محفوظ تو خیر ہم بھی رہے مگر درد تھا بڑا ظالم۔ ایک تو یہ کہ ٹھیک ہونے دس بجے دن کو شروع ہوتا تھا۔ ساڑھے نو بجے اس لیے نہیں کہ ممکن تھا کہ لوگ کھانے کو منع کر دیتے اور دس بجے اس لیے نہیں کہ پھر بعد از وقت ہوتا وہ تو اس کا وقت مقرر تھا ساڑھے نو۔ کھانا کھا کر کتابیں سنبھالیں کپڑے پہن کر کھڑے ہوئے اور درد کا دورہ شروع ہو گیا۔ اب کوئی کتابیں سنبھال رہا ہے کوئی شیروانی اتار رہا ہے کسی نے ٹوپی تھامی تو کسی نے جوتا اتارا اور ہم کو کسی نہ کسی طرح بستر پر پہنچا دیا گیا۔ دس بجے، ساڑھے دس بجے اور آخر کم ہوتے ہوتے گیارہ بجے تک درد ختم اور اسکول غائب۔ اب ہم چاہے کھیلیں، چاہے چین کی بنسی بجائیں، کوئی

۱۔ شوکت تھانوی، ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۴۴، ۴۵۔

پوچھنے والا نہیں۔''[۱]

سینہ میں درد کے ان دوروں کی اصل وجہ یہ تھی کہ لال اسکول میں حساب کے ماسٹر بھولا ناتھ جی تھے۔ وہ اسکول میں جتنا پڑھاتے تھے اس سے کہیں زیادہ سوال گھر پر کرنے کے لیے دے دیتے تھے اور سوال نہ کیے جائیں تو بہت مارتے تھے۔ شوکت تھانوی چونکہ ان کا کام مکمل نہیں کر سکتے تھے اس لیے سکول کے وقت پر ان کے سینہ میں درد اٹھتا اور سکول جانے کا وقت گذر جاتا تو یہ درد ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں جماعت میں فیل ہو گئے۔ دوسرے سال خدا خدا کرکے پانچویں جماعت میں پاس ہوئے اور تیسرے سال چھٹی جماعت پاس کرکے لال اسکول کو چھوڑ دیا۔ چونکہ اس اسکول میں چھٹی جماعت ہی تک تعلیم دی جاتی تھی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد کا شمار لکھنؤ کے اچھے اسکولوں میں ہوتا ہے اس لیے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد شوکت تھانوی کو وہاں ساتویں جماعت میں داخلہ ملا۔ یہاں بھی انہوں نے تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی البتہ اس اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ حصہ لیا کرتے تھے۔ یہاں انہوں نے (Students own Club) کی بنیاد ڈالی جس کا سوشل سیکرٹری شوکت تھانوی کو مقرر کیا گیا۔ اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کے باعث انھوں نے اس اسکول کو میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا۔

کچھ دن بے کار پھرتے رہے۔ اچانک ان کے والد صاحب نے ایک ایسے استاد کی خدمات مستعار لیں جو چوبیس گھنٹے شوکت تھانوی کے ساتھ رہے۔ ان کا نام ماسٹر بخشش احمد تھا۔ چھوٹے قد کے یہ استاد بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بے حد باتونی تھے۔ پڑھانے پر وہ زیادہ زور نہیں دیا کرتے تھے بالکل کھلنڈرے انداز میں سبق دیتے تھے۔ ایسا انداز انھوں نے اس لیے اختیار کیا کہ شوکت تھانوی کے لیے سبق قابل نفرت چیز بننے کے بجائے قابل قبول ہو سکے۔ اپنے ان ماسٹر صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے:

''ان کا یہ طریقہ بھی بہت اچھا تھا کہ ہماری ہر معمولی سے معمولی

۱۔ شوکت تھانوی، ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۳۶۔

صلاحیت کی بے حد تعریف کرتے تھے اور کمزوریوں کو جہاں تک ہوتا تھا دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے۔ اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا، ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی، اس دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو اب تک تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھا کرتا تھا تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔''[۱]

اس زمانے میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور منشی صدیق احمد علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ شوکت صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا جائے، چنانچہ علی گڑھ سے تار دے کر ان کو بلایا تاکہ وہاں کے ماحول سے مانوس ہو سکیں۔ جوبلی کی سیر کرکے جب واپس لکھنؤ آئے تو علی گڑھ کا کورس خریدا گیا۔ طے یہ ہوا کہ ایک سال تک گھر پر مکمل تیاری کرکے علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیا جائے اس مرتبہ شوکت صاحب نے سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا۔ تمام مضامین میں بے حد کمزور تھے اس لیے سخت محنت کرنا پڑی۔ دن رت محنت کرنے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا تو کسی نے تپ دق اور کسی نے فائیلیریا (Filaria) تجویز کیا۔ علاج کیا گیا تو کچھ دنوں کے بعد صحت یاب ہوگئے لیکن امتحان نہ دے سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے والد صاحب بیمار ہوگئے۔ اس بیماری میں بیس اپریل انیس سو اٹھائیس عیسوی کو ان کا انتقال ہو گیا اور یوں شوکت صاحب کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ابھی تعلیم کی کوئی ابتدائی منزل بھی سر نہ ہوئی تھی کہ شوکت تھانوی کو شادی کی سوجھی۔ انیس سو سترہ عیسوی میں شوکت تھانوی کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم کی شادی ارشد تھانوی سے ہوگئی۔ ارشد تھانوی کی ایک سوتیلی بہن شوکت صاحب سے چھ ماہ بڑی تھی۔ ان کا نام اسری بیگم تھا لیکن شوکت صاحب ان کو سفید بلی کہتے تھے۔ بھوپال میں بہت عرصہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوگئے اور شوکت تھانوی نے اسری بیگم سے شادی کرنا چاہی جس کے لیے ابھی

۱۔ شوکت تھانوی، ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۶۱۔

بہن اور بہنوئی کی مدد کے طالب ہو کر لکھنؤ سے ان کے یہاں پہنچے۔ مولانا ارشد تھانوی نے ایک مضمون میں اس بات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> ”میں اس زمانہ میں ایک بعید مقام ”جے تھاری“ میں تحصیلدار تھا، میاں محمد عمر وہاں پہنچے اور اپنی باجی سے، جو اب میری بیوی اور تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں، کہنے لگے: باجی میں ریل سے اتر کر تیس میل کا یہ پہاڑی راستہ آپ سے ملنے کے لیے طے کر کے آیا ہوں۔ بیل گاڑی میں جھٹکے کھاتے کھاتے ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے بہن کا جذبۂ محبت اس ایثار پر کس قدر بھڑک اٹھا ہوگا۔ بہت متاثر ہو کر شفقت بھری دعائیں دیں۔ دو روز تک اس طرح باجی کو متاثر کر کے حرف مطلب زبان پر لائے اور بڑی تمہید کے بعد فرمانے لگے۔ میری شادی لیلی بلی، نہیں نہیں افسر بیگم سے کرا دو۔ وہ حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں وہ تم سے چھوٹی نہیں بلکہ چھ ماہ بڑی ہے۔ تمہاری شادی تم سے کم عمر لڑکی سے ہونی چاہیے۔“[1]

شوکت صاحب نے اپنی بہن کی یہ بات سن کر فرمایا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رسول پاک سے پندرہ سال بڑی تھیں، افسری بیگم تو مجھ سے صرف چھ مہینے ہی بڑی ہے۔ جب ان کی بہن نے زیادہ پس و پیش کی تو ریل کی پٹری پر لیٹ کر ٹرین سے کٹ مرنے کی دھمکی دی۔ ظہور فاطمہ بیگم نے یہ تمام حالات اپنے شوہر ارشد تھانوی کو بتائے تو انھوں نے ایک خط اپنے والد کو اور دوسرا شوکت صاحب کے والد کو لکھا۔ ارشد صاحب کے والد نے جواب دیا کہ افسری کی نسبت خالہ کے بیٹے سے طے ہو چکی ہے اور شوکت صاحب کے والد کا لکھنؤ سے جواب آیا کہ فوراً ان کو لکھنؤ روانہ کر دو۔ شوکت صاحب لکھنؤ جا کر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ ایک دن ان کے والد نے بھرا ہوا ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو گولی مار لیں۔ پھر ریوالور کی نال کنپٹی پر چھوا کر کہا کہ اس جگہ گولی لگتے ہی بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی ان کا جسم تھرتھرانے لگا اور عشق کا بھوت سر سے اتر گیا۔

---

[1] ارشد تھانوی: شوکت سلمہ' نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۹۔

اس واقعہ سے شوکت صاحب کے والدین کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کی شادی کر دی جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ ان کے والد نے حکم دیا کہ وہ دور اور نزدیک کے رشتہ داروں کے یہاں جائیں اور خود یہ بتائیں کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے شوکت صاحب اپنے ننھیال ملاواں ضلع ہردوئی بھیجے گئے۔ وہاں ان کی خالہ رہتی تھیں۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کو پسند کر آئے اور والدہ صاحبہ کو اپنے انتخاب کی اطلاع دی۔ جب والد صاحب نے سنا تو وہ اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوئے اور کہا کہ یہ فیصلہ جلد بازی کا ہے۔ باقی عزیزوں کے یہاں بھی جانا چاہیے تا کہ اطمینان سے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ لہذا اس مرتبہ ان کو مین پوری بھیجا گیا جہاں ان کے ایک قریبی رشتہ کے خالہ زاد بھائی حکیم مولوی محمد سجاد حسین رہتے تھے جو مشن ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے جس صاحبزادی کو پسند فرمایا اس کا نقشہ اپنی کتاب ”مابدولت“ میں اس طرح کھینچا ہے:

> ”یہاں ہم جن صاحبزادی کو دیکھنے آئے تھے، ان کو دیکھ کر آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل ہوا، طبیعت باغ باغ ہو گئی اور ملاواں جا کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اپنے احمق ہونے کا سچے دل سے اعتراف کیا۔ ایک عجیب گڑیا سی لڑکی، بھولا بھولا چہرہ، پیاری پیاری باتیں، پڑھی لکھی، نمازی، پرہیزگار، ہنس دے تو منہ سے پھول جھڑنے لگیں اور رو دے تو۔ مگر روئے اس کی بلا۔“[۱]

سجاد صاحب کی یہ منجھلی صاحبزادی تھیں جو شوکت تھانوی کو پسند آئیں۔ انھوں نے گھر پہنچ کر اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ اس مرتبہ ان کا انتخاب آخری اور قطعی ہے۔ ان کی والدہ نے پہلے تو ان کے بیان کو معتبر نہ سمجھا لیکن جب اس سلسلہ میں مستقل مزاج پایا اور ایک خاص قسم کی بے قراری کا اندازہ کر لیا تو والد صاحب سے عرض کی کہ اب شوکت صاحب کی شادی کا باقاعدہ پیغام مین پوری بھیج دیا جائے۔ جب شادی کا پیغام سجاد صاحب کے یہاں پہنچا تو انھوں نے یہ شرط پیش کی کہ لڑکا کم از کم میٹرک پاس ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ پہلے بڑی

---

[۱] شوکت تھانوی: ”مابدولت“ ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار چہارم، ص ۴۲۔

لڑکی کا عقد ہو جائے، اس کے بعد منجھلی لڑکی کی نسبت پر غور کیا جائے گا۔ آخر کار شوکت صاحب کے بزرگوں نے سجاد صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجیے اور لڑکی کو اس وقت رخصت کیجیے گا جب آپ کی شرط پوری ہو جائے۔ پھر ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہو گئے۔ انیس سو چوبیس عیسوی میں اتفاق سے حکیم صاحب کا تمام خاندان لکھنؤ آیا تھا اور یہ سب حکیم صاحب کے بھائی مولوی محمد عثمان صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔ طے یہ ہوا کہ یہیں عقد ہو جائے، رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ چنانچہ نہایت سادگی سے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح شوکت صاحب سے پڑھا دیا۔ اس طرح انیس سو چوبیس عیسوی میں سعیدہ سجاد، مسز سعیدہ شوکت تھانوی ہو گئیں۔ نکاح کے کچھ عرصہ بعد ہی شوکت صاحب نے رخصتی کے لیے کوششیں شروع کر دیں لیکن مولوی سجاد حسین صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آئے۔ شوکت صاحب کی کوششیں جاری رہیں اور یہ کوششیں بالآخر انیس سو چھبیس عیسوی میں رنگ لائیں۔ شوکت صاحب ''مابدولت'' میں اپنے دولہا بننے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دسمبر انیس سو چھبیس عیسوی میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ والد صاحب قبلہ پہلے ہی سے مین پوری کی نمائش میں خان بہادر سید زین الدین کلکٹر مین پوری کی دعوت پر تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے تار پر اطلاع دی کہ تم لوگ آؤ، میں یہیں بارات میں شامل ہو جاؤں گا۔ لہذا ماموں صاحب ہم کو اور ہمارے ایک دوست کو لے کر مین پوری روانہ ہو گئے۔ یہ گویا تین آدمیوں کی برات تھی اور چوتھے براتی مین پوری ہی میں موجود تھے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی۔ کسی قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ محض یہ کہ سلام کرائی ہوئی اور جو تھوڑا بہت روپیہ اس سلسلے میں ملا، وہ ماموں صاحب کے حوالے کرکے ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔ یہاں البتہ مہمان کافی تھے اور گھر میں شادی کی چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔''[1]

---

[1] شوکت تھانوی: ''مابدولت'' ادارۂ فروغ اردو، لاہور، بار چہارم، ص ۹۰۔۹۱۔

بیس اپریل انیس سو اٹھائیس عیسوی کو شوکت تھانوی کے والد کا انتقال ہوا تو انہیں ملازمت کا خیال آیا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے رشتہ دار ان کی طرف سے فکر مند تھے۔ مولانا ارشد تھانوی نے کوشش کرکے انہیں تحصیلدار لگوانے کا وعدہ کیا۔ لیکن شوکت تھانوی نے اپنے لیے اس ملازمت کو بوجوہ موزوں خیال نہیں کیا۔ ارشد تھانوی اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''چچا جان کی وفات کے بعد وہ میرے پاس بھوپال آیا۔ میں ان دنوں ایک تحصیل کا انچارج تھا اور نواب صاحب کے وزیر خصوصی بسلسلۂ دورہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے شوکت کی ملازمت کے لیے عرض کیا اور وہ تحصیلدار مقرر کرنے پر آمادہ ہو گئے، شوکت گھر میں باجی کے پاس جا کر رونے لگے کہ بھائی جان مجھے لکھنؤ چھڑا کر دیہاتی ماحول میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خبر ہوئی تو سمجھایا کہ بھیا، تمہاری بیوی ہے، کچھ دنوں میں بچے ہو جائیں گے۔ انگریزی حکومت میں ملازمت کے لیے تمہارے پاس تعلیمی سہولتیں نہیں، تمہارے ابا کی دیرینہ خدمات اور باقی ماندہ رسوخ کی وجہ سے تمہیں یہ سنہری موقع مل رہا ہے، کیوں کفران نعمت کرتے ہو، آگے چل کر ترقی پاؤ گے۔ نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) ہو سکتے ہو اور قسمت نے یاوری کی تو ناظم ضلع یعنی کلکٹر بھی بن سکتے ہو، شوکت بظاہر رضا مند ہو گئے اور بڑے ابا یعنی میرے والد سے مشورہ کا حوالہ کرکے بھوپال آئے اور وہاں سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ بعد میں معذرت آمیز خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ میں نے روزنامہ ''ہمدم'' کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازمت کر لی ہے۔''[1]

شوکت تھانوی نے اپنی ملازمت اور صحافت سے وابستگی کے حالات ''ما بدولت'' اور ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزنامہ ''ہمدم'' کی ملازمت سے شوکت تھانوی نے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔

انیس سو تیس عیسوی میں سید جالب دہلوی ''ہمدم'' سے علیحدہ ہوئے تو چوہدری رحم علی ہاشمی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ چوہدری صاحب

---

[1] ارشد تھانوی: ''شوکت مرحوم'' مطبوعہ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۴۹، ۳۵۰۔

اردو اور انگریزی صحافت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ شوکت تھانوی نے ان کے ماتحت کام کر کے ان کے تجربہ سے بھی استفادہ کیا۔

انیس سو بتیس عیسوی میں روز نامہ ''ہمدم'' کی انتظامیہ نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا تو شوکت تھانوی کو ایک مرتبہ پھر بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ روزنامہ ''اودھ اخبار'' میں ان کا تقرر اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایڈیٹر نے اس اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو شوکت تھانوی کو قائم مقام ایڈیٹر بنا دیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں دوبارہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔

انیس سو پینتیس عیسوی میں جب ہفتہ وار ''حق'' نے روز نامہ کی حیثیت اختیار کی تو شوکت تھانوی کو اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے اپنے دوستوں کے مشورہ سے قبول کر لیا۔ اس اخبار میں آ کر فکاہیہ کالم ''حق و باطل'' شروع کیا۔

انیس سو سینتیس عیسوی میں عبدالرؤف عباسی نے ایک ماہنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا جس کا نام ''کائنات'' تجویز ہوا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو بنایا گیا۔ روزانہ اخبار کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ اس ماہنامہ پر زیادہ توجہ نہ دی جا سکی جس کی وجہ سے ماہنامہ ''کائنات'' کے پانچ، چھ شمارے ہی نکلے تھے کہ اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

انیس سو اڑتیس عیسوی میں شوکت تھانوی نے عبدالرؤف عباسی کے رویے میں تبدیلی محسوس کی تو ''حق'' اخبار سے استعفیٰ دے دیا۔ شوکت تھانوی کے احباب نے یہ کوشش کی کہ ان کا استعفیٰ واپس ہو جائے لیکن ان کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں اور ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ خان بہادر سید عین الدین کو جب ان حالات کا پتہ چلا تو انہوں نے شوکت تھانوی کو اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا مشورہ دیا۔ اس کی مالی اعانت کی ذمہ داری خود قبول کی۔ شوکت تھانوی نے ایک منصوبہ بنایا جسے اس دور کے اہم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے خان بہادر سید عین الدین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اخبار کو سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ شوکت تھانوی کے اخبار کا نام ''طوفان'' طے پایا۔ اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر خان محبوب طرزی کو بنایا گیا۔ گیارہ مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کو طوفان کا ''نمونہ'' کا پرچہ نکلا جس میں یہ اعلان

کیا گیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون انیس سو اڑتیس عیسوی سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے اور خریدار فراہم کرنے میں صرف کیا گیا۔ یکم جون انیس سو اڑتیس عیسوی سے اس کی باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی۔ خان بہادر سید عین الدین کی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ اخبار مالی دشواریوں کا شکار ہوا جس کی وجہ سے اسے بند کر دینا پڑا۔

انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا اور ملک حسیب احمد کا تقرر بحیثیت ڈائریکٹر آف پروگرام ہوا۔ انہوں نے شوکت تھانوی کو ریڈیو پروگرام دینے شروع کر دیے۔ شوکت تھانوی نے مزاحیہ تقریروں کا پہلا سلسلہ ’’سمرقند و بخارا‘‘ کے عنوان سے شروع کیا۔ ان کی سب سے پہلی تقریر سولہ جون انیس سو اڑتیس عیسوی بروز جمعرات، رات ۷ بجکر پینتالیس منٹ پر ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوئی۔ تقاریر کے اس سلسلہ کے علاوہ سب سے پہلا ڈراما، لکھنؤ ریڈیو سے ’’خدا حافظ‘‘ کے نام سے پیش کیا اور اس میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی ادا کیا۔ دسمبر انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ڈراموں کا ایک سلسلہ ’’موں شاں تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام‘‘ کے نام سے لکھوایا۔ جس میں قدیم تھیٹر کی گونج مزاحیہ انداز میں نظر آتی تھی۔ یہ ڈراما ہر ہفتہ نشر ہوتا تھا۔

انیس سو انتالیس عیسوی کے اوائل میں جگل کشور مہرا نے شوکت تھانوی کو بحیثیت مصنف و صدا کار ریڈیو میں ملازمت دلوا دی جس کی وجہ سے انہیں مکمل طور پر اخبار نویسی ترک کرنا پڑی۔

یکم فروری انیس سو تینتالیس عیسوی کو شوکت تھانوی، سید امتیاز علی تاج کی دعوت پر پنچولی آرٹ پکچرز لاہور میں بحیثیت سٹوری رائٹر آئے۔

شوکت تھانوی نے اپنے ایک مضمون ’’حق لاہوری نمک‘‘ میں لکھا ہے کہ:

’’یکم فروری ۱۹۴۳ء کو پنچولی آرٹ پکچرز میں چارج لیا۔ میو روڈ پر قیام کیا۔ مسلم ٹاؤن میں کام، روزانہ پانچ میل کے قریب جانا اور پانچ میل آنا، دس میل یومیہ کی سائیکل ماری کے بعد تندرست سے تندرست آدمی کو دق ہو سکتی ہے۔ . . . البتہ یہ لاہور کا فیض تھا جس نے یہ تمام کام ہم سے لیے اور یکم فروری ۱۹۴۳ء سے ۶ جنوری ۱۹۴۴ء تک تقریباً ایک سال کا زمانہ اس عمر میں شاید ہی ہم بھول سکیں۔ پھر حیرت یہ کہ ۶ جنوری ۱۹۴۴ء کو لاہور چھوڑتے ہی

ہم بالکل وہی تھے"[۱]۔

شوکت تھانوی نے پنچولی آرٹ پکچرز میں فلم "شیریں فرہاد" کی کہانی اور فلم "پونجی" کے گانے لکھے۔ یہاں ان کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ تھی۔ تقریباً گیارہ مہینے لاہور میں قیام پذیر رہے اور ۶ جنوری ۱۹۴۳ء کو سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن سے وابستہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ جنگ کے دنوں میں حکومت ہند نے جنگی پروپیگنڈے کے سلسلہ میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے ڈائریکٹر جنرل ابوالاثر حفیظ جالندھری تھے۔ انھوں نے یو۔ پی میں بطور "آرگنائزر" شوکت تھانوی کا تقرر کر دیا تھا۔ ان کا ہیڈکوارٹر لکھنؤ تھا۔ یو۔ پی کے مختلف ضلعوں میں گشت کرنا اور وہاں گانے اور مشاعرے کے ذریعے جنگی مقاصد کی تبلیغ کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ مسٹر واسطی اور بسمل الہ آبادی ان کے شریک کار تھے۔

جنگ ختم ہو جانے کے بعد ۱۹۴۶ء میں شوکت تھانوی دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آ گئے۔ چونکہ دل سکھ صاحب (پنچولی آرٹ پکچرز کے مالک) سے یہ وعدہ تھا کہ جب بھی کام ختم ہو جائے گا تو میں آپ کی طرف آ جاؤں گا، چنانچہ اس وعدہ کا پاس کرتے ہوئے شوکت تھانوی دوبارہ لاہور آ گئے۔ شوکت تھانوی کے بڑے بیٹے سعید عمر اس وقت نویں جماعت میں تھے، اس لیے وہ لکھنؤ میں وکیل احمد صاحب کے یہاں ٹھہر گئے۔ خورشید عمر، رشید عمر اپنے والدین کے ساتھ لاہور آ گئے۔ لاہور آ کر شوکت تھانوی مسلم ٹاؤن کی ایک کوٹھی "قصر راحت" میں قیام پذیر ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں پنچولی آرٹ پکچرز میں دوبارہ آئے تو شوکت تھانوی کے سپرد گانے لکھنے کا کام ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد سیاسی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ اس فلم کی تکمیل جس کے گانے شوکت تھانوی نے لکھے تھے، ستمبر ۱۹۴۷ء تک ملتوی کر دی گئی۔ مگر تقسیم ملک کے بعد پنچولی آرٹ پکچرز کا کاروبار بند ہو گیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہیں آئی۔

شوکت تھانوی اس ملازمت سے فارغ ہو کر ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ یہاں ان کی ملاقات ڈلمن صاحب سے ہوئی جو پہلے

۱۔ شوکت تھانوی: "حق لاہوری نمک" ماخوذ از لاہوریات، ص ۲۶، ۲۷، ۳۲، ۳۳، بار چہارم، اردو بک اسٹال، لاہور

سے ہی ریڈیو میں ملازم تھے۔ ان کے خاندان کے تمام افراد ہندوستان جا چکے تھے۔ صرف وہ خود اور ان کی دادی یہاں رہتے تھے۔ ہنگاموں میں اضافہ ہوا تو انہیں خطرہ ہوا کہ ان کی کوٹھی کوئی جلا نہ دے اس لیے انہوں نے شوکت تھانوی سے گذارش کی کہ وہ ان کی کوٹھی میں منتقل ہو جائیں تا کہ یہ محفوظ ہو جائے۔ قصر راحت کے بعد شوکت تھانوی رسول سٹریٹ، مسلم ٹاؤن کی کوٹھی میں مقیم تھے کہ ٹنڈن صاحب کی اس پیشکش پر انہیں کوٹھی نمبر ۱، کینال پارک "ٹنڈن نواس" میں آنا پڑا۔

شوکت تھانوی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۳ء تک ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اس دور میں انہوں نے بچوں کے لیے پروگرام لکھے، عورتوں کے لیے پروگرام تحریر کیے، ہزاروں ڈرامے لکھے، تقاریر کیں، صداکاری اور اداکاری کی۔ ان سب حیثیتوں میں شوکت تھانوی نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ وہ کئی طرح کی آوازیں بنانے پر قادر تھے۔ انہوں نے ہزاروں فیچر لکھے اور ہر ایک میں شگفتگی برقرار رہی۔ شوکت تھانوی نے نہ صرف ریڈیو پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے بلکہ ایک فلم "گلنار" میں نواب دلشاد کا پارٹ ادا کر کے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے نواب دلشاد کا کردار ایسے با کمال طریقہ سے پیش کیا ہے کہ انہیں دیکھ کر لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

شوکت تھانوی میں شعری ذوق مولانا ارشد تھانوی نے پیدا کیا۔ انہوں نے ابتدا میں شوکت تھانوی کی طرف سے نظمیں اور مضامین لکھ کر بچوں کے رسالوں میں چھپوائے۔ شوکت تھانوی یہ نظمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ بڑے ہوئے تو شعر کہنے کی باقاعدہ کوشش شروع کر دی۔

شوکت تھانوی مسلسل مشق سخن کرتے رہے۔ ایک دن پوری غزل کہنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوستوں کو سنائی تو انہوں نے بہت تعریف کی۔ اب ان کا دل چاہنے لگا کہ یہ غزل جلد از جلد کسی ادبی رسالہ میں چھپ جانی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے کئی رسالوں کو یہ غزل بھیج دی۔ سب سے پہلے جس رسالہ کو ان کی غزل چھاپنے کا شرف حاصل ہوا اس کا نام "ترچھی نظر" ہے اور اس کے مدیر کا نام امین سلونوی ہے۔ شوکت تھانوی کی پہلی غزل کے دو اشعار:

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

اس غزل کا مقطع یہ ہے:

شفا پاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا کبھی شوکت
جو عشق مرض مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں[١]

شوکت تھانوی نے "ما بدولت" میں یہ مقطع اس طرح لکھا ہے جبکہ اپنی دوسری کتاب "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں یہ مقطع اس طرح ہے:

انہیں حاضر کبھی ہوتے ہوئے دیکھا نہیں شوکت
جو عشق مرض مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں[٢]

یہ غزل "کہرستان" میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ١٩٧٩ء میں لکھنؤ گئے تو ابن سلوتوی سے ملاقات کی اور راقم کے لیے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو یکم جون ١٩٧٩ء کو ریکارڈ کیا گیا۔ راقم نے طاہر تونسوی کو کچھ سوال لکھ کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان دونوں مقطعوں میں سے کونسا مقطع آپ نے "ترچھی نظر" میں چھاپا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک ان کا حافظہ کام کر رہا ہے "ما بدولت" والا مقطع "ترچھی نظر" میں چھپا تھا۔ "ترچھی نظر" کا یہ شمارہ ابن سلوتوی کے پاس سے ابھی نہیں مل سکا۔

دوسری شادی:

شوکت تھانوی نے مارچ ١٩٣٩ء میں زہرہ بیگم بنت شیخ نبی بخش سے عقد ثانی کیا۔ زہرہ بیگم لاہور میں ١٩٢٦ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی عمر ابھی صرف تیرہ برس کی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے پرورش کی۔ ان کے دو بھائی ہیں، شیخ ظفریاب علی اور شیخ ناصر علی، ایک بہن، جن کا نام عذیبہ بیگم تھا لیکن شوکت تھانوی نے زہرہ کی مناسبت سے ان کا نام مشتری بیگم رکھ دیا، ان کی شادی چوہدری محمد شریف سے ہوئی۔

زہرہ بیگم نے ابتدائی تعلیم لیڈی میکیگن سکول سے حاصل کی۔ میٹرک تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت

---

[١] شوکت تھانوی: "ما بدولت"، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، بار چہارم، ص ٦٩۔

[٢] شوکت تھانوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں"، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ١٩٦٣ء، ص ١٠

سے دیا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ کی تیاری شروع کی کہ اسی اثناء میں شادی ہو گئی۔

زہرہ بیگم نے راقم سے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ بہت عرصے سے شوکت تھانوی کی کتابیں پڑھ رہی تھیں اور ان کی تحریروں کو بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ ایک مرتبہ وحیدہ روشن، ہیڈ مسٹرس، سردار گرلز ہائی اسکول کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن دیکھنے گئیں تو ان کی ملاقات شوکت تھانوی سے ہوئی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ وحیدہ روشن کا ریڈیو اسٹیشن مسلسل آنا جانا تھا چنانچہ شوکت تھانوی نے اگلی ملاقات میں زہرہ بیگم کے بارے میں بہت سے سوالات کرکے معلومات حاصل کیں اور کچھ عرصہ کے بعد شادی کے بارے میں اپنی سنجیدگی کا ذکر کیا۔ وحیدہ روشن نے اس خیال سے کہ شوکت تھانوی کے پہلے سے ایک بیوی اور تین بچے موجود ہیں، اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن شوکت تھانوی کا اصرار مسلسل بڑھتا چلا گیا تو وحیدہ روشن نے زہرہ بیگم کی والدہ سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن وحیدہ روشن نے جب معاملہ کی سنجیدگی کا انہیں احساس دلایا تو وہ چند شرائط کے تحت شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔ شوکت تھانوی نے یہ تمام شرائط منظور کر لیں اور ایک کاغذ پر اپنے کوائف اور شرائط انہیں جو کچھ لکھ کر دیا وہ یہ ہے:

(۱) میرا نام محمد عمر ہے۔ لوگ مجھے شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں۔

(۲) میرے والد مرحوم کا نام صدیق احمد صاحب تھا۔ جو یو۔ پی۔ پولیس میں انسپکٹر اور بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

(۳) میں شیخ فاروقی ہوں، حنفی ہوں، میری عمر پینتیس سال ہے۔

(۴) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا رہنے والا ہوں۔

(۵) میری تعلیم انٹرمیڈیٹ تک ہوئی اور بعد میں انٹرمیڈیٹ کا ممتحن بھی رہ چکا ہوں۔

(۶) میری تنخواہ اس وقت ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے۔

(۷) میرا خاص مشغلہ کتابوں کی تصنیف ہے۔ جس سے اوسطاً دو سو روپے ماہوار آمدنی ہے۔ اس وقت تک پینتیس کتابوں کا مصنف ہو چکا ہوں۔

(۸) میں اب تک چھ روزانہ اخباروں کا، چار ماہناموں کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔

(۹) عقد ثانی کی ضرورت اس لیے ہے کہ میں اپنی زندگی کا سکون چاہتا ہوں۔ بیوی سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے بے حد اصلاح کی کوشش کی مگر بیوی اپنی دماغی افتاد اور مزاجی کیفیت سے مجبور ہے۔

(۱۰) مجھے اس عقد کے سلسلہ میں تمام شرائط منظور ہوں گی اور میں مہر وغیرہ کے لیے ہر قسم کی لکھا پڑھی کے لیے تیار ہوں۔

(۱۱) رہائش کا انتظام الگ کروں گا۔ میری زوجہ ثانیہ کو پہلی بیوی سے کوئی تعلق کسی قسم کا نہ ہوگا۔

اس شرائط نامہ زہرہ شوکت کے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ راقم نے اسے دیکھا اور اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ کر لی ہے۔

اس کوائف نامے میں شوکت تھانوی نے اپنی عمر صرف پینتیس سال لکھی ہے جبکہ انیس سو اچاس عیسوی میں ان کی عمر پینتالیس سال بنتی تھی۔ نیز انہوں نے اپنی تعلیمی قابلیت انٹرمیڈیٹ بتائی ہے جبکہ ریکارڈ کے مطابق انہوں نے میٹرک کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کا ممتحن رہنے والی بات ممکن ہو سکتی ہے۔ چونکہ اردو زبان و ادب پر انہیں دسترس حاصل تھی اس لیے انٹرمیڈیٹ میں وہ اردو کے ممتحن بننے کی اہلیت رکھتے تھے۔

زہرہ شوکت نے راقم کو ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کی نکاح کی تقریب آٹھ فروری انیس سو انچاس عیسوی کو ۶۰ برنی اسٹریٹ، گڑھی شاہو میں ہوئی۔ بیس ہزار روپے مہر رکھا گیا اور رخصتی چار مارچ انیس سو انچاس عیسوی کو ہوئی۔ رخصت ہو کر شوکت تھانوی کے دوست حکیم جعفری کے ہاں منٹگمری روڈ پر گئی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک شوکت تھانوی صاحب کے ساتھ وہیں رہیں۔ پھر ۶۰ برنی اسٹریٹ، گڑھی شاہو میں آ گئیں۔ اس کے بعد ایک اور گھر گڑھی شاہو میں کرایہ پر لیا لیکن وہ زیادہ اچھا نہ تھا اس لیے اسے چھوڑ دیا۔ پھر گڑھی شاہو ہی میں ڈاکٹر ایثار کے کلینک کے سامنے ایک بلڈنگ کرایہ پر لی۔

تیسری شادی کے بارے میں اختلاف رائے :

ریڈیو اور ٹی وی کی ممتاز فن کارہ عرش منیر کا کہنا یہ ہے کہ وہ شوکت تھانوی کی بیوی ہیں[1]۔ لیکن شوکت تھانوی کی دوسری بیگمات اور ان کے بعض قریبی دوستوں کو اس میں کچھ شبہ ہے۔ شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے ہمیں شوکت تھانوی کی انیس سو چھیالیس عیسوی کی ایک تحریر دکھائی جس کا متن یہ ہے :

> ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر بقائمی ہوش و حواس لکھتا ہوں کہ میں نے مسماۃ عرش منیر سے نکاح نہیں کیا ہے اور نہ میرے مسماۃ مذکور سے کسی قسم کے تعلقات ہیں۔ اگر اس کی طرف سے یا کسی اور طرف سے میرے اور اس کے نکاح کی خبر مشہور کی جائے تو وہ قطعاً غلط اور ناقابل اعتبار ہے۔
>
> فقط
>
> شوکت تھانوی بقلم خود
>
> المرقوم یکم فروری، انیس سو چھیالیس عیسوی''[2]

وہی وہانوی :

بہت عرصہ تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ ''وہی وہانوی'' کے قلمی نام سے کون لکھتا ہے لیکن اب یہ بات منظر عام پر آ چکی ہے کہ اس نام سے شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا۔ ''سرپنچ'' کے صفحات اس بات کی گواہی دیں گے جہاں غالب کے اشعار کی پیروڈی ''وہی وہانوی'' کے نام سے کی گئی۔ ''سرپنچ'' کے ایک شمارہ میں ''غالب اور وہی'' کے عنوان کے تحت ایک غزل چھپی۔ جس میں ہر شعر کا ایک مصرعہ مرزا غالب کا ہے اور ایک مصرعہ وہی وہانوی کا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا
شب وعدہ آ ہی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا

تجھے ہم ازل سے جھوٹا مری جاں جانتے تھے
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

۱۔ عرش منیر کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں کے نام ہیں ارشد عمر، راشد عمر اور ارشاد عمر۔

۲۔ اس اہم دستاویز کا عکس راقم کے پاس محفوظ ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
اور اگر بنا تھا ناصح تو وہ تھانہ دار ہوتا
یہ شرر جو آج کل ہے یہی غم کی شکل پاتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

اگر آ گئی تھی شامت تو نجات کیسے ملتی
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم وہی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا[1]

احمد جمال پاشا نے اپنے ایک مضمون میں وہی وہانوی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اسی ہنسی، دل لگی بازی اور سنسنی خیزی کے بنیادی جذبہ نے سرپنچ کے صفات پر وہی وہانوی کے رسوائے زمانہ کردار کو جنم دیا۔ شروع شروع میں شوکت تھانوی کے وہی وہالوی غالب پر مصرعے لگانے اور تک بندی کرتے تھے:

تقدیر کا لکھا وہی کچھ بھی نہ پڑھ سکے
گویا کہ جو لکھا ہے بخط شکست ہے
محبت میں کیا جانے کیا کر رہے ہیں
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
مئے کارنگ ابھی انگور کی دوشیزہ بیٹی ہے
اڑا لے جو کوئی انگور کا داماد ہو جائے

اس کے بعد وہی وہانوی کا چلن بگڑا ''نکذم''، ''بھنور'' اور ''گناہ'' کی ''دلدل'' میں ایسے پھنسے کہ الامان الحفیظ''[2]

احمد جمال پاشا کے اس اقتباس سے شوکت تھانوی کے ان تین ناولوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں جو انہوں نے ''وہی وہانوی'' کے نام سے لکھے اور یہ تین ناول ''نکلم''، ''بھنور''، اور ''گناہ کی دلدل'' ہیں۔ نادم سیتاپوری نے ایک مضمون میں وہی وہانوی کے کردار کی وضاحت اس انداز

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۸۰، ۲۸۱۔
احمد جمال پاشا نے اپنے ایک مضمون میں وہی وہانوی کے کردار پر

[2] ماخوذ: نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۹۲۔

سے کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''وہی وہانوی کے نام سے کم ہی لوگ نا آشنا ہوں گے ۔ اس فرضی نام سے آج سینکڑوں فحش اور گندے ناول چوری چھپا فروخت ہو رہے ہیں ۔ حکومت ہند و پاک نے اس قسم کے اخلاق سوز لٹریچر کو ممنوع قرار دیا ، درجنوں کتب فروشوں کے یہاں چھاپے پڑے ، مقدمات چلے ، سزائیں ہوئیں مگر شاید اب تک یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ یہ ''وہی وہانوی'' ہیں کون صاحب ! اور پتہ چلتا بھی تو کیسے ؟ اس قسم کا گندہ لٹریچر کسی ایک دماغ تک محدود نہیں ہے جس کا جی چاہا ''وہی وہانوی'' بن گیا ۔ لیکن شاید یہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ''وہی وہانوی'' کا فرضی نام دراصل شوکت کی جودت فکر کا نتیجہ ہے ۔ جی نہیں ! اسی سلسلے میں شوکت نے فی البدیہہ ایک شعر بھی کہا تھا :

ہم آپ کے ''وہی'' ہیں ہمیں جان جائیے
پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے

ہوا یہ ۔ ۔ ۔ !

نسیم انہولوی نے جب جنسیاتی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا دھندہ شروع کیا تو نسیم بک ڈپو کے لیے ''شرمناک افسانے'' ''بھنور'' اور ''دلدل'' قسم کی کئی کتابیں لکھوائیں جو جنسیاتی ہونے کے باوجود اتنی گندی ، فحش اور اخلاق سوز نہیں جیسی آج کل ''وہی وہانوی'' کے نام سے شائع کی جا رہی ہیں پھر بھی ہندوستانی ماحول اور اردو زبان کے لیے یہ نیا تجربہ ضرور تھا اسی لیے اس کے لکھنے والوں نے اپنا نام شائع کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ چنانچہ یہ مسئلہ جب شوکت کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ان فرضی مصنفین پر ''وہی وہانوی'' کا نقاب ڈال دینے کا مشورہ دیا اور یہ فرضی نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ درجنوں ''وہی وہانوی'' پیدا ہو گئے ۔''[1]

ناظم سیتاپوری نے یہ مسئلہ تقریباً حل کر دیا ہے ۔ ہم نے شوکت تھانوی کے بہت سے دوستوں سے اس اہم مسئلہ پر بات کی تو انہوں نے بڑی حد تک ناظم سیتاپوری کی اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ ناول کسی ایک

---

۱ ۔ ناظم سیتاپوری : ماخوذ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۵۳۳ ۔

شخص نے تحریر نہیں کیے بلکہ دوستوں کا ایک پورا گروپ یہ ناول لکھ رہا تھا۔ ان میں پیش پیش رفیع احمد خاں تھے جن کا تعارف جناب جوش ملیح آبادی نے اپنی کتاب ' یادوں کی برات'' میں اس طرح کروایا ہے:

> ''میرے آبائے اولین کے، چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان، تمام دنیا کے فحش نگاروں کے سلطان، علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم۔اے، متعدد کالجوں کے پروفیسر، آخری دور میں لکھنؤ کوآپریٹو سوسائٹی کے سیکرٹری، متوسط القامت، شگفتہ پیشانی، قاش استاد، صدا بشاش، چوک رسیا، پدر معتوب، شہو محبوب، جوانی میں امرد پرستار، زوال جوانی میں طوائف گرفتار، مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے۔''[1]

جوش صاحب نے رفیع احمد خاں کو تمام دنیا کے فحش نگاروں کا سلطان قرار دیا ہے۔ ان کی ہزلیہ شاعری کے چند نادر نمونے راقم نے ڈاکٹر سید صفدر حسین مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کبھی کبھی اپنی خاص نشستوں میں ان کا کلام ایک خاص انداز سے سنایا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، خان محبوب طرزی اور جوش ملیح آبادی، رفیع احمد خاں کی محفل کے خاص رکن تھے۔ جناب جوش ملیح آبادی نے اپنے ان دوستوں کی سرگرمیوں پر ''یادوں کی برات'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ شام کے تفریحی پروگرام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ یوسف مرزا، ابرار اور شوکت تھانوی کو ہمراہ لے کر شام ہوتے ہی لکھنؤ کی خاص خاص ہوائی مدار، پراسرار و ثمردار گلیوں میں، بسلسلہ ''تلاش معاش'' گھوما کرتے تھے اور دن کے وقت ہمارے جان نثار کارندے، اس بات کی ٹوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری شادی رچائی ہے۔ ہم ان بوڑھوں کی فہرست تیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف و مشترک احباب کی وساطت سے، ان بوڑھوں کے پاس جاتے، ان پر اپنی پارسائی و دین داری کے سکے بٹھاتے تھے۔ ان کی نظروں میں سماتے، ان سے پینگ بڑھاتے اور اس طرح آخرکار، ان کی بے آب و

۱۔ جوش ملیح آبادی: ''یادوں کی برات''، ص ۳۵۳۔

گیاہ دالانوں تک آتے جاتے تھے’’[1]۔

جوش ملیح آبادی کے اس اقتباس سے لکھنؤ کے ماحول اور شوکت تھانوی کے شب و روز کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے ماحول میں بہت سے ذہین لوگوں کا اکٹھے ہونا اور ان میں سے ہر شخص کا باکمال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہوکر ادب تخلیق نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ادب میں جنسیت کو شامل کرکے ایک نیا تجربہ کیا۔ ان کا یہ تجربہ ان کی امیدوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ عام کتابوں کی نسبت یہ کتابیں دس گنا زیادہ فروخت ہوتی تھیں۔

روزنامہ ‘‘طوفان’’ لکھنؤ کی گیارہ مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کی اشاعت میں ‘‘شرمناک افسانے’’ کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے جسے آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

> ‘‘شرمناک افسانے — کار جوانی، شباب کی دیوانی، امنگوں کے ہاتھوں بہک کر تباہ ہو جانے والے آٹھ شریف خاندان، مہذب، تعلیم یافتہ اور حسین کنواریوں کے افسانے انہیں کے الفاظ میں یکجا کیے گئے ہیں جو ‘‘شرمناک افسانے’’ کے نام سے ‘‘وہبی دہلوی’’ کی رنگینیٔ قلم اور شباب خیز انداز بیان کی آئینہ دار ہیں۔ اس کتاب کو عورتیں اور طالب علم نہ پڑھیں۔ باقی حضرات فوراً آرڈر دیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار، کتابوں کے منگانے کا پتہ:
> مینجر، شوکت بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ’’[2]۔

‘‘شرمناک افسانے’’ کا ایک اور اشتہار شوکت تھانوی کی کتابوں کے ساتھ دیکھیے۔ یہ اشتہار چودہ جون انیس سو اڑتیس عیسوی کے ‘‘طوفان’’ لکھنؤ میں شائع ہوا:

> ‘‘اخبار سرپنچ کے چندہ میں رعایت
> حضرت شوکت تھانوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ہردلعزیز مزاحیہ اخبار ‘‘سرپنچ’’ کی خریداری کا نادر موقع
> تین روپے آٹھ آنے کے بجائے صرف ایک روپیہ اس طرح کہ آپ اسی وقت

---

[1] جوش ملیح آبادی: ‘‘یادوں کی برات’’، ص ۲۵۴، ۲۵۵۔

[2] ماخوذ از روزنامہ ‘‘طوفان’’ لکھنؤ، ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء، ص ۶۔

تین روپے آٹھ آنے چندہ اخبار سرپنچ برائے ایک سال اور آٹھ آنے محصول پارسل کتب ذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں۔ منی آرڈر وصول ہوتے ہی دو روپے آٹھ آنے قیمت کی کتب آپ کی خدمت میں بذریعہ پارسل روانہ کر دی جاویں گی اور ایک سال تک اخبار سرپنچ آپ کی خدمت میں برابر جاری رہے گا۔ کتابوں کے نام ہر دو جانب درج ہیں ان میں سے منتخب کیجیے۔ یہ رعایت صرف بیس جون انیس سو اڑتیس عیسوی تک رہے گی اور منی آرڈر وصول ہونے کی صورت میں رہے گی۔ وی۔ پی طلب کرنے والے حضرات اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

مینجر، سرپنچ جرنلس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ''[1]۔

اس اشتہار کے دائیں طرف جن کتابوں کے نام لکھے ہوئے ہیں ان میں دل پھینک، بڑبھس، خانم خاں، موتیا چاہ اور سودیشی ریل شامل ہیں۔ جبکہ بائیں جانب شرمناک افسانے، سیہ کاریاں، شہزادی شب نور، رنگین جوانی اور ایکٹرسوں کی آپ بیتیاں شامل ہیں۔

۱۱ مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کے اشتہار اور ۱۴ جون انیس سو اڑتیس عیسوی کے اشتہار کو دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ''شرمناک افسانے'' جسے پہلے اشتہار میں وہی وہانوی کی تصنیف قرار دیا گیا اور دوسرے اشتہار میں شوکت تھانوی کی کتابوں کے ساتھ اس کا اشتہار دیا گیا، یقیناً ''وہی وہانوی'' اور شوکت تھانوی کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔

ہم نے اسی تعلق کو مد نظر رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کے دوستوں سے اس اہم موضوع پر گفتگو کی۔ کچھ دوستوں نے فرمایا کہ اس ذکر سے شوکت تھانوی کی روح کو اذیت پہنچے گی۔ لیکن بیشتر دوستوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پہلے پہل ''وہی وہانوی'' کے نام سے شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا اور یہ قلمی نام انہیں کی جدت طبع کا شاہکار ہے:

> ''امین سلونوی صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا، جی ہاں! وہی وہانوی کے نام سے شوکت تھانوی ہی لکھتے تھے۔ حالانکہ بات صاف ہوگئی تھی کہ یہی وہی وہانوی ہیں، لیکن پھر بھی وہ اپنا نام بدل کر لکھتے رہے۔ اس دور میں سب لوگ ہی دوسرے ناموں سے لکھا کرتے تھے۔ چار پانچ آدمی پورے رسالہ کا مواد لکھا کرتے

---

[1] روزنامہ ''طوفان'' لکھنؤ، ۱۴ جون ۱۹۳۸ء، ص ۶۔

تھے ۔ ہم نے بھی نعیمہ کے نام سے لکھا ۔ یہ سب چیزیں فحاشی کے زمرے میں آتی ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی روح کو اذیت نہ پہنچے اس لیے اس بات کو آگے نہ بڑھایا جائے“۔

عمر انصاری نے اپنی آٹھ جون انیس سو اناسی عیسوی کی گفتگو میں ڈاکٹر طاہر تونسوی سے کہا:

” ”سرپنچ“ میں ”وہی وہانوی“ کا کالم شوکت تھانوی کے لیے مخصوص تھا ۔ کبھی کبھی یہ کالم امین سلونوی، نسیم انہونوی اور مجبوب طرزی بھی لکھا کرتے تھے ۔ اس کالم میں پیروڈی کا انداز اختیار کیا گیا اور اس کے بعد اس فرضی نام سے کتابیں شائع ہونے لگیں ۔ اس کی ضرورت اس طریقے پر پڑی کہ ایک منزل میں صحافی دوسروں کے ناموں سے لکھتے ہیں، وہ اس منزل سے گذر گئے تھے کہ میں اپنے نام سے لکھوں اور مجھے شہرت ملے، اس لیے جب ادیب اس منزل سے گذر جاتا ہے تو وہ دوسروں کے ناموں سے بھی لکھتا ہے ۔ فحش چیزوں کو وہ اپنے نام سے نہیں لکھنا چاہتے تھے ۔ اس لیے انہوں نے ایک جعلی نام سے لکھ دیا ۔ ادب کو کس طرح فروخت کیا جاتا ہے، اس کا شعور شوکت صاحب کے یہاں تھا ۔ وہ صرف نام ہی کے لیے نہیں، بلکہ معاش کے لیے بھی کام کرتے تھے“۔

سید انصار ناصری نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا:

”جی ہاں! یہ شوکت تھانوی کی کتابیں ہیں ۔ وہ کمرشل رائٹر بن گئے تھے ۔ اس لیے مختلف کرتب کیا کرتے تھے ۔ اس نام سے انہوں نے چند کتابیں لکھی ہیں ۔ پھر پبلشر سے ناراضگی ہوئی تو یہ کتابیں لکھنا بند کر دیں ۔ ان کے پبلشر صدیق صاحب تھے ۔ سب انہیں منشی صدیق کہتے تھے ۔ صدیق بک ڈپو سے یہ کتابیں شائع ہوتی تھیں ۔ وہ بہت لالچی اور خود غرض آدمی تھے“۔

شوکت تھانوی کے لکھنؤ کے دوستوں کی اس گفتگو کو روزنامہ ”طوفان“ میں چھپنے والے اشتہارات اور چند مضامین سے اقتباسات: ان سب چیزوں کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی وہانوی کے نام سے سب سے پہلے شوکت تھانوی نے سرپنچ میں ایک کالم لکھنا شروع کیا ۔ اسی نام سے پھر پیروڈی لکھی ۔ چار کتابیں شرمناک دھماکے، پھوار، گناہ کی دلدل اور گندم لکھیں ۔

اس کے بعد پبلشرز سے جھگڑا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس پبلشرز نے اس قسم کی کتابوں کے لیے دوسرے ادیبوں کی خدمات سے استفادہ کیا۔

کراچی اور راولپنڈی میں ملازمت:

جولائی انیس سو ستاون میں شوکت تھانوی کو پی۔ آئی۔ اے نے ایک پروپیگنڈہ مہم پر لندن بھیجا۔ وہاں انہوں نے چند دن قیام کیا۔ واپس آئے تو روزنامہ ”جنگ“ کراچی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس ملازمت کا آغاز پندرہ اگست انیس سو ستاون عیسوی سے ہوا۔ یہاں سے فکاہیہ کالم ”وغیرہ وغیرہ“ کے نام سے شروع کیا۔ صرف دو سال کراچی رہے۔ جب دارالخلافہ کراچی سے راولپنڈی منتقل ہوا تو ان کو ”جنگ“ کے ایڈیٹوریل اسٹاف کا انچارج بنا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی سے روزنامہ ”جنگ“ کا پہلا شمارہ تیرہ نومبر انیس سو انسٹھ عیسوی کو شائع ہوا۔ روزنامہ ”جنگ“ راولپنڈی کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت ان کی تنخواہ یہ تھی:

تنخواہ	:	۸۳۰ روپے
انکم ٹیکس	:	۲۷ روپے
اخبار سے قرض لیا ہوا تھا۔ اس کی قسط ہر مہینہ کٹ جاتی تھی۔	:	۵۰ روپے
کل	:	۷۵۳ روپے انہیں ملا کرتے تھے۔

شوکت تھانوی کی یہ ملازمت ان کے انتقال تک جاری رہی۔ اپریل انیس سو تریسٹھ عیسوی کو انہوں نے روزنامہ ”جنگ“ سے آخری تنخواہ وصول کی ہے۔ اس وقت ان کی تنخواہ روزنامہ ”جنگ“ کے ریکارڈ کے مطابق یہ تھی:

بنیادی تنخواہ	:	۷۲۰ روپے
مہنگائی الاؤنس	:	۸۵ روپے
کنوینس الاؤنس	:	۲۵ روپے
دوسرے الاؤنسز	:	۱۳۰ روپے
کل	:	۹۶۰ روپے

روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں شوکت تھانوی نے بہت ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیے۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کو انتظامی عہدوں پر نہیں لگایا جاتا۔ چونکہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہتر منتظم ثابت نہیں ہو سکتے لیکن شوکت تھانوی نے اپنے آپ کو یہاں ایک منتظم ثابت کیا۔ وہ صبح دس بجے دفتر آ جایا کرتے اور رات کو کافی دیر سے واپس گھر جاتے تھے۔ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا مکمل طور پر احساس تھا جس کا اظہار تیرہ نومبر انیس سو انسٹھ عیسوی کے کالم "پہاڑ تلے" کے آخری پیرے میں بھی کیا گیا ہے:

> "صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ایک پہاڑ خود ہمارے چہرے سے برستا ہوا بھی لوگ دیکھ رہے ہوں گے، وہ ہے ذمہ داریوں کا پہاڑ۔ راولپنڈی سے جنگ کے اجراء نے جن ذمہ داریوں میں ہم کو مبتلا کر دیا ہے وہ اتنی شدید ہیں کہ ان کے مقابلے میں نہ سردی کی شدت محسوس ہوتی ہے نہ مکانوں کی قلت، نہ احباب کی فرقت کا احساس ہے نہ کسی راحت کے فقدان کا ہوش۔ فکر ہے تو صرف یہ کہ راولپنڈی کا "جنگ" اپنے روایتی معیار اور ان توقعات کا حامل ہو جو ادارۂ "جنگ" سے وابستہ ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس مقصد میں کامیاب کر دے تو ہم بھی اِدھر اُدھر کی باتوں پر غور کریں گے، اپنے آپ کو سردی لگائیں گے، مکان کے بجائے محل ڈھونڈیں گے، ارزانی اور گرانی کے فرق کو محسوس کریں گے، ہم سخن احباب کو ڈھونڈیں گے اور راولپنڈی میں سمندر نہ ہونے کا شکوہ کریں گے۔ خدا وہ دن تو کرے"!

بیماری:

انیس سو ترسٹھ عیسوی کے آغاز سے ہی شوکت تھانوی کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھیں اکثر کھانسی اور بخار کی شکایت رہتی تھی۔ راولپنڈی میں ڈاکٹر یوسف کے زیر علاج رہتے تھے۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف کا کلینک ان دنوں بھی بازار صدر، راولپنڈی میں ہے) دن بدن بخار کی شدت

۱۰۔ روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء۔

بڑھتی چلی گئی۔ لیکن شوکت تھانوی اپنے گھر والوں سے اپنی بیماری چھپاتے رہے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے خورشید عمر سے اٹھارہ مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کے ایک خط میں کیا ہے:

> "میاں! کاش میں تم کو لکھ سکتا کہ میں صحت کے سلسلہ میں کن حالات سے گذر رہا ہوں۔ صحت بگڑتے بگڑتے اس حالت پر آ پہنچی ہے کہ اب پندرہ دن سے بالکل صاحب فراش ہوں۔ بخار تو نہ جانے کب سے شام کو ہو جایا کرتا تھا اور اندر ہی اندر مجھ کو کھوکھلا رہا تھا، مگر میں نے اس کی پروا نہ کی۔ لاہور کے مشاعرے میں گیا تو بابا اور رسید صاحب کو خود دکھا دیا تھا کہ لو دیکھ لو، بخار اس وقت بھی ہے۔ بہرحال اس بخار کے بعد کھانسی اور کھانسی کے بعد بلغم کے معائنے اور نہ جانے کیا کیا شروع ہوا اور مجھ کو بالکل الٹا ڈرا گیا۔ مجھ سے اب تک کہا تو یہی جا رہا ہے کہ کوئی خاص بات نہیں، کوئی خطرناک بات نہیں۔ مگر بہت سی باتیں میں خود اپنے عزیزوں اور بچوں سے چھپا رہا ہوں کہ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیوں کروں"[۱]۔

بائیس مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کی رات کو تمغہ امتیاز حاصل کرنے کی غرض سے شوکت تھانوی لاہور تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم زہرہ شوکت اور تینوں بیٹیاں بھی تھیں۔ شوکت تھانوی اس مرتبہ لاہور اس نیت سے آئے تھے کہ اپنا مکمل علاج کروا کر واپس جائیں گے[۲]۔

تئیس مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کو گورنر ہاؤس میں تمغہ امتیاز لینے گئے۔ اس وقت بھی ان کی طبیعت ناساز تھی اور ان کا ٹمپریچر ۱۰۱ تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ان کی ملاقات کمشنر نیاز احمد سے ہو گئی۔ وہ شوکت تھانوی کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور اگلے روز انھیں اپنے یہاں آنے کو کہا تاکہ ڈاکٹر صالح میمن کو دکھایا جا سکے۔ ڈاکٹر صالح میمن کا شمار اس وقت پاکستان کے چند بڑے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز شوکت تھانوی کا باقاعدہ معائنہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب معائنہ کے بعد

۱۔ شوکت تھانوی: "خط بنام خورشید شوکت بتاریخ ۱۸ مارچ ۱۹۶۳ء"

۲۔ ماخوذ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۶۸، ۳۶۹۔

اس نتیجہ پر پہنچے کہ جگر میں پھوڑا ہے۔ ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے۔ لیکن شوکت تھانوی کو اصرار تھا کہ وہ ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گے۔ چونکہ وہ انجکشنوں اور دواؤں سے بہت گھبراتے تھے۔ شوکت تھانوی کی بڑی صاحبزادی شوکیہ تھانوی ایک مضمون میں ان کی بیماری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''پھر کرنل یوسف کا علاج شروع ہوگیا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے رؤف یوسف نے جو کہ میو ہسپتال کے انچارج بھی ہیں، معائنہ کیا اور کہا آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیں، لیکن ابا اب تک اس بات پر مصر تھے کہ میں کسی قیمت پر ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ آخر جب کور پر کسی قسم کا افاقہ نہ ہوا تو ابا کے چند مخلص دوستوں نے اصرار کیا، مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر امی نے کہا کہ شوکت صاحب اگر آپ اپنے لیے نہیں تو کم از کم ان بچیوں کے لیے ہی ہسپتال چلے جائیے۔ رضامند ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ میرا اپریشن نہ ہو۔ چھ اپریل کو ابا البرٹ وکٹر کمرہ نمبر ۱۵ میں بستر علالت پر لیٹ گئے اور علاج شروع ہو گیا۔ امی نے بہت محنت کی، رات دن تیمارداری کے لیے کھڑی رہتی تھیں اور دعا کرتی رہتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا''[1]۔

انیس اپریل کو ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بیٹھا۔ ڈاکٹروں نے کینسر ہونے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس بیماری کا مکمل علاج ان کے پاس نہیں ہے۔ جو دوائیں وہ دے رہے ہیں ان سے شوکت تھانوی کچھ عرصہ کے لیے اور زندہ رہ سکیں گے۔ شوکت تھانوی کی خواہش کے مطابق ۲۸ اپریل کو انہیں ہسپتال سے ۶ بری اسٹریٹ، گڑھی شاہو لایا گیا۔ یہاں انہوں نے ہومیوپیتھک کا علاج شروع کر دیا۔ تقریباً چھ دن یہ علاج ہوا۔ ۳ مئی کو شام کو حالت بہت نازک ہو گئی، ۱۵ منٹ تک بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے۔ ۴ مئی کی صبح کو پھر طبیعت خراب ہوئی، ان کا جسم کانپنے لگا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ہزاروں لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ملک کی نامور سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیتوں نے شوکت

---

[1] شوکیہ تھانوی: از نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۶۲۔

تھانوی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ان نامور ہستیوں کے تعزیت نامے محمد طفیل مدیر ”نقوش“ نے نقوش لاہور کے شوکت نمبر میں شائع کیے ہیں۔

اولاد :

شوکت تھانوی کے یہاں پہلی بیوی سے تین بیٹے اور دوسری بیوی سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سب سے بڑے بیٹے سعید عمر تھانوی انیس سو اکتیس عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آج کل پی۔ آئی۔ اے میں پرنسپل انجینئر ہیں۔ انیس سو باسٹھ عیسوی میں ان کی شادی عطیہ زہرا سے ہوئی جو اب عطیہ سعید کہلاتی ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام نوید عمر تھانوی اور ولید عمر تھانوی ہیں جبکہ لڑکیوں کے نام نبیلہ عمر تھانوی اور شمیلہ عمر تھانوی ہیں۔ پہلے ۳۰۔ ڈی، بلاک ”بی“ نارتھ ناظم آباد کراچی میں رہتے تھے، آج کل گلشن اقبال میں اپنا مکان بنا لیا ہے، اس لیے وہاں رہائش پذیر ہیں۔

خورشید عمر :

شوکت تھانوی کے منجھلے بیٹے خورشید عمر انیس سو تینتیس عیسوی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انیس سو ساٹھ عیسوی میں پبلک ریلیشن آفس واپڈا میں سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۶۶ء میں واپڈا کے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں آ گئے۔ سنی ویو کشمیر روڈ پر ڈائریکٹر لیبر اینڈ ویلفیئر واپڈا کا دفتر ہے، اس میں آج کل کام کر رہے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشہور آرٹسٹ ہیں اور بہت سے ڈراموں میں کام کر چکے ہیں۔ نو دسمبر انیس سو باسٹھ عیسوی کو ایم۔ اے رشید کی صاحبزادی فریدہ خانم سے شادی ہوئی، جو اب فریدہ خورشید کہلاتی ہیں۔ ایم۔ اے رشید لکھنؤ ریڈیو کے پرانے آرٹسٹ ہیں اور ان کا شمار شوکت تھانوی کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔ خورشید شوکت آج کل اپنے ذاتی مکان 17 / B - II سٹریٹ نمبر ۱۰، شاہ کمال کالونی لاہور میں رہتے ہیں۔

رشید عمر :

شوکت تھانوی کے سب سے چھوٹے بیٹے رشید عمر انیس سو چالیس عیسوی میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کرنے کے بعد

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد نیشنل کونسل آف آرٹ کے ڈائریکٹر ہو کر اسلام آباد آ گئے جہاں سے دو سال کی ٹریننگ کے لیے رومانیہ گئے۔ اسٹیج لائیٹنگ میں اسپیشلائزیشن کیا۔ آج کل مکین کمیونیکیشن ایڈورٹائزنگ کمپنی کے جنرل مینجر کی حیثیت سے لاہور میں کام کر رہے ہیں۔ ۳۰۱- شاہ جمال کالونی میں رہتے ہیں۔ ان کی شادی ۰۱ مئی انیس سو اکہتر عیسوی کو ابو ظفر صاحب ریٹائرڈ آئی۔ جی مغربی پاکستان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شمیم ظفر سے ہوئی جو آج کل لاہور فاؤنڈیشن سکول، ماڈل ٹاؤن کی پرنسپل ہیں۔ دو بچے ہیں ایک لڑکا کاشف عمر تھانوی اور ایک لڑکی صائمہ عمر تھانوی۔ رشید عمر تھانوی کا شمار ڈرامے کے صف اول کے اداکاروں اور ہدایت کاروں میں ہوتا ہے۔

شوکیہ تھانوی :

انیس سو اکیاون عیسوی میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اکتوبر، انیس سو اکہتر عیسوی میں کیپٹن الطاف احمد سے شادی ہوئی۔ دسمبر انیس سو اکہتر عیسوی میں کیپٹن الطاف احمد سلیمانکی کے مقام پر شہید ہو گئے۔ ان سے ایک بچی پیدا ہوئی، جس کا نام عائشہ الطاف ہے۔ انیس سو اٹھہتر عیسوی میں شوکیہ تھانوی نے رانا ظہیر حسین سے دوسری شادی کر لی جو لاہور ٹیلی ویژن اسٹیشن کے میک اپ سیکشن میں کام کرتے ہیں۔ چھ جون انیس سو اناسی عیسوی کو ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام علی ظہیر رکھا گیا۔ شوکیہ تھانوی آج کل شوکیہ ظہیر کے نام سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہیں اور ان کا شمار صف اول کے آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ آج کل ۱۵۱- حبیب اللہ روڈ، ممتاز سٹریٹ لاہور میں قیام پذیر ہیں۔

فوزیہ تھانوی :

ان کا تاریخی نام شمشاد ہے۔ کوئین میری کالج سے بی۔ اے کیا۔ بیس نومبر انیس سو تراسی عیسوی کو جمشید احمد غوری سے لاہور میں شادی ہوئی۔ غوری صاحب یونائیٹڈ بنک لاہور میں ملازمت کرتے ہیں۔

فیضیہ تھانوی :

ان کا تاریخی نام شاہدہ ہے۔ شوکت تھانوی انہیں پیار سے شدو کہا

کرتے تھے۔ کئی خطوط میں یہ نام بار بار آیا ہے۔ کوئین میری کالج سے بی۔ اے کیا۔ انیس سو اکیاسی عیسوی سے پی۔ آئی۔ اے میں بطور سیلز اسسٹنٹ کام کر رہی ہیں۔

شخصیت

شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ جس جگہ بیٹھ جاتے زندگی چہک اٹھتی۔ بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ ہمیشہ پر سکون اور سنجیدہ رہتا۔ ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی اور گہرے رنگ کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھوں میں ایک نہ بجھنے والی چمک دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی۔ کسی بات کا تجزیہ کرکے اسے دلکش پیرائیہ اظہار عطا کرنے میں انہیں کمال تھا۔ وہ صرف ایک نکتہ کو پھیلا کر داستان بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے ۱۹۳۲ء کے شوکت تھانوی کا حلیہ اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''آڑی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، شریر بے قرار آنکھیں، موزوں دبی، لبوں پر پان کی ہلکی سی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، داڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی''۔

شوکت تھانوی کی یہ تصویر ۱۹۳۲ء کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اور بالخصوص عقد ثانی کے بعد اس تصویر میں نمایاں تبدیلیاں آ چکی تھی۔ داڑھی کے ساتھ مونچھوں کا بھی صفایا کر دیا گیا تھا اور ہاتھ میں چھڑی رکھنے کی عادت بھی ختم کر دی تھی۔ چست پاجامے اور اچکن کے ساتھ ساتھ سوٹ کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ سوٹ پہننے کا شوق تو انہیں بچپن سے ہی تھا لیکن لکھنوی ماحول میں شیروانی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا اس لیے وہ بھی شیروانی پہنا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم جو شادی ہو جانے کے بعد خاتون ارشد کہلائیں، اپنے ایک مضمون میں ان کے سوٹ پہننے اور صاحب بہادر بننے کے شوق کو اس طرح بیان

۱۔ شاہد احمد دہلوی: نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۹۔

کرتی ہیں:

''ان حضرت کو بچپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا۔ اماں ابا سے اور تو سب ضدیں پوری کرا لیتا تھا مگر والد صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کر لو گے سوٹ نہیں پہن سکتے۔ ۱۵ سال کی عمر تھی، یہ میرے پاس اچھا در آئے۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ ہے اور میرے شوہر (ارشد تھانوی) جو شوکت کے چچا زاد بڑے بھائی ہیں، وہاں سب انسپکٹر تھے۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان میرے لیے ایک سوٹ سلوا دیجیے۔ ارشد صاحب خود ابا سے ڈرتے تھے۔ کہنے لگے چچا جان خفا ہوں گے کہ ننھے ننھے شوق قبل از وقت پورے کرتے ہو لیکن میری سفارش پر انہوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی منگا دی۔ بھیا بہت خوش ہوئے۔''

شوکت تھانوی کی یہ صاحب بہادر بنے رہنے کی عادت تمام عمر قائم رہی۔ وہ ہمیشہ اپنے لباس میں خاص اہتمام سے کام لیتے تھے۔ شیروانی پہنتے یا سوٹ، کپڑوں کے رنگ اور وضع سے ہمیشہ ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا۔ تنگ پاجامہ پہنتے تو ان کی چوڑیوں میں سلیقہ نظر آتا۔ کرتوں کی آستینیں چنی ہوئی ہوتیں۔ شیروانی کی تراش ایسی ستھری ہوتی کہ دیکھ کر خوشی ہوتی۔ سوٹ پہنتے تو قمیص کا رنگ سوٹ پر اور ٹائی کا رنگ قمیص پر پھبتا۔ ٹائی، رومال اور موزے ہمیشہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے تھے۔ جوتے ہمیشہ پالش سے چمک رہے ہوتے۔ عشرت رحمانی نے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کے لباس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

''شوکت کی خاص کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری تو اس کی وہی شان ہے جس نے اس کو اس عمر میں بھی ''جوان سال'' بنائے رکھا ہے۔ شوکت کو کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اس معاملے میں اسی قدر لاپروا ہے جس قدر لباس کے معاملے میں محتاط۔ لباس کی خوش اسلوبی اور تراش خراش سے اس کو عشق ہے۔ وہ یوں تو ہر قسم کا لباس پسند اور استعمال کرتا ہے مگر سب سے زیادہ اس کو مشرقی اور خصوصاً لکھنوی لباس مرغوب ہے۔ چنانچہ

۱۔ خاتون ارشد، نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۴۲۸۔

> مخصوص محفلوں میں وہ ہمیشہ سیاہ اچکن اور چوڑی دار چست پاجامہ زیب تن کرکے خوش ہوتا ہے اور ایک بانکا سجیلا جوان بن کر اپنی شگفتہ بیانی کی رونق دکھاتا نظر آتا ہے۔''[1]

شوکت تھانوی لباس کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط تھے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی ان کے لباس کی تعریف کرتی تھیں۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری جو ''قاضی جی'' میں ان کی لاڈلی اکلوتی زبیدہ بہن کا کردار ادا کرتی تھیں، اپنے ایک مضمون میں ان کے لباس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''شوکت بھائی نفاست پسند بہت تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ کبھی ان کے کپڑوں پر میں نے شکن تک نہیں دیکھی۔ وہ جو لباس پہنتے اُن پر بھلا معلوم ہوتا۔''[2]

اپنی دماغی صلاحیتوں سے ہر وقت کام لے لینا ایک بڑی صفت ہے۔ اس کے سہارے آدمی اپنی غلطیوں کو بھی نباہ سکتا ہے اور بے موقع شرمساری سے دوچار نہیں ہوتا۔ حاضر دماغی کے ساتھ ساتھ حاضر جوابی بھی ایک بہت بڑا ہنر ہے، جو آدمی کو کامیاب بناتا ہے اور دوسروں کے لیے تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے۔ بذلہ سنجی اور فطری طور پر مزاح کا شعور شوکت تھانوی کی حاضر جوابی کو چار چاند لگاتا ہے۔ وہ چھیڑ چھاڑ کرنے والے کو بر محل، با موقع اور مختصر جواب سے لاجواب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختر جہاں نے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی حاضر دماغی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

> ''مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر پروگرام ہو رہا تھا۔ اسی دوران اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ زور سے کھلا۔ شاید کوئی شخص غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ واہ رے حاضر دماغی! شوکت صاحب سامنے ہی کھڑے تھے فوراً قاضی جی کی آواز میں بولے ''امجد میاں

١۔ عشرت رحمانی: ماہنامہ کتاب، لکھنؤ شوکت تھانوی نمبر جولائی ١٩٦٣ء، ص ٢٦۔

٢۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری: نقوش، شوکت نمبر ١٩٦٣ء، ص ٥٦٣۔

> دیکھو کوئی عیدی وبدی لینے آیا ہوگا۔ نکال باہر کرو اور دروازہ بند کر دو یہ کیا خرافات ہے۔ اس طرح بات بنائی کہ سننے والوں کو شبہہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی انجانے بن میں اس طرف چلا آیا تھا۔''

شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت بھی ان کی حاضر جوابی کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ انھوں نے ان کی حاضر جوابی اور حاضر دماغی کے کئی واقعات راقم کو سنائے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ شوکت تھانوی کے چھوٹے بیٹے رشید عمر کے حلق میں کچھ تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ غدود بڑھ گئے ہیں اس لیے اپریشن کرا دینا چاہیے۔ شوکت صاحب آپریشن سے بہت گھبراتے تھے۔ سوچا کہ یونانی علاج کرا کے دیکھیں۔ لہذا رشید کو لے کر حکیم نیر واسطی کے پاس مشورہ کرنے کے لیے گئے۔ حکیم صاحب نے بہت توجہ سے رشید کو دیکھا اور ایک ایلو پیتھک نسخہ تجویز کر دیا جس میں آپریشن کا ہونا لازمی تھا۔ حکیم صاحب ایلوپیتھک اور یونانی علاج دونوں کرتے تھے۔ شوکت صاحب کو غالباً اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا۔ یہ نسخہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا ''شوکت صاحب آپ حیران نہ ہوں، یہ نسخہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تجویز کیا ہے۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوں۔ شوکت تھانوی نے معصومیت سے برجستہ جواب دیا ''تو قبلہ پہلے بٹیر سے بسم اللہ کی ہوتی''۔ یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اسی وقت نسخہ پھاڑ کے یونانی علاج شروع کر دیا۔

شوکت تھانوی نہ صرف یہ کہ دوسروں پر فقرے کستے تھے بلکہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ان کا رنگ کالا تھا اس لیے اس کی مناسبت سے اپنے آپ پر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ نسیم ممتاز سید نے اس ضمن میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

> ''ایک روز میں ان کے گھر شام کو پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا۔ میرے پہنچتے ہی شدید بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی حد تک تو شوکت صاحب لطف اندوز ہوتے رہے لیکن جب بہت خوفناک قسم کی کڑک اور بجلی کی چمک شروع ہوئی تو وہ بہت گھبرائے۔ اپنی بیگم کو

۱۔ اختر شہاب: نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۶۷، ۵۶۸۔

اور مجھے ہدایت فرمائی کہ کھڑکیوں کے پردے پورے کھینچ دیے جائیں۔ ان کی بیگم کے لیے تو ممکن ہے یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی لیکن مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے بیگم شوکت سے پوچھا ‘‘آخر یہ کیا بات ہے’’ انہوں نے جواب دیا ‘‘یہ ان کی آج کی نہیں ہمیشہ کی عادت ہے کہ جہاں بجلی چمکی اور ان کے اوسان خطا ہوئے’’ میں نے شوکت صاحب سے وجہ پوچھی تو نہایت معصومیت سے فرمانے لگے ‘‘آپ بھی خوب چیز ہیں۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ بجلی ہمیشہ سیاہ رنگ کی چیز پر گرتی ہے’’ ان کے رنگ کے پیش نظر اگر یہی بات کوئی دوسرا کہہ دیتا تو نہ جانے ان کے غصے کا پارہ کہاں پہنچتا لیکن اپنے رنگ کے بارے میں خود فقرہ چست کیے بغیر نہ رہے۔’’

اسی طرح ایک مرتبہ احمد ساہن نے شوکت تھانوی سے فرمائش کی کہ انہیں اپنی نئی کوٹھی میں لگانے کے لیے مختلف قسم کے گلاب کے پودے درکار ہیں۔ چنانچہ کسی جان پہچان والے آدمی کے ہاتھ یہ پودے کراچی بھیج دیے جائیں۔ ایک دن پشاور سے ساہن صاحب کی بیٹی زرینہ کا خط موصول ہوا کہ وہ کراچی سے پشاور آئی ہوئی تھیں اور اب فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین سے کراچی واپس جا رہی ہیں اس لیے آپ گلاب کے پودے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیں۔ چنانچہ نسیم ممتاز سید اور شوکت تھانوی نے مل کر لاہور کے تمام ذخیروں کو کھنگالا اور اچھے گلاب کے پودے فراہم کیے لیکن کالا گلاب کہیں سے نہ مل سکا، جبکہ زرینہ اور احمد ساہان کی فرمائش میں کالا گلاب خاص طور سے شامل تھا۔ نسیم ممتاز سید لکھتے ہیں کہ اس موقع پر شوکت تھانوی نے اس طرح بات بنائی:

‘‘وقت مقررہ پر ہم دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ عزیزہ زرینہ نے جو دیکھا کہ دو تین قلیوں کے سروں پر پودوں کی ٹوکریاں لدی ہوئی ہیں۔ تو بہت خوش ہوئیں اور چھوٹتے ہی انہوں نے سوال کیا ‘‘نسیم بھائی! کالے گلاب کے پودے بھی لائے’’ میں نے فوراً جواب دیا ‘‘یہ آپ اپنے شوکت چچا سے پوچھیے’’ شوکت صاحب نے جو ابھی میں جواب دیا تو زرینہ نے ٹھٹکنا اور سوچنا شروع کیا۔ جانے

۱۔ نسیم ممتاز سید : نقوش ، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۵۲۰۔

ہم آپ سے نہیں بولتے ۔ ایک ذرا سی فرمائش کی تھی ۔ نہ دوانی سے پوری ہوئی نہ چچا سے ۔ شوکت صاحب نے برجستہ جواب دیا ''سارا لاہور چھان مارا ۔ کالا گلاب نہیں ملا۔ کالا گلاب دیکھنے کی ایسی ہی خواہش ہے زرینہ تو سمجھ لو میں گملے میں اگا کھڑا ہوں'' شوکت صاحب کا جواب سننے سے پہلے کہاں تو زرینہ مغرور رہی تھی ، کہاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ان کی شکایت رفع ہو گئی۔''[1]

شوکت تھانوی میں فقرے بازی کے ساتھ ساتھ نقل اتارنے کا ملکہ بھی موجود تھا ۔ وہ کسی سے پہلی بار ملتے تو باتیں کم کرتے، زیادہ تر وقت اس شخص کی ایک ایک حرکت اور لہجے کی ایک ایک خصوصیت کا مطالعہ بہت غور سے کرتے رہتے ۔ بے تکلف احباب کے ساتھ تنہائی کا موقع ملتا تو بے حد اعتماد سے اس کی ایسی مکمل نقل اتارتے یا اس خوبی سے اس کی پیروڈی کرتے کہ ان کی قوت مشاہدہ کا ہر شخص کو قائل ہونا پڑتا تھا ۔ نقل اتارنے میں یہ مہارت وہ بچپن ہی سے حاصل کر چکے تھے۔ اپنے اسکول کے زمانہ' طالب علمی میں اپنے استادوں کی نقلیں اتار اتار کر اپنے دوستوں سے داد وصول کرتے تھے ۔ ''مابدولت'' میں اس زمانہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''یہ خاکسار اپنے تمام استادوں کی نقل اتارا کرتا تھا ۔ ان کے لب و لہجہ سے لے کر ان کی کمزوریوں تک کی نقل جو غیر شعوری طور پر سب ہی میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں اور جن کا احساس اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی بتائے ۔''[2]

ذہانت کے ساتھ ساتھ شرارت کا ہونا بھی ایک فطری امر ہے ۔ شوکت تھانوی بچپن سے ہی ذہین بھی تھے اور شرارتی بھی ۔ اپنی کتاب ''مابدولت'' میں اپنی شرارتوں کے معیار کا تعین اس طرح کرتے ہیں :

> ''اسکول کے ہر استاد کو معلوم تھا کہ تمام شرارتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں مگر اسی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمینہ پن، کوئی چھوٹی بات اور کوئی ایسی بات کبھی نہ ہوتی تھی کہ جس سے اسکول

۱۔ نسیم ممتاز سید : نقوش ، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۵۶۱ ۔

۲۔ شوکت تھانوی : ''مابدولت'' ادارہ فروغ اردو لاہور ، ص ۵۰ ۔

کی عظمت یا گھرانے کی عزت پر حرف آئے۔ اس کے علاوہ ان شرارتوں میں ذہانت کو بھی کافی دخل ہوتا تھا اور ہم تمام دوستوں میں اتفاق اس قدر تھا کہ کیا مجال کوئی استاد ہم میں سے کسی کا بھید پا لے"۔[۱]

شوکت تھانوی کی شرارتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ جس کے ساتھ شرارت کرتے تھے وہ بجائے خفا ہونے کے ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن جو شادی کے بعد خاتون ارشد کہلائیں، شرارتوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنتی تھیں اور شوکت تھانوی انہیں خوب تنگ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے:

> "ہماری ایک نانی تھیں۔ بیچاری، کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ سنکی ہو گئی تھیں۔ سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں، ہمارے نانے ابا، جن کو ہم بابو ابا کہتے تھے، مدت ہوئی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ۲۵، ۳۰ برس سے لندن میں مقیم تھے۔ اس فراق نے نانی اماں کی دماغی حالت خراب کر دی، پھر بھی وہ ان کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں۔ محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی ۱۱ سال کی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ماموں زاد چھوٹے بھائیوں کو آمادہ کیا کہ اندر جا کر کہو کہ بابو ابا آ گئے اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا۔ نانی اماں بے چاری کو یقین آ گیا کہ سچ مچ ان کے میاں آ گئے اور خوش خوش بیٹھ کر کے اٹھ آئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر جھپکا کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا تو بھتیجے کو دیکھ کر ہاتھ پر دوہتڑ مارا کہ مجھ کو بنانے چلا ہے"۔[۲]

شوکت تھانوی کی زندگی اسی قسم کی شرارتوں اور دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے راقم کو چند واقعات سنائے۔ پہلا واقعہ اس زمانے کا ہے جب شوکت تھانوی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے تھے (۱۹۳۹ء) اور سرپنچ اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے رہا کرتے

۱۔ شوکت تھانوی: "ما بدولت" ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ص ۴۸، ۴۹۔

۲۔ خاتون ارشد: نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۴۲۷۔

تھے ۔ وہیں سرپنچ اخبار کے دفتر میں ایک ہندو رہتا تھا ۔ شوکت تھانوی نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ تم بہت خوبصورت ہو ، بہت حسین ہو ، لڑکیاں تم پر جان دیتی ہیں اور پھر اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میرے گھر پر ایک شمیم نامی لڑکی ہے جو میری بیوی کی سہیلی ہے اور تمہاری ایک جھلک دیکھ کر تم پر سو جان سے فدا ہو چکی ہے اور یہاں سے اب شوکت صاحب کا ڈرامہ شروع ہوا ۔ کبھی فرضی لڑکی کے نام سے پرچے لکھے جا رہے ہیں ، کبھی اندھیرے میں برآمدے میں پڑی ہوئی چک کے پیچھے سے دوپٹہ نکال کر باہر لٹکایا جا رہا ہے ۔ جب اس بیچارے کو اچھی طرح مجنوں بنا لیا تو یہ بھانڈا پھوڑا کہ یہ فرضی لڑکی شمیم اور یہ اس کے خطوط ، یہ سب شوکت صاحب ہی کی کارستانی ہے ۔ اس واقعہ سے وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر نظر نہیں آیا ۔ یہی واقعہ بعد میں شوکت صاحب کی کتاب ''خانم جان'' کا پلاٹ بن گیا ۔

ایک دوسرا واقعہ انہوں نے یہ سنایا کہ ایک مرتبہ پڑوس میں کسی دھوبی کے گھر کوئی تقریب تھی ۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن نے ان سے کہا کہ ''دھوبی کے گھر کے ماش اور چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے'' یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب چپکے سے اٹھے اور دھوبی کے گھر جا کر کہہ دیا کہ ''ہماری بہن صاحبہ ماش اور چاول مانگ رہی ہیں'' اور یہ کہہ کر غائب ہو گئے ۔ تھوڑی دیر بعد دھوبی ماش اور چاول کا تھال لیے دروازے پر تھا ۔ اس تحفہ پر ان کی بہن صاحبہ حیران ہوئیں ۔ تحقیقات کی تو معلوم ہوا یہ سب شرارت شوکت صاحب کی ہے ۔

شوکت تھانوی کو یہ شوخی ، مزاح اور بذلہ سنجی ورثہ میں ملی تھی ۔ ان کے والد صاحب بھی ایک زندہ دل انسان تھے ۔ ان کی زندہ دلی کے چند واقعات شوکت تھانوی نے اپنی کتاب ''مابدولت'' میں تحریر کیے ہیں ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں یہ زندہ دلی ورثہ میں ملی ہے ۔ مولانا عبدالرحیم نگینہ، منشی صدیق احمد (شوکت صاحب کے والد) کے دوست تھے ۔ ان کا رنگ سیاہ، قد چھوٹا، دوہرا جسم اور چہرے پر ناک نہ ہونے کے برابر ۔ ان کو دیکھ کر بہت سے جانوروں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھیں ۔ شوکت تھانوی نے ''مابدولت'' میں ان کے کئی واقعات بیان کیے ہیں :

> ''ایک دعوت کے موقع پر والد صاحب کو پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ایک دوست کے نہایت گورے چٹے بچے کو مولانا کھلا رہے ہیں۔ بچہ ان کے کندھے پر بیٹھا تھا۔ لوگوں نے والد صاحب سے شکایت کی کہ آخر اتنی دیر کیوں کر دی۔ آپ نے نہایت تشویش سے فرمایا، سال کا شگون نکل رہا تھا، میں بھی ذرا وہاں ٹھہر گیا۔ مگر خدا ہی خیر کرے اب کی نوروز سؤر پر سوار ہے''۔ محفل میں قہقہہ پڑا اور مولانا نے بدحواس ہو کر بچے کو کندھے سے اتار دیا''۔[1]

منشی صدیق احمد کی بذلہ سنجی کا صرف یہ ایک واقعہ نہیں، ان کی زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح جب ہم شوکت تھانوی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی زندگی میں بھی بذلہ سنجی کے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں۔ ان کی بیگم سعیدہ شوکت، محمد طفیل مدیر نقوش کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتی ہیں:

> ''جب ان کا مذاق کا موڈ ہوتا تھا تو وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں چھوڑتے تھے۔ چاہے والدہ ہوں، چاہے ہم ہوں، مجھ سے، بچوں سے اور حد یہ کہ نوکر چاکر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اور وہ اس وقت ایک شریر لڑکے کی طرح ہر ایک کو چھیڑتے پھرتے تھے۔ میں نماز پڑھ رہی ہوں تو میرے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا۔ اب نہ میں رکوع میں جا سکتی ہوں نہ سجدے میں، ایک عجب مصیبت میں جان ہے اور وہ ہیں کہ لطف لے رہے ہیں اور ایک ایک کو بلا کر تماشہ دکھا رہے ہیں یا کبھی نماز پڑھتے ہوئے مجھے چوکی سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا، کبھی میں سجدے میں ہوں تو کسی بچے کو میری پیٹھ پر سوار کر دیا اور میں سجدے ہی میں رہ گئی''۔[2]

ہر شخص کی زندگی کے مختلف رخ ہوتے ہیں۔ کبھی وہ اولاد، کبھی بھائی، کبھی شوہر اور کبھی باپ کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ شوکت تھانوی نے بھی یہ تمام مدارج طے کیے اور ہر جگہ ان کی شخصیت بڑی نمایاں نظر

۱۔ شوکت تھانوی: ''ما بدولت'' ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ص ۳۲۔

۲۔ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۱۴، ۳۱۳۔

67396

آتی ہے۔ اولاد کی حیثیت سے انھوں نے اپنے والد کی بیماری کے دوران جو تیمارداری کی، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے "ما بدولت" میں تحریر کیا ہے کہ جب والد صاحب کے سرطان کا پھوڑا نکل آیا تو انھیں ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ شوکت تھانوی ان کی تیمارداری کے لیے ہر وقت ہسپتال میں موجود رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ان کی تیمارداری میں ماموں صاحب اور ہم شب و روز مصروف رہے۔ اسی علالت کے زمانہ میں ایک روز جب کہ ہم ان کا پیٹ صاف کر رہے تھے اور پاخانہ کا برتن صاف کر کے رکھ چکے تھے۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی تمنا کرتے ہیں۔ کم سے کم میرے لڑکے نے حق ادا کر دیا۔ ماموں صاحب نے جو کبھی کسی بچے کی تعریف کرنا گناہ عظیم سمجھا کرتے تھے، آج پہلی مرتبہ فرمایا کہ اس لڑکے نے ایسی خدمت کی ہے کہ میرے دل میں گھر کر لیا ہے اور یہ انشاءاللہ بڑی ترقی کرے گا"۔[1]

بھائی کی حیثیت سے انھیں مولانا ارشد تھانوی (عم زاد) سے جو محبت تھی وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے بھائی کا احترام کیا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ جب تخلص رکھنے کا وقت آیا تو ارشد تھانوی کی مناسبت سے اپنا تخلص شوکت تھانوی رکھا۔ اپنی بہن طہور فاطمہ بیگم سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ اس محبت کا اظہار اپنے ایک مضمون میں اس طرح کرتی ہیں:

> "شوکت کیسا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی۔ لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی باجی جلدی آئیے دیکھو مجھ کو سائیکل چلانا آ گئی، اور باجی اپنے بھیا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی۔ دنیا کی کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو۔ باجی اور بھابی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنی داد ہر نئی بات کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکا۔

۱۔ شوکت تھانوی: "ما بدولت" ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ص ۸۰۔

> بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا''۔۱

شوکت تھانوی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سعیدہ بیگم سے دسمبر ۱۹۲۶ء میں اور دوسری شادی زہرا بیگم سے مارچ ۱۹۴۹ء میں۔ اپنی دونوں بیگمات سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی بیوی بچوں کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں ضرور بھیج دیا کرتے تھے۔ سعیدہ بیگم نے راقم سے گفتگو کے دوران بتایا کہ وہ تین سو روپے ماہانہ بھیجا کرتے تھے۔ بچوں کو اگر مزید ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان سے جا کر لے آیا کرتے تھے۔ جب تک لاہور رہے تو یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب شوکت تھانوی کراچی اور راولپنڈی چلے گئے تو بذریعہ منی آرڈر یہ رقم بھیجا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں محمد طفیل مدیر نقوش کو بتایا :

> ''ہماری ازدواجی زندگی بڑی پرسکون تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تحاشہ محبت کرتے تھے اور کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات مجروح ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو وہاں ناخوشگواری کا سوال ہی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی تو یہ بھی مبالغہ آرائی ہوگی۔ برتن پاس ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں۔ بس احتیاط یہ ہے کہ ٹوٹے نہیں''۔۲

شوکت تھانوی کی اپنی بیگمات سے محبت کا اندازہ ان کے خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ سعیدہ شوکت اپنے میکے میں تھیں کہ شوکت تھانوی نے لکھنؤ سے ۵ ستمبر انیس سو چالیس کو انہیں ایک خط تحریر کیا۔ آپ بھی دیکھیے :

> ''سعیدہ ڈارلنگ ! کل تمہارا خط میری بے چینی اور تمہاری تکلیف سے انتہائی پریشانی کی حالت میں ملا۔ خدا کرے جو تکلیف تم کو اب باقی ہو وہ بھی دور ہو جائے اور میرا یہ خط پہنچنے تک میری روح

۱۔ نقوش ، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۲۔

۲۔ نقوش ، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۱۳۔

> میری جان سے زیادہ عزیز میری محبوب بیوی بالکل تندرست ہو۔ آمین۔ تمہارے گھبرانے یا پریشان ہونے کی آخر کون سی بات ہے۔ اس کو تو گھبرانا ہی نہ چاہیے جس کا کوئی چاہنے والا موجود ہو۔ تم نہ سمجھو مگر شوکت تمہارا دیوانہ وار پرستار ہے"۔[1]

انیس سو انچاس عیسوی میں شوکت تھانوی نے جب دوسری شادی کر لی تو سعیدہ بیگم کی ناراضگی کے سبب انہوں نے دوسری بیگم کے پاس گڑھی شاہو رہنا شروع کر دیا۔ ایسی حالت میں بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنی پہلی بیگم کو خط لکھتے رہتے تھے۔ اہم معاملات میں سعیدہ بیگم بھی خط لکھ کر شوکت تھانوی سے مشورہ لے لیا کرتی تھیں۔ شوکت تھانوی کے ۲۲ اگست انیس سو اکسٹھ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعیدہ بیگم صاحبہ نے سعید عمر کی شادی کے موقع پر شوکت تھانوی سے اس رشتہ کے بارے میں ان کی مرضی دریافت کی، جس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

> "بیگم صاحبہ، آداب! آپ کا خط ملا۔ میں نے اس پر غور کیا اور غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کو مبارکباد دوں۔ یہ خاندان ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ میں اس کے اکثر حضرات سے واقف ہوں اور ان کی شرافت نسلی اور ذاتی شرافت کا قائل ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعید کی مرضی کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور سعید اور عطیہ سلمہا کی راہ میں ناعاقبت اندیش باپ کی طرح حائل ہونا نہیں چاہتا۔ پھر یہ کہ حائل ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ اول تو سعید خود ہی سمجھ دار اور عاقبت اندیش ہے، دوسرے اس خاندان میں مجھے بھی کوئی خامی نہیں ہے۔ لہذا اللہ مبارک کرے، آپ بسم اللہ کیجیے"۔[2]

دوسری شادی کے بعد شوکت تھانوی کی ازدواجی زندگی پر ارشد تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس اہم معاملہ میں ان کی رائے اس لیے صائب معلوم ہوتی ہے کہ محمد عمر کو شوکت تھانوی بنانے والے اصل میں ارشد تھانوی ہیں اور شوکت تھانوی کی زندگی کے اہم معاملات میں انہیں سب سے زیادہ دخل رہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

۱۔ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۷۱۔

۲۔ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۷۲، ۵۷۳۔

> ''شوکت نے لاہور کی ایک پڑھی لکھی خاتون سے عقد کر لیا۔ اس سلسلہ میں سعیدہ خاتون سے تلخی پیدا ہوئی اور اس قدر بڑھی کہ شوکت اپنی کنال پارک والی شاندار سجی سجائی کوٹھی چھوڑ کر کڑھی شاہو کے ایک چھوٹے سے مکان میں نئی بیوی زہرہ بیگم کے ساتھ آ رہے۔ اس وقت سے اب تک پندرہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، ان میاں بیوی نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی یہاں تک کہ جب شوکت مرض الموت میں مبتلا لاہور میو اسپتال میں زیر علاج تھے (غالباً ڈاکٹروں کے مشورہ پر) سعیدہ خاتون ان کو دیکھنے نہیں گئیں۔ گھر پر بیٹھی کسی خطرہ کے احتمال سے لرزتی سر بسجدہ ہو کر دعائیں مانگتی رہیں۔ پھر وفات ہو جانے پر جسد بے جان کا آخری دیدار بھی نہ کیا۔۔۔ اس پندرہ سالہ علیحدگی کے دوران میں میاں بیوی کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری رہا اور شوکت ایک رقم اپنی بڑی بیوی کو پوری پابندی سے ماہ بہ ماہ بھیجتے رہے''۔[1]

چھوٹی بیگم سے محبت کا اندازہ شوکت تھانوی کے بہت سے خطوط سے ہوتا ہے۔ ۷، جولائی انیس سو ستاون کے ایک خط میں وہ لندن سے لکھتے ہیں کہ:

> تم اس ملازمت کے سلسلہ میں بالکل رنجیدہ نہ ہو، جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری خوشی ہے۔ اگر تم ہی خوش نہ ہو تو میں رتبہ، تنخواہ وغیرہ سب کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ تم اس سلسلہ میں ذرہ برابر پروا نہ کرو۔ جو تمہارا فیصلہ ہوگا وہی میرا ہوگا۔''[2]

زہرہ بیگم کو شوکت تھانوی سے کتنی محبت تھی، اس کا اندازہ ان کی تیمارداری سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ رات دن تیمارداری میں لگی رہتی تھیں۔ ان کے تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے ان کی اس تیمارداری کی بہت تعریف کی ہے۔ ارشد تھانوی بھی ایک مضمون میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱- نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۰ - ۳۵۱

۲- ایضاً، ص ۵۷۶ - ۵۷۷

''زہرہ بیگم دن رات مریض شوہر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں اور ہسپتال سے اسی کے گھر پر جانے کے دو تین روز بعد مرنے والے نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی۔''۱

شوکت تھانوی کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ اپنے بچوں کی تمام خواہشات پورا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بیگم سعیدہ شوکت صاحب نے اپنے انٹرویو کے دوران رقم کو بتایا کہ وہ اپنے تینوں بیٹوں سے بہت پیار کرتے تھے اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کریں اور اسی بات پر بیگم صاحبہ کی ان سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی کیونکہ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ بچوں کی ہر ضد پوری کرنے سے بچے خراب ہو جاتے ہیں لیکن اس معاملہ میں شوکت تھانوی اپنی بیگم صاحبہ کی کوئی بات نہ سنتے اور بچوں کی ہر جائز و ناجائز ضد کو پورا کرتے رہتے۔ خود ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے تھے۔ شوکت تھانوی نے اگر اپنے کسی بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹ دیا ہے تو وہ خود ہی تھوڑی دیر بعد گلے لگا کر چمکار بھی لیا کرتے تھے۔ رات کو جب تک کوئی بچہ ان کے ساتھ نہ لیٹے ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ بیگم صاحبہ نے گفتگو کے دوران بتایا کہ شوکت صاحب نہ صرف اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے تھے بلکہ اپنے تمام رشتہ داروں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بہت مشفقانہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے تمام رشتہ داروں میں ہر دلعزیز تھے۔

دوسری شادی کے بعد جب پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ کچھ کھچاؤ کی کیفیت پیدا ہوئی تو اس زمانے میں بھی شوکت تھانوی نے اپنے بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ بڑے بیٹے سعید عمر کو پی۔ آئی۔ اے میں اور منجھلے بیٹے خورشید عمر کو واپڈا میں اپنے اثر و رسوخ سے ملازمت دلوائی اور مرتے دم تک ان کی بہتری کے لیے کوشاں رہے۔ راولپنڈی سے ۳۱ اگست انیس سو باسٹھ کو سعیدہ شوکت صاحبہ کے نام ایک خط تحریر کیا جس کے متن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے کتنے خیر خواہ تھے:

کمال کر دیا آپ سب نے کہ دیوروں کو بھابی جان مل گئیں اور ساس کو بہو مل گئی، لہٰذا اب اس بڈھے کو گھاس ڈالنے کی کوئی

۱۔ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۱

> ضرورت ہی نہ رہی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں جب انعام الحق اور اقبال سلمہ' کو خط لکھا تو معلوم ہوا کہ جناب مع دلہن بیٹی کے لاہور پہنچ چکی ہیں۔ آج سڈنی سے سعید کا خط بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ساتھ خیریت کے واپس لائے۔ اس پیارے پیارے احمق نے لکھا ہے کہ ابا اپنے سوٹ کی پیمائش بھیج دیجیے میں آپ کے سوٹ لاؤں گا۔ میں نے اس کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ خبردار جو سوٹ لائے، اس لیے کہ وہ جب تک سڈنی میں لنگوٹی باندھ کر نہ پھرے، میرے لیے سوٹ لانے کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ لانا ہے وہ میری بیٹی یعنی اپنی دلہن کے لیے لانا مجھے اس کی زیادہ خوشی ہوگی اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنی امی جان کے لیے ایک کنگرو کا بچہ ضرور لانا۔ بھئی خدا کے لیے اس اونٹ یعنی خورشید کو بلا کر اور کسی اسٹول پر کھڑی ہو کر ذرا اس کے کان تو پکڑ لو یعنی مجھے اس نے خط ہی نہیں لکھا نہ یہ لکھا کہ میں نے حامد جلال صاحب کو اس کے متعلق جو خط لکھا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوا۔ میں نے حامد جلال صاحب کو بڑے زور دار الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ خورشید کو رسالہ کے شعبہ میں لے لیں۔ حامد جلال صاحب نے مجھ کو اب تک جواب نہیں دیا ہے۔ لہذا خورشید کو بلا کر کہو کہ وہ حامد جلال صاحب کو یاد دلائے کہ میرے خط کا جواب ان کے ذمہ ہے۔ بابا بیچارہ تو امتحان کی تیاریاں کر رہا ہوگا لہذا اگر خط لکھا تو سخت خلل واقع ہوگا۔ کوئی پروا نہیں، کچھ دن کے بعد انشاء اللہ میرا پوتا مجھے خط لکھا کرے گا۔''

اس خط کے اقتباس سے شوکت تھانوی کی بیٹوں سے محبت اور ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا ارشد تھانوی نے بھی اپنے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی صفات بیان کرتے ہوئے اس صفت کی خاص طور سے تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان کے بیٹے بھی زہرہ بیگم والے گھر پر نہ جا سکتے تھے، ریڈیو اسٹیشن پر ضرورتاً جا کر مل لیتے تھے۔ پھر جب وہ روزنامہ ''جنگ'' کے ادارے میں کراچی آ کر شامل ہوئے، تب بھی ان کے بیٹے ان

۱- نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۷۳-۵۷۴

کے گھر نہ جا پاتے تھے۔ پھوپھی یا خالہ کے یہاں رہتے اور دفتر روزنامہ "جنگ" میں جا کر ملتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوکت کو اپنے بیٹوں سے محبت نہ رہی تھی۔ وہ رفع شر کے لیے ایسا کرتے تھے ورنہ بچوں کی بہبود کا پوری شدت سے خیال رکھتے تھے۔ ایک موقع پر تار دے کر سعید عمر کو لاہور سے بلایا۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر پی۔ آئی۔ اے کے شعبہ انجینئری میں بھرتی کرایا۔ جہاں اب وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کو واپڈا میں ایک معقول جگہ دلوائی۔ دونوں کی شادیوں میں شریک تو نہیں ہوئے مگر مصارف کے لیے بڑی بڑی رقوم بھیجیں۔''[1]

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی کو اپنے بچوں سے محبت تھی، وہ ان کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انہوں نے بڑے بیٹے سعید عمر اور منجھلے بیٹے خورشید عمر کی شادیوں کے موقع پر ان کی مالی امداد بھی کی لیکن وہ ان دونوں شادیوں میں شریک نہیں ہوئے۔ ہم نے اس سوال کا جواب پانے کے لیے سعید عمر، خورشید عمر اور بیگم سعیدہ شوکت سے گفتگو کی تو ان سب نے ایک جیسا ہی جواب دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسری شادی کے بعد شوکت تھانوی اپنی دوسری بیگم زہرہ شوکت سے بہت ڈرتے تھے جس کی وجہ سے وہ ان شادیوں میں شریک نہ ہو سکے۔ ہم نے یہی سوال بیگم زہرہ شوکت سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ شوکت صاحب کا اپنی پہلی بیگم صاحبہ اور بچوں سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ میری دوسری بیوی اور بچیوں کو بھی شادی میں بلائیں تو وہ بھی شرکت کر سکتے ہیں ورنہ ان کے لیے شرکت کرنا ممکن نہ ہوگی۔ بیوی بچوں نے چونکہ یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ مجھے دعوت دیتے اس لیے شوکت صاحب نے ان شادیوں میں شرکت نہیں کی۔

شوکت تھانوی کے پہلی بیگم سے تین بیٹے تھے اور دوسری بیگم سے تین بیٹیاں۔ انہیں بیٹی کا باپ بننے کی تمنا بہت عرصہ سے تھی اور وہ یہ طے کر چکے تھے کہ اپنی بیٹی کا نام شوکیہ رکھیں گے۔ وہ اس نام کو کیوں پسند کرتے تھے اس کا پس منظر مولانا ارشد تھانوی اپنے مضمون میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شوکیہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی تابانی اور درخشندگی کے ہیں،

---

[1] نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۵۱

> اس نام کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ بھوپال سے کسی زمانہ میں ایک نسوانی رسالہ ''الحجاب'' کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ شائع ہوا، شوکیہ اس کا عنوان تھا۔ شوکت کی باجی کو یہ نام بہت پسند آیا۔ کہا کرتی تھیں کاش یہ نام میرا ہوتا۔ جب ان کے بھیا نے اپنا تخلص شوکت رکھا تو انہوں نے کہا، میں اس کی بچی کا نام شوکیہ رکھوں گی۔ شوکت بھی باجی کے اس خیال میں شریک ہوگئے مگر ان کے متواتر لڑکے تو ہوتے رہے لڑکی کوئی نہ ہوئی۔۔۔ انہوں نے دوسرا عقد کیا اور بچی پیدا ہوئی تو بہن کو خط لکھا۔ اللہ کا شکر ہے بڑے انتظار کے بعد آخر شوکیہ آ گئی۔''[۱]

حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی نے شوکیہ کی پیدائش پر اتنی خوشی منائی کہ لوگ لڑکے کی پیدائش پر بھی اتنی خوشی نہیں مناتے۔ منتوں اور مرادوں کے بعد ان کی زندگی کی یہ تمنا شوکیہ کے روپ میں پوری ہوئی۔ شوکیہ تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں اپنے والد کی محبت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''جب میں پانچ برس کی تھی تو مجھے کانوینٹ سکول میں داخل کرایا گیا۔ ابا ریڈیو اسٹیشن پر تھے ہی، اسکول ابا کے راستے میں پڑتا تھا، اس لیے ان کے ساتھ آنے جانے میں بہت خوشی محسوس کرتی۔ شام کے وقت فرش پر گھوڑا بننا، ہم کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا، ابا کا خاص مشغلہ تھا۔ جب پیٹھ پر بٹھا کر ادھر ادھر ہوتے تو امی کو ہمارے گرنے کی بہت فکر ہوتی لیکن ابا ہنستے ہوئے کہتے کہ میں اس نسل کا گھوڑا ہوں جو کہ مالک کے گرنے پر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چوٹ نہیں لگتی۔ تین سال کی عمر میں ہم نے گھر میں ایک کتا پال رکھا تھا جس کا نام ''جیکی'' تھا۔ ایک دن میں نے ابا کی ڈبیا، جس میں پان کتھا اور چونا تھا، ابا سے چوری اٹھا کر جیکی کے پاس لے گئی اور جا کر کہا ''جیکی ''تو ما دو'' کھائے گی۔ ابا نے مجھے دیکھ لیا اور گود میں اٹھا کر کہنے لگے میری بیٹی بہت مہمان نواز بنے گی۔''[۲]

۱۔ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۲ - ۳۵۳

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۰

شوکت تھانوی کی پدرانہ شفقت کے صرف چند واقعات ہم نے یہاں تحریر کیے ہیں۔ ہم نے ان کے تینوں بیٹوں اور تینوں بیٹیوں سے ملاقات کی ہے بلا استثنا سب کے سب اپنے باپ کی محبت اور عظمت کے دل سے قائل ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بچے اپنے باپ کی نسبت اپنی ماں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں لیکن یہاں معاملہ الٹ ہے چونکہ شوکت صاحب کے بچے ماں کی بجائے باپ سے زیادہ مانوس ہیں اور اس بات کا اعتراف بیگم سعیدہ شوکت نے اپنی گفتگو کے دوران بھی کیا ہے۔ دوسری بیگم زہرہ شوکت بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔

شوکت تھانوی کی طبیعت شگفتہ تھی اس لیے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا اور جس سے ایک مرتبہ دوستی ہو جاتی اسے آخر دم تک نبھانے کی کوشش کرتے۔ ان کی دوست داری کا ایک نمونہ نسیم انہونوی کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ستمبر انیس سو اکتیس عیسوی میں ''سرپنچ'' کا اجراء ہوا اور شوکت تھانوی جب تک لکھنؤ رہے بغیر کسی معاوضے کے مختلف حیثیتوں میں ان کی امداد کرتے رہے۔ کچھ عرصے تک اعزازی ایڈیٹر بنے رہے۔ اس کے لیے مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ بعض کالم دوسرے قلمی ناموں سے بھی لکھے۔ ندیم سیتاپوری نے ایک مضمون میں نسیم انہونوی اور شوکت صاحب کی دوستی ان الفاظ میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

> ''شوکت، نسیم کی جدید ترین دریافت تھا۔ نسیم اس سلسلہ میں ہمیشہ خوش نصیب رہے کہ جہاں اپنے مطلب کا آدمی نظر آیا، یہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ نسیم کی دیدہ وری کو شوکت میں وہ سب کچھ نظر آیا جو انہیں ہر حیثیت سے آگے بڑھا سکتا تھا۔ نسیم کا تیر نشانے پر ٹھیک ہی بیٹھا۔ شوکت، نسیم کی ''دیدہ وری'' کا شکار ہو گئے اور باقاعدگی کے ساتھ انعامی بسکٹ فیکٹری پہنچنے لگے۔ یہ فیکٹری تو نام ہی کی تھی ایک چھوٹی سی دکان ضرور تھی۔ زیادہ پابندی سے نہیں مگر اکثر ابن ساونوی بھی آ جاتے تھے۔ گور کرھنی کا سارا کام نسیم کے سپرد تھا۔ ''سٹوو'' پر چائے بنانا، توسٹ پر مکھن لگانا اور نفاست کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنا۔ شوکت کے چبھتے ہوئے فقرے، اس کی پروقار سنجیدگی اور نسیم بھائی کی روندھی ہوئی ہنسی۔ مدتوں اس ماحول کا روزمرہ

بنی رہی ہے۔"[1]

نسیم انہونوی اور امین سلونوی کے ساتھ اتنی دوستی بڑھی کہ دنیا انھیں ایک جان اور تین قالب سمجھنے لگی اور اس دوستی کی ایسی شہرت ہوئی کہ لوگوں نے باپ، بیٹا اور روح القدس والی بات بھی کہہ ڈالی۔ اسی طرح عشرت رحمانی کے ساتھ تعارف ہوا اور یہ تعارف دیکھتے ہی دیکھتے دوستی میں ڈھل گیا۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

> "اس کے بعد شوکت اور عشرت قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ چنانچہ ادبی دنیا میں یہ دونوں نام کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہوگئے کہ شوکت کے مضمون کی فرمائش عشرت کو اور عشرت کے مضمون کے لیے شوکت کے پاس تقاضے آنے لگے اور آتے رہتے ہیں اور یہ ملاپ اب پیار، محبت جھگڑے لڑائی کی تمام پر خلوص حدود سے تجاوز کر کے محض قرابت بن گیا ہے۔"[2]

نسیم انہونوی نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہفت روزہ "سرپنچ" کی اسکیم شوکت تھانوی نے بنائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "حریم کے چند ہی پرچے شائع ہوئے تھے کہ شوکت صاحب نے ایک مزاحیہ ہفتہ وار نکالنے کی اسکیم بنا کر مجھے اس کا مالک بنایا خود ایڈیٹر بنے اور امین سلونوی صاحب کو مینجر کی کرسی دی گئی۔ ہم تینوں نے باپ بیٹے روح القدس کا لقب حاصل کیا اور حالت یہ تھی جہاں کوئی نظر آئے ہم تینوں ہی ساتھ ہوئے۔"[3]

محمد طفیل کے ایک مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوستوں سے وعدہ نبھانے کی کوشش کرتے تھے انیس سو سینتالیس عیسوی میں انھوں نے ایک ناول دینے کا وعدہ کیا تو محمد طفیل لاہور سے لکھنؤ وہ ناول لینے کے لیے پہنچ گئے۔ ناول ابھی تیار نہیں تھا لیکن انھیں اس بات کا احساس بھی تھا کہ ایک دوست اتنی دور سے ان کے پاس پہنچا ہے اس لیے انھوں نے ایک رات میں ناول لکھوا کر ان کے حوالے کیا۔ محمد طفیل کی زبانی ناول لکھوانے

۱۔ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۲۹۔

۲۔ "ماہنامہ کتاب" لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۱

کا حال سنیے:

> ''شام کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے قلم، دوات اور کاغذ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ لکھو ناول، تو میں سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ آخر میں کہاں تک لکھتا۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لائے اور ان سے لکھنے کو کہا۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے۔ جب وہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہو گئے تو پھر میری باری آئی۔ چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحے کا ناول ختم تھا۔ اس ناول کا نام ''بیوی'' ہے۔''[1]

شوکت تھانوی نے اپنے تمام دوستوں سے دوستی نبھانے کی کوشش کی۔ نسیم انہونوی اور محمد طفیل سے ان کی دوستی ایک مثالی دوستی ہے۔

انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور بھلا کون سا انسان ایسا ہے جو برائیوں سے بالکل مبرا ہو۔ قدرت کا کچھ اصول ہی ایسا ہے کہ ہر بُرے سے بُرے انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے اور ہر اچھے سے اچھے انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائی جاتی ہے۔ شوکت صاحب کی شخصیت میں جہاں بے پناہ اچھائیاں تھیں وہاں چند خامیاں بھی موجود تھیں لیکن ان کی خامیوں پر خوبیاں غالب رہیں۔ شوکت تھانوی کی ایک کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ:

> ''دوسروں سے مذاق کرنے میں تو وہ حد سے بھی تجاوز کر جاتے، لیکن خود دوسرے کا مذاق برداشت نہ کر سکتے تھے۔''[2]

شوکت تھانوی ماں باپ کے بے حد لاڈلے تھے اور بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی چونکہ بچپن میں کافی بیمار رہے اس لیے ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہر ضد منوانے

---

[1] ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۔

[2] نسیم انہونوی؛ نقوش، شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۳۰۔

ان کی عادت بن گئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی ضد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہ ان کی ضد ہی تھی جس کی وجہ سے وہ آخری علالت کے ایام میں ہسپتال میں داخل ہونے سے منع کرتے رہے۔ دوستوں کے اصرار اور بیگم صاحبہ کی گذارش پر جب ہسپتال میں داخل ہوگئے تو ڈاکٹروں کی مرضی کے خلاف واپس گھر آ گئے اور پھر اس ضد کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

شوکت تھانوی کے دوست بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ بہت ضدی تھے۔ محمد طفیل نے ایک مضمون میں اس بات کی تائید اس طرح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بچوں کی طرح یہ ضد بھی کرتے تھے اور بڑوں کا سا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کسی معمولی سی بات پر اڑ جائیں گے اور دنیا جہاں ایک کر کے اس بات کو منوا کے رہیں گے۔''[1]

بچپن کی آسائشات کی بناء پر ان میں خوشامد پسندی پیدا ہوگئی تھی اور یہ خوشامد پسندی بڑے ہو کر بھی ان کی طبیعت میں شامل رہی۔ اسی عادت کی وجہ سے ایک اور کمزوری پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی برائی کسی سے سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے دوستوں کو بھی اور گھر والوں کو بھی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان کی برائی کی نشاندہی کر سکیں۔ نسیم انہونوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''شوکت صاحب میں میرے خیال سے جو سب سے بڑی کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ ان کی کسی کمزوری پر تنقید کر دی جائے اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو شوکت صاحب اس طرح برہم ہو جاتے کہ الفاظ میں اس برہمی کا لکھنا آسان نہیں اور اسی لیے مجھے اعتراف ہے کہ میں شوکت صاحب کی کمزوریوں پر کبھی تنقید نہ کر سکا۔''[2]

شوکت تھانوی کی ضد اور ہٹ دھرمی نے ان میں بعض ایسی عادتیں بھی پیدا کر دیں جس کی وجہ سے گھر کا سکون تباہ و برباد کر دیا مثال کے طور پر انہوں نے اپنی بیگم سے چھپ کر تاش کھیلنا شروع کیے اس کا جواز وہ ''مابدولت'' میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''کوئی نہ کوئی کاروبار ہونا چاہیے تھا۔ یا یوں کہیے کہ کاروبار

۱۔ ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۔

۲۔ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۹۵۔

وہ کرے جو بیکار ہو۔ ہم خدا نخواستہ بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو کھولتے پھرتے۔ مقصد تو روپیہ اگانے سے تھا اور منافع کمانے سے تھا لہذا ہم نے سب سے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار میں نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے یعنی یا تو وارے نیارے ورنہ ہارے تو بھاگے۔۔۔ ہم تو اس سلسلہ میں تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے اور تقدیر کی آزمائش کا موقع جس قدر تاشوں میں حاصل ہوتا ہے اتنا کسی اور کاروبار میں حاصل نہیں ہو سکتا۔"۱

تاش کی عادت میں اتنے مبتلا ہوئے کہ فلاش کھیلتے کھیلتے رمی کی طرف آ گئے۔ شوکت تھانوی کی دوسری بیگم زہرہ شوکت کو ان سے یہی شکایت تھی کہ وہ جب رمی کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے انٹرویو میں محمد طفیل کو بتاتی ہیں:

"کسی زمانے میں شوکت صاحب رمی بہت کھیلتے تھے اس کی وجہ سے ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا مگر یہ شوق بھی دوستوں کی خوشنودی کے لیے ہی پورا کیا کرتے تھے۔ مگر صاحب ہوتا یہ ہے رمی کیا ہوتی تھی ایک عذاب ہوتا تھا۔ دو دو دن بیٹھے ہیں۔ تین تین دن بیٹھے ہیں زیادہ تر یہ ان دنوں ہوتا تھا جب جگر صاحب آئے ہوتے ورنہ کھیلتے تو تھے، یوں دنیا کو بھول کر نہ کھیلتے تھے۔ بعد میں، میں نے طریقوں طریقوں سے یہ عادت بھی چھڑا دی تھی۔ اس کے لیے وہ میرے شکرگذار بھی تھے۔"۲

شوکت تھانوی کی بزدلی کا اعتراف ان کے دوستوں کو بھی ہے اور بیگمات کو بھی۔ بیگم زہرہ شوکت نے راقم سے گفتگو کے دوران میں کہا کہ شوکت صاحب اتنے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ شوکیہ، موزیہ اور فیصیہ کی پیدائش پر انھوں نے انہیں ہمیشہ لاہور بھیج دیا اور وہ اپنی والدہ کے پاس رہا کرتی تھیں۔ محمد طفیل نے لکھا کہ:

"آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے

۱۔ شوکت تھانوی: "مابدولت" ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۷۷، ۱۷۸

تاش کی عادت میں اتنے مبتلا ہوئے کہ فلاش کھیلتے کھیلتے رمی کی

۲۔ نقوش شوکت نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۲۳۔

> اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے علامہ راشد الخیری ہوتے۔۔۔ آپ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ سانپ سے۔ سانپ سے ڈرتے تو سبھی ہیں لیکن آپ تو سانپ کے ذکر تک سے ڈرتے ہیں۔ جس رات سونے سے پہلے سانپ کا ذکر آ جائے تو پھر طے ہے کہ اس رات آپ کو نیند نہیں آ سکتی بلکہ اپنے لیٹے ہر لمحہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب آیا سانپ کہ اب، اب کمرے کے فلاں کونے سے نکل رہا ہے۔ اب میری چارپائی کے نیچے پہنچا۔ اب وہ چارپائی پر چڑھ رہا ہے۔ اب یہ میرے بستر پر اور اب۔ اب۔ اسی اب میں رات کو صبح کر دیں گے۔۔۔ اگر رات کو کہیں کھٹکا ہو، تو یہ خود تھوڑی اٹھیں گے۔ الٹا بیگم سے کہیں گے۔ ''سنتی ہو ذرا اٹھ کے دیکھنا، کیا بات ہے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے اور جب بیگم اٹھ کر دیکھیں گی اور انہیں بتائیں گی کہ بلی تھی۔ تب ان کی گھگی بندھنا بند ہوگی۔''[۱]

مختصر یہ کہ شوکت تھانوی بہت سی انسانی خامیوں کے باوجود دلچسپ شخصیت اور کردار کے انسان تھے۔ انھیں اپنی خامیوں کا احساس تھا جس کا ذکر انہوں نے ''مابدولت'' میں جا بجا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خامیوں پر منافقت کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ دل کے بہت اچھے تھے ان کے دل میں انسان کا غم تھا۔ وہ سراپا محبت تھے اور دلکش شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت بڑی باہمہ اور بے ہمہ تھی اور ان کی اس سحر طراز شخصیت کی جھلک ان کی تصنیفات میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ان کی موجودگی سے زندگی چہک اٹھتی تھی جو بجائے خود ان کی سیرت کا ایک بہت بڑا شخصی امتیاز ہے۔

۱- ماہنامہ [illegible] جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۹، ۱۰۔

دوسرا باب

تصنیفی سرمایہ

شوکت تھانوی کی بحیثیت مصنف مختلف حیثیتیں ہیں ۔ وہ شاعر ، مضمون نگار ، افسانہ نگار ، ناول نگار ، ڈراما نگار ، خاکہ نگار اور صحافی ہیں لیکن ان کا بنیادی رویہ ایک مزاح نگار کا ہے ۔ مضمون ہو یا افسانہ ناول ہو یا ڈراما ، وہ ہر جگہ اپنے اس دل پسند رجحان طبع کے مطابق مزاح پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

شوکت تھانوی نے انیس سو انتالیس عیسوی میں روزنامہ ''ہمدم'' کی ملازمت اختیار کی ۔ جہاں انھوں نے فکاہیہ کالم ''دو دو باتیں'' لکھنا شروع کیا اور پھر فکاہیہ کالموں کا یہ سلسلہ دوسرے اخبارات و رسائل تک پھیلتا چلا گیا ۔ یہی فکاہیہ کالم شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی بنیاد ہے ۔ انھوں نے ہزاروں کالم لکھے لیکن یہ کتابی شکل میں ابھی مرتب نہیں ہوئے ۔ اخبارات اور رسائل کی فائلیں دیکھ کر ہم نے اہم کالم حاصل کیے اور ان کا تجزیہ صحافت کے باب میں پیش کیا ہے ۔

اس باب میں ہم شوکت تھانوی کے اس تصنیفی سرمائے کا جائزہ لے رہے ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے یا شائع ہونے کی امید ہے ۔ تاکہ اگلے ابواب میں اس تصنیفی سرمائے کی بنیاد پر شاعر ، مضمون نگار ، افسانہ نگار ، ناول نگار ، ڈراما نگار ، خاکہ نگار ، خود نوشت سوانح نگار اور صحافی کی حیثیتوں میں ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور شوکت تھانوی کی ادبی حیثیت کا تعین کیا جا سکے ۔

مضامین اور افسانوں کے مجموعے

موج تبسم

شوکت تھانوی کا پہلا مجموعۂ مضامین انیس سو بتیس عیسوی میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا مقدمہ نسیم انہونوی نے لکھا ۔ اس کا

دوسرا ایڈیشن انیس سو تینتیس عیسوی میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے تین نئے مضامین کے ساتھ شائع کیا اور نسیم انہونوی نے اپنے مقدمہ پر نظر ثانی کی جس پر یکم ستمبر انیس سو تینتیس عیسوی کی تاریخ درج ہے۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ یہ ہیں: (۱) قند مکرر، (۲) سودیشی ریل، (۳) میٹھے چاول، (۴) مشاعرہ اور جوتا، (۵) مہمان، (۶) سودیشی بے بدیشی، (۷) دوست، (۸) خدا مر دے تو سودا دے، (۹) شاعر اور شاعری، (۱۰) مروت، (۱۱) مطب، (۱۲) سودیشی ڈاک، (۱۳) فیشن، (۱۴) وی۔ پی، (۱۵) خود کشی، (۱۶) آسیبی خلل۔

بحر تبسم

یہ شوکت تھانوی کا دوسرا مجموعۂ مضامین ہے جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ مقدمہ مولانا نیاز فتحپوری نے تحریر کیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن صدیق بک ڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ نے باہتمام عابد علی خاں پرانٹر شاہی پریس، نعمت اللہ روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔ تاریخ اشاعت اس پر درج نہیں ہے۔ پاکستان میں اسے اردو اکیڈمی سندھ نے انیس سو اٹھہتر عیسوی میں شائع کیا۔ اس کتاب کے مضامین یہ ہیں: (۱) میز، (۲) چاء، (۳) ماسٹر صاحب، (۴) جس کے لیے کیا سفر، (۵) اڈیٹر، (۶) السلام علیکم، (۷) بس جھالسی تک، (۸) مشرق اور مغربی کتا، (۹) واحد حاضر جمع غائب، (۱۰) شاہکار (۱۱) سودیشی ریل کے بعد، (۱۲) نسیم انہونوی، (۱۳) معاف کیجیے گا، (۱۴) بیکاری، (۱۵) اتوار، (۱۶) یکہ، (۱۷) سودیشی عدالت، (۱۸) گومتی سے جمنا میں، (۱۹) مٹھو بیٹے، (۲۰) سائیکل کی تعلیم، (۲۱) بڑے اچھے آدمی تھے، (۲۲) منشی۔

سیلاب تبسم

شوکت تھانوی کا یہ تیسرا مجموعۂ مضامین ہے جسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقدمہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے تحریر کیا ہے۔ ''من آنم کہ من دانم'' میں شوکت تھانوی نے اپنے دستخطوں کے ساتھ بیس دسمبر انیس سو تینتیس عیسوی کی تاریخ لکھی ہے جس سے سن اشاعت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین یہ ہیں: (۱) تعزیت، (۲) چالیسواں، (۳) ہم زلف، (۴) آرام کرسی، (۵) کھاکورا، ر، (۶) بیوی کا پروپیگنڈہ، (۷) تدر کا

منی آرڈر ، (۸) امرود کا چور ، (۹) بوا جعفری خانم ، (۱۰) پکچر پیلس ، (۱۱) برقعہ ، (۱۲) جی ہاں پڑے ہیں ، (۱۳) علاج بالغذاء ، (۱۴) پان ، (۱۵) عشق کی گولیاں ، (۱۶) بہن کی ہمسائی ، (۱۷) بسم اللہ اللہ اکبر ، (۱۸) سگریٹ ، (۱۹) قطع کلام ، (۲۰) شامت ۔

طوفان تبسم

یہ چوتھا مجموعۂ مضامین ہے جسے شوکت تھانوی نے ''سیلاب تبسم'' کے فوراً بعد شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے مولوی محمد عثمان احمدی کی مالی اعانت سے شائع کیا ۔ مقدمہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ۔ دوسرا ایڈیشن مینجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے باہتمام سید توسل حسین یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا ۔ ''سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے'' کے تحت شوکت تھانوی نے چھبیس جنوری انیس سو بیالیس عیسوی کی تاریخ لکھی ہے جس سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی تاریخ اشاعت کا تعین ہوتا ہے ۔ اس کتاب کے مضامین یہ ہیں : (۱) ٹائیگر ، (۲) سناؤں تمھیں بات اک رات کی ، (۳) اشتہاری شادی ، (۴) ایک سنجیدہ بات ، (۵) برادر عزیز مرحوم ، (۶) چوری ، (۷) افیونی ، (۸) لاٹری کا ٹکٹ ، (۹) ہوم ممبر ، (۱۰) مغلوب الغضب ، (۱۱) الہ آباد کے امرود ، (۱۲) ہمسی ، (۱۳) سالیاں ، (۱۴) درگاہ شریف ، (۱۵) برت ، (۱۶) اصلاح سخن ، (۱۷) کنجوس کا کنبہ ، (۱۸) نہ ہوا میں بیوی ۔

دنیائے تبسم

یہ شوکت تھانوی کا پانچواں مجموعۂ مضامین ہے جس میں سترہ مضامین اور آٹھ افسانے شامل ہیں اور دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے ۔ یہ پہلی مرتبہ دسمبر انیس سو پینتیس عیسوی میں شائع ہوئی ۔ اس کا مقدمہ '' کچھ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم پر'' کے عنوان سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تحریر کیا ہے ۔ ''دنیا کی بات'' میں شوکت تھانوی نے لکھا ہے ''میرے مضامین کا یہ پانچواں مجموعہ آخر کیوں شائع ہو رہا ہے ؟ قسم لے لیجیے جو اس سوال کا جواب خود مجھ کو معلوم ہو ۔ البتہ اس سلسلہ میں آپ برادرم خواجہ اظہر عباس صاحب بی ۔ اے نبیرہ خواجہ الطاف حسین حالی علیہ الرحمۃ سے براہ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں جو اس مجموعہ کی اشاعت کے سولہ آنے محرک اور سولہ آنے سے بھی زیادہ ذمہ دار ہیں'' ۔

اس کتاب کو خواجہ اظہر عباس مینیجنگ ڈائریکٹر حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی نے شائع کیا۔ جس کی فہرست مضامین یہ ہے: (۱) مقروض، (۲) مینار میں گنبد، (۳) لکھنؤ کانگریس سیشن، (۴) اختلاج، (۵) تکیہ کا غلاف، (۶) ایک شعر، (۷) ڈبلو۔ ٹی، (۸) کرفیو آرڈر، (۹) مرحومہ، (۱۰) قلم فوجدار، (۱۱) موازنہ لکھنؤ و لاہور، (۱۲) احمق اداکار، (۱۳) شوہر یا ایڈیٹر، (۱۴) شہتوت، (۱۵) مکھیاں، (۱۶) پروفیسر، (۱۷) ڈاکٹر، (۱۸) بر دکھوا، (۱۹) میں ایک بے روزگار ہوں (۲۰) سرود خانۂ ہمسایہ، (۲۱) بحر العلوم۔

پاکستان میں اس کتاب کو اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے دسمبر انیس سو اٹھہتر عیسوی میں باب الاسلام پرنٹنگ پریس، کراچی میں چھپوا کر شائع کیا ہے جو دو سو تین صفحات پر مشتمل ہے۔

گرگٹ

شوکت تھانوی کے سات مضامین کا مجموعہ ہے جسے نسیم انہونوی نے سید توسل حسین یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمیں اس کا پہلا ایڈیشن خورشید شوکت کی لائبریری سے ملا ہے لیکن اس مجموعۂ مضامین پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: (۱) گرگٹ خالص، (۲) مسٹر، (۳) فلم اسٹار، (۴) ریشائیل، (۵) لیڈر، (۶) ملک التجار، (۷) سجادہ نشین۔

مجھے خرید لو

ہندوستانی پبلشرز دلی نے انیس سو بیالیس عیسوی میں افسانوں کے مجموعے کی حیثیت سے چھاپا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جون انیس سو چھیاسٹھ عیسوی میں نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔ پاکستان میں کتاب محل کراچی نے مشہور آرٹ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔ ستمبر انیس سو پچپن عیسوی تک اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ یہ کتاب دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں دس افسانے شامل کیے گئے ہیں: (۱) بر دکھوا، (۲) کایا پلٹ، (۳) اتوار، (۴) کون جیتا، (۵) مسٹر صاحب کی عید، (۶) مقروض، (۷) پہلی چوری، (۸) رات گئے، (۹) سمجھوتہ، (۱۰)

الٹ پھیر۔

لاہوریات

مارچ انیس سو پینتالیس عیسوی میں اردو بک سٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور نے شائع کیا۔ یہ ایڈیشن خورشید شوکت کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمارے پاس اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو اپریل انیس سو باون عیسوی میں استقلال پریس، لاہور سے چھپا۔ یہ مجموعہ دو سو تیئیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انیس مضامین شامل ہیں: (۱) لاہوریات، (۲) حق لاہوری نمک، (۳) پراندم، (۴) پٹرول، (۵) رضائی، (٦) عمدۃ الحکماء، (۷) پڑوسی عذاب، (۸) لکھنؤ، (۹) برنیوں کی اچھائیاں، (۱۰) بیوی کے رشتہ دار، (۱۱) اگر میں بیوی ہوتا، (۱۲) مسافروں کے جھگڑے، (۱۳) خواہ مخواہ کی لڑائی، (۱۴) تکلمات لکھنؤ، (۱۵) ادیبوں کی لڑائی، (۱٦) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، شاعری، (۱۷) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، صنف نصر، (۱۸) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، اس کا لب پر آنا، (۱۹) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پر آ جائے تو پھر؟

وغیرہ وغیرہ

انیس سو سنتالیس عیسوی میں ادارہ فروغ اردو لاہور نے پی۔ آر۔ پی۔ ایس پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن انیس سو ترسٹھ عیسوی میں سویرا آرٹ پریس لاہور میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ جو ایک سو اٹھانوے صفحات پر مشتمل ہے اس میں تین افسانے اور دس مضامین شامل ہیں: (۱) جلوس، (۲) ممنوا میں بھی کوئی گل ہوں، (۳) دو منٹ، (۴) ضرب تقسیم، (۵) سائن بورڈ، (٦) فلمیریا، (۷) تندرستی ہزار نعمت ہے، (۵) جھوٹ کا سچ، (۹) قوم، (۱۰) آزادی، (۱۱) اقبالیات، (۱۲) ہنسیے کیوں کر؟، (۱۳) لحاف اندر لحاف۔ اس مجموعے کو بھارت میں ادارۂ ضیائے ادب، مراد آباد نے شائع کیا ہے جس کے ایک سو اٹھاون صفحات ہیں۔

برے بھلے

اولیٰ مرتبہ اپریل انیس سو چھیالیس عیسوی میں ادارہ فروغ اردو،

اندرون لاہوری دروازہ، لاہور نے تعلیمی پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس میں سات افسانے اور دس مضامین شامل کیے گئے، ان کی ترتیب یہ ہے: (۱) سودیشی ریل، (۲) جس کے لیے کیا سفر، (۳) صدر مشاعرہ، (۴) تعزیت، (۵) سناؤں تمہیں بات اک رات کی، (۶) شاہین بچے، (۷) لکھنؤ کانگریس سیشن، (۸) خدا سر دے تو سودا دے، (۹) بے کاری، (۱۰) لحاف اندر لحاف، (۱۱) جی ہاں پٹے ہیں، (۱۲) ٹائیگر، (۱۳) عمدۃ الحکماء، (۱۴) اختلاج، (۱۵) ہرالملم، (۱۶) قاضی جی، (۱۷) منشی جی۔

مضامین شوکت

یہ مجموعۂ مضامین ادارہ فروغ اردو، لاہور نے ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اس میں سات افسانے اور تیرہ مضامین شامل ہیں۔ اس کی فہرست یہ ہے: (۱) اے دلربا تیرے لیے، (۲) شاہین بچے، (۳) آزادی کا شوق، (۴) لیاقت نہرو معاہدہ، (۵) مشاعر، (۶) بخیال خویش خبطے، (۷) جنس ہنر بیچتا ہوں، (۸) کافی، (۹) میں ایک شاعر ہوں، (۱۰) ان کی سسرال، (۱۱) اے روسیاہ تجھ سے تو، (۱۲) جگر کے مریض، (۱۳) سو کا نوٹ، (۱۴) سسرالی رشتہ دار، (۱۵) میں میرا جی کو نہیں جانتا، (۱۶) اپنے مضامین اپنی نظر میں، (۱۷) ہم زلف کا بکرا، (۱۸) خان بہادر صاحب، (۱۹) بوہمی میں السیٹ، (۲۰) کرکٹ میچ۔

مونڈی کاٹے

مونڈی کاٹے کے مضامین شوکت تھانوی نے رسالہ حریم کے لیے انیس سو چونتیس عیسوی میں تحریر کیے تھے۔ نسیم انہونوی نے "تعارف" میں لکھا ہے کہ "مونڈی کاٹے" دراصل مجموعہ ہے شوکت صاحب کے ان مضامین کا جو انھوں نے آج سے سترہ سال قبل اس وقت لکھے تھے جب رسالہ حریم کا اجراء ہوا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مضامین کی یہ کتاب انیس سو اکیاون میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ناشر نسیم انہونوی نے یوسفی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کی۔ یہ کتاب ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بارہ مضامین شامل ہیں جن کی فہرست یہ ہے: (۱) نگوڑے، مونڈی کاٹے، (۲) اوئی نوج، (۳) نگو۔ زہر مار کرو، (۴) دور۔ دوماں، (۵) چولہے میں جاؤ۔ بھاڑ میں جاؤ، (۶) چل۔ ہٹ،

(۷) موئے۔ مردے، (۸) اے ہے۔ ہے ہے، (۹) اوں۔ واہ، (۱۰) توبہ۔ اللہ، (۱۱) آگ لگے، جھاڑو پھرے، (۱۲) بھئی اللہ، اوئی اللہ، ہائے اللہ۔

برق تبسم

یہ کتاب اکتوبر ۱۹۵۱ء میں نسیم انہونوی نے سرفراز پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کی۔ اس میں پانچ افسانے اور سولہ مضامین شامل ہیں، جن کی فہرست یہ ہے: (۱) انہونی کی جنت، (۲) اگر میں لڑکی ہوتا، (۳) تکلفات، (۴) اگر میں بادشاہ ہوتا، (۵) وکیل، (۶) بے روزگار، (۷) میر صاحب کا دہلی کا سفر، (۸) پنشن، (۹) اگر میں لیڈر ہوتا، (۱۰) مناظرہ انجمن بہار ادب لکھنؤ ۱۹۳۸ء، (۱۱) غالبیات، (۱۲) شوہر کی جنت، (۱۳) شوہر یا ایڈیٹر، (۱۴) حادثات، (۱۵) ابو، (۱۶) اگر میں شاعر ہوتا، (۱۷) دران کا اسپتال، (۱۸) میں جاتا ہوں، (۱۹) دوہنی میں لسیٹ، (۲۰) اگر میں تھانیدار ہوتا، (۲۱) سسرال۔ یہ کتاب ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

مسکراہٹیں

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نسیم انہونوی مالک نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن بیگم زہرہ شوکت اور خورشید شوکت کی لائبریریوں میں محفوظ ہے۔ اس پر سن اشاعت درج نہیں۔ یہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ افسانے اور چودہ مضامین شامل ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے: (۱) خضاب، (۲) پھر وہی عید، (۳) بلی، (۴) الیکشن کی دلچسپیاں، (۵) کھجلی، (۶) طوطی خانے میں نقارہ، (۷) ڈولی، (۸) آئینہ کے سامنے، (۹) نادر شاہ، (۱۰) لاڈلا بیٹا، (۱۱) تو روپیہ تیرہ آنے، (۱۲) مرد بیوی، (۱۳) خدا کا روزنامچہ، (۱۴) کیرم بورڈ، (۱۵) قیامت، (۱۶) جھوٹ سچ، (۱۷) فلم اسٹار دلہن، (۱۸) وکیل، (۱۹) بٹیر باز۔ پاکستان میں اس کتاب کو لارک پبلشرز، کراچی نے اکتوبر ۱۹۶۱ء میں شائع کیا جس میں یہ تمام مضامین موجود ہیں۔ یہ ایڈیشن ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

کائنات تبسم

افسانے کے مجموعے کے طور پر علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ، بمبئی

نے اتحاد پریس سے چھپوا کر جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس میں بیشتر افسانے اور مضامین ایسے شامل کیے گئے ہیں جو پہلے سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ فہرست یہ ہے: (۱) بیگم کی جنت، (۲) افیونی کی جنت، (۳) اگر میں لڑکی ہوتا، (۴) اگر میں گھوڑا ہوتا، (۵) اگر میں بادشاہ ہوتا، (۶) بانو، (۷) اس کی تصویر، (۸) پرائیویٹ سیکرٹری، (۹) فلم اسٹار، (۱۰) سونا، (۱۱) شعر نہ لکھا کرو، (۱۲) داماد فرنگ، (۱۳) وکیل آج کیا ہے، (۱۴) وکیل کل کیا ہوگا، (۱۵) آخری روزہ، (۱۶) میں مدقوق تھا، (۱۷) مشاعرہ انجمن بہار ادب لکھنؤ ۱۹۳۸ء، (۱۸) بٹیر باز، (۱۹) منگیتر، (۲۰) بال کی کھال۔

یہ کتاب زہرہ شوکت کی لائبریری میں محفوظ ہے اس کے ۱۷۲ صفحات ہیں۔

جی ہاں پٹے ہیں

افسانوں کا یہ مجموعہ سلیمان برادرز، سول ایجنٹ، مکتبہ اردو ادب، لیاقت بازار حیدر آباد نے جاوید پریس کراچی سے چھپوا کر پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ فہرست مشمولات یہ ہے: (۱) شوہر نامدار، (۲) رخصت علالت، (۳) سانپ مار خاں، (۴) چھلانگ، (۵) شادی کا اشتہار، (۶) نواب منحوس، (۷) کالا پردہ، (۸) کیا میں شاعر ہوں، (۹) جی ہاں پٹے ہیں، (۱۰) آسیب، (۱۱) ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ (۱۲) بیری اور ڈھیلے، (۱۳) دو رخ، (۱۴) حضور، (۱۵) آئینہ، (۱۶) چور دروازہ، (۱۷) زنانہ مشاعرہ اور مردانہ خطبہ، (۱۸) پہیلی، (۱۹) کرکٹ۔

نمک مرچ

ادارۂ فروغ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ محمد طفیل مالک ادارہ کو یاد نہیں اور ادارہ فروغ اردو کا ریکارڈ اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ بھارت میں یہ کتاب حالی بک ڈپو لکھنؤ نے چھاپی ہے جس کے ۱۹۰ صفحات ہیں۔ ادارہ فروغ اردو سے شائع ہونے والی کتاب ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے انھی افسانوں کا مجموعہ کہہ کر شائع کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں دس افسانے اور دس مضامین ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ راقم نے محمد طفیل صاحب سے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس زمانے میں افسانوں کا بہت چلن تھا اس لیے

افسانوں کی کتابیں آسانی سے بک جاتی تھیں۔ اس کتاب کے موضوعات یہ ہیں: (۱) دولت خانہ، (۲) تعبیر طلب، (۳) بیگم نعیم کے میاں، (۴) نمک مرچ، (۵) بیوی سلام کہتی ہیں، (۶) غربا کشتن روز اول، (۷) "س"، (۸) مسور کی دال، (۹) کرکٹ سے شاعری تک، (۱۰) پڑوسی، (۱۱) ذرا ترنم سے، (۱۲) بلائے جاں، (۱۳) ناصح مشفق، (۱۴) سالگرہ، (۱۵) خانہ بدوش، (۱۶) آخری ارمان، (۱۷) افسانۂ ما، (۱۸) ایڈیٹر صاحب کے نام، (۱۹) بیسویں صدی، (۲۰) سفارش۔

شوکتیات

ایم ظہیرالدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے: (۱) صدر مشاعرہ، (۲) عالی جاہ، (۳) افسانہ نگار، (۴) ماسٹر چھوٹے لال عاصم، (۵) مادری اور سوتیلی زبانیں، (۶) کالا برقعہ، (۷) ایک مکان کی ضرورت ہے، (۸) دولہا بھائی، (۹) یہ اقبالیے، (۱۰) کبھی کا دن بڑا کبھی کی رات، (۱۱) بیری اور ڈھیلے، (۱۲) ایک ملازم کی ضرورت ہے، (۱۳) فیصلہ کن قدم، (۱۴) روزہ چور، (۱۵) وکیل اور زیب داستان، (۱۶) جس محلہ میں ہے ہمارا گھر، (۱۷) بنا سیٹھی شیر، (۱۸) پھلجھڑیاں، (۱۹) اقربا ہو گئے میرے آگاہ، (۲۰) حل ککڑی خالہ، (۲۱) ہندوستان میں اردو، (۲۲) ۱۹۵۷ء کا ایک مشاعرہ، (۲۳) ارے (ایک تمثیل)، (۲۴) یادداشت (ایک خاکہ)۔ یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

سودیشی ریل اور دوسرے افسانے

ادارۂ فروغ اردو لاہور نے اس کتاب کو ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔ حقیقت میں یہ کتاب "ارے بھلے" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ادارہ فروغ اردو کے مالک نے دوسرا ایڈیشن چھاپتے وقت اس کا نام بھی بدل دیا۔ یہ کتاب ۲۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں وہی سترہ مضامین شامل ہیں جو "ارے بھلے" کی فہرست میں دیے گئے ہیں۔

خبطی

یہ مجموعۂ مضامین لارک پبلشرز کراچی نے شائع کیا ہے۔ سن اشاعت

اس پر درج نہیں ہے۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بیشتر مضامین برق تبسم اور دوسرے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوئی نیا مضمون اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے مضامین کی فہرست یہ ہے: (۱) انہونی کی جنت، (۲) اگر میں لڑکی ہوتا، (۳) تکلفات، (۴) اگر میں بادشاہ ہوتا، (۵) وکیل، (۶) بے روزگار، (۷) میر صاحب کا ریل کا سفر، (۸) پنشن، (۹) اگر میں لیڈر ہوتا، (۱۰) زبانہ حد ادب، (۱۱) غالبیات، (۱۲) شوہر کی جنت، (۱۳) شوہر یا ایڈیٹر، (۱۴) حادثات، (۱۵، بابو، (۱۶) برائی کا اسپتال، (۱۷) بوہنی میں السیٹ، (۱۸) اگر میں تھانیدار ہوتا، (۱۹) میں جانتا ہوں، (۲۰) سسرال، (۲۱) دیمک، (۲۲) اک نجومی۔

الٹ پھیر

اقبال بک ڈپو سمرسٹ اسٹریٹ، صدر کراچی نے ۱۹۷۶ء میں اس کتاب کو شائع کیا ہے اس میں وہی دس مضامین شامل کر دیے گئے ہیں جو ”مجھے خرید لو“ میں چھپ چکے ہیں۔ فہرست یہ ہے: (۱) بر دکھوا، (۲) کایا پلٹ، (۳) اتوار، (۴) کون جیتا، (۵) میر صاحب کی عید، (۶) مقروض، (۷) پہلی جنوری، (۸) رات گئے، (۹) سمجھوتہ، (۱۰) الٹ پھیر۔

ہم زلف

اس کتاب کو لارک پبلشرز، اورنگ زیب مارکیٹ، بندر روڈ کراچی نے جاوید پریس، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا ہے اس میں وہی بیس مضامین شامل ہیں جو ”سیلاب تبسم“ میں شائع ہو چکے ہیں۔

خواہ مخواہ

یہ مجموعۂ مضامین لارک پبلشرز نے جاوید پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ اس میں وہی اٹھارہ مضامین ہیں جو شوکت تھانوی کے چوتھے مجموعۂ مضامین ”طوفان تبسم“ میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعۂ مضامین ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

راجہ صاحب

مری لائبریری، لاہور نے پہلی بار ۱۹۶۰ء میں استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں چھپا۔ یہ مضامین

شوکت تھانوی نے مسٹر آر۔ سہگل کے ہفتہ وار ہندی اخبار ''کرم یوگ'' کے لیے ۱۹۴۵ء میں لکھے۔ ان مضامین کو وہ اردو میں لکھتے تھے لیکن ان کو ہندی رسم الخط میں ہندی اخبار میں چھاپا جاتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں ان مضامین کو ''راجہ صاحب'' کے عنوان سے ہندی میں کتابی شکل میں چھاپا گیا۔ شوکت تھانوی کی وفات کے بعد بیگم سعیدہ شوکت نے رضوانہ مجیب سے ان ہندی مضامین کا ترجمہ کروا کر اردو میں شائع کروایا۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چودہ مضامین شامل ہیں؛ جن کی تفصیل یہ ہے، (۱) راجہ صاحب کی حضوری، (۲) راجہ صاحب کا شکار، (۳) راجہ صاحب کی تلوار، (۴) راجہ صاحب کا عشق، (۵) راجہ صاحب کا سفر، (۶) راجہ صاحب کا سگ، (۷) راجہ صاحب کی سالگرہ، (۸) راجہ صاحب کی لیڈری، (۹) راجہ صاحب کی لڑکی کی شادی، (۱۰) راجہ صاحب کے مینجر، (۱۱) راجہ صاحب کی بیماری، (۱۲) راجہ صاحب کا خطاب، (۱۳) راجہ صاحب کا اندھار کھاتہ، (۱۴) راجہ صاحب کا دیوالہ۔

ہنس مکھ اور چٹخارے

ان دو کتابوں کا اشتہار افسانوں کے مجموعے کی حیثیت سے نقوش لاہور شوکت نمبر ۶۲۲ پر دیا گیا ہے لیکن یہ کتابیں دسمبر ۱۹۸۰ء تک شائع نہیں ہو سکیں۔ محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو نے بتایا کہ ان کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں جو عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

ناول

بڑبھس :

یہ شوکت تھانوی کے پہلے ناول کا نام ہے جس کے معنی ہیں بوالہوسی یا بڑھاپے کی بے عقلی۔ یہ ناول ۱۹۳۳ء میں ''سرپنچ'' لکھنؤ میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۳۴ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ احمد جمال پاشا لکھتے ہیں:

> ''شوکت تھانوی کی ناول ''بڑبھس'' جب سرپنچ میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی تو اس کی قسطوں کا پڑھنے والوں کو بے قراری کے ساتھ انتظار رہتا تھا''[1]۔

۱۔ نقوش، لاہور، شوکت نمبر، ص ۵۹۳۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن، صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۶۱ء میں احمد برادرس کراچی نے سپر آرٹ انگریورز ہاؤس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو ۱۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بوالہوس بڑے میاں کو ایک کم سن دوشیزہ سے نادیدہ محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے شادی رچانے پر مصر ہیں، لیکن ان کی بجائے ان کے بیٹے سے اس دوشیزہ کی شادی ہو جاتی ہے۔

دل پھینک:

۱۹۳۵ء میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے پہلی بار شائع ہوا۔ اس میں ایک نواب صاحب کی عادتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ ہر حسینہ پر ہر وقت قربان ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں اور جس دوشیزہ کو دیکھتے ہیں اس کی محبت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ گویا "دل پھینک" واقع ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے ایک گروہ نے ان کو ایک تقریب میں گھیر کر ان سے توبہ کروائی۔ ۱۹۳۷ء میں صدیق بک ڈپو، امین آباد پارک، لکھنؤ نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ ۱۹۴۲ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

سوتیاہ چاہ:

۱۹۳۵ء میں ماہنامہ "حریم" لاٹوش روڈ، لکھنؤ میں قسط وار چھپا جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ۱۹۳۶ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کا مقدمہ شوکت دلہن کے نام سے شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے لکھا۔ مقدمہ میں وہ لکھتی ہیں:

> "زیر نظر مسلسل افسانہ "سوتیاہ چاہ" بھی شوکت صاحب سے میں نے سنا نہیں بلکہ "حریم" کے صفحات پر قسط وار میں نے دیکھا ہے اور اس افسانہ کے متعلق میرا ہمیشہ سے یہ دل چاہتا رہا کہ میں تفصیل کے ساتھ اس کے متعلق اظہار خیال کروں۔ چنانچہ جب یہ کتابی صورت میں شائع ہونے لگا اور نسیم صاحب نے مجھ سے مقدمہ کے لیے کہلوایا تو مجھ کو گویا منہ مانگی مراد ملی"۔

اس ناول کی بنیاد اس واقعہ پر ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کے اس اصرار پر کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر لے، بظاہر نہایت درشتی کے ساتھ انکار کرتا ہے اور اس کی لاعلمی میں خود اسی کی ایک سہیلی سے عقد

ثانی کے انتظامات کرتا ہے اور دوسری شادی ہو جاتی ہے ان دونوں سوتوں کے درمیان نہایت محبت کے تعلقات قائم رہتے ہیں اور وہ دونوں شوہر کو وقتاً فوقتاً بے وقوف بناتی رہتی ہیں۔

سودیشی ریل:

شوکت تھانوی نے ''نیرنگ خیال'' کے سالنامہ میں چھپنے والے افسانہ کو جون ۱۹۳۶ء میں شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے ناول کی شکل میں چھاپا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسری طرف افسانہ ''سودیشی ریل'' کا انگریزی ترجمہ چھاپا گیا ہے۔ جناب رفیع احمد خاں ایم۔ اے علیگ نے یہ ترجمہ کیا ہے جو چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔

خانم خاں:

۱۹۳۷ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے تنویر پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا۔ جس میں پس چلمن حسینہ کا رومان بیان کیا گیا ہے جس نے بہت سے لوگوں کو مدتوں بے وقوف بنائے رکھا۔ آخر میں پتہ چلا کہ اس گھر میں کوئی خاتون نہیں رہتی بلکہ ایک شخص ان عاشقوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ فروری ۱۹۵۸ء میں سلطان حسین اینڈ سنز، بندر روڈ، کراچی نے ادبی پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

معمہ خاتون:

۱۹۳۸ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے تنویر پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس ناول میں ایک ایسے شوہر کو موضوع بنایا گیا ہے جو اپنی بیوی کی قابلیت کا ڈنکا بجانے کے لیے خود اس کے نام سے مضامین، افسانے اور شاعری ملک کے معروف رسائل میں شائع کرواتا ہے۔ بیگم صاحبہ کو رسائل میں چھپنے والی چیزوں کا علم نہیں ہوتا اور اس طرح یہ پول کھل جاتا ہے۔ اس ناول کا چوتھا ایڈیشن نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔

ڈھولک:

۱۹۰۰ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد سنی

۱۹۴۷ء میں اس ناول کو ڈیل پرنٹنگ پریس دلی نے باہتمام منشی گل شیرخان چھاپ کر ہندوستانی پبلشرز نے شعبۂ اردو نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ (بمبئی) کے لیے شائع کیا۔ یہ ناول ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کی ہیروئین ''ناہید'' کو شعر و شاعری سے دلچسپی اور بذلہ سنجی میں کمال حاصل ہے۔ وہ اپنی محبت کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ جس کی وجہ سے اس ناول کے ہیرو نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایک ڈھونگ رچانے کی کوشش کی اور ناہید کو چاروں شانے چت کر دیا۔

بکواس :

۱۹۴۳ء میں ایم ظہیرالدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بک سٹال لاہور سے شائع کیا۔ اس ناول کے ۲۵۵ صفحات ہیں۔ اس ناول میں ''نعمد'' مذہبی اور ''جمال'' ولایت پاس اور مذہب سے بیگانہ ہے۔ پورے ناول میں ''اسلام'' اور ''سوشلزم'' کی بحث ہے۔ آخر میں ''جمال'' کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور اس طرح جیت اسلام کی ہوتی ہے۔ یہ ناول شوکت تھانوی کے نظریۂ حیات کو ظاہر کرتا ہے۔ قارئین نے اس کتاب کو اتنا پسند کیا کہ جولائی ۱۹۵۴ء تک اس کتاب کے نو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ بھارت میں اس ناول کو سلطان بک ڈپو دہلی نے شائع کیا جس کے ۱۸۴ صفحات ہیں۔

بیوی :

۱۹۴۵ء میں ادارۂ فروغ اردو لاہور نے نیشنل لٹریچر کمپنی لاہور کے تعاون سے شائع کیا۔ اس کی پرنٹ لائن پر یہ الفاظ درج ہیں ''لالہ گوپال داس مالک نیشنل لٹریچر کمپنی لاہور نے تحاد پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا'' یہ کتاب شوکت تھانوی نے محمد طفیل، مالک ادارۂ فروغ اردو لاہور کو ایک رات میں لکھوئی تھی۔ کتب خانہ علم و ادب کراچی نے اس ناول کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں شائع کیا اور ۱۹۵۱ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن نکلا۔ اس ناول میں مشرقی بیوی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ شوہر دفتر سے سیدھے گھر واپس آ جایا کریں۔ دوستوں کی محفل اور کلب کی سرگرمیوں کو وہ پسند نہیں کرتیں۔ بعض شوہر جب ان کی بات تسلیم نہیں کرتے اور وہ پانی کو سر سے اونچا ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں تو مجبوراً شوہر کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

کتیا :

یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو محمد طفیل، مالک ادارۂ فروغ اردو لاہور نے بی۔ آر۔ ای۔ ایس پریس لاہور سے چھپوا کر پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اس ناول میں کیپٹن اعجاز کو ناکام و نامراد عاشق کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شہباز نے محض چھیڑ کے طور پر اس سے محبت کرنا شروع کی اور بعد میں پروگرام کے مطابق راہ فرار اختیار کر لی تو کپتان صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہ ناول ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اکرام اکبر کاتب نے ۱۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو اس کی کتابت مکمل کی۔ اسے کتب خانہ علم و ادب کراچی نمبر ۱ نے اور بھارت سے خدا بخش ڈپو، لکھنؤ نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔

انشاء اللہ

یہ ناول ۳ مئی ۱۹۴۶ء کو ادارہ فروغ اردو لاہور نے نیشنل لٹریچر کمپنی کے تعاون سے شائع کیا۔ اس کی پرنٹ لائن اس طرح ہے "گوپال داس ملک نیشنل لٹریچر کمپنی نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔" یہ ناول ۲۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے ایک معاشرتی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اولاد کی شادی کے موقع پر میاں بیوی میں اکثر لڑائی ہوتی ہے۔ میاں اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دیتا ہے جبکہ بیوی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بیٹے کی شادی اس کے رشتہ داروں میں ہو اس ناول میں شکیل اور ببو میاں میں زمیں آسماں کا فرق تھا لیکن بیگم صاحبہ نے اپنا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ببو میاں کو شکیل پر ترجیح دی۔ اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا جس کے ۲۲۱ صفحات ہیں۔ بھارت میں اس کتاب کو حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔

کارٹون

شوکت تھانوی کا یہ ناول پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۴۷ء کو عنایت حسین میجر کوہ نور بک ڈپو نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ ادارہ فروغ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں ہر آدمی کو کتابیں چھاپنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ صرف رجسٹرڈ پبلشرز ہی کتابیں چھاپ سکتے تھے۔ یہ ناول حقیقت میں ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا

لیکن پرنٹ لائن پر عنایت حسین مینجر کوہ نور بک ڈپو کا نام آیا چونکہ انہیں کتابیں چھاپنے کی اجازت تھی۔ اس طرح یہ کتاب ادارہ فروغ اردو نے کوہ نور بک ڈپو کے اشتراک سے شائع کی۔ یہ ناول ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اسے مکتبہ اردو لکھنؤ نے بھی شائع کیا۔ جس کے ۲۵۶ صفحات ہیں۔

جوڑ توڑ

یہ ناول جون ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ محمد طفیل، پبلشر ادارہ فروغ اردو لاہور نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ یہ ناول ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا ہیرو محبوب اپنی چالاکیوں کے باعث شریف اور عزت دار لوگوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں پکڑ کر ان کو بلیک میل کرکے ہزاروں روپے کماتا ہے۔ محبوب صاحب نے تمام دنیا کو دھوکہ دیا لیکن اپنے صاحبزادے شکیل میاں سے مات کھا گئے اور شکیل نے اپنے والد کے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ اس ناول کو کراچی میں کتب خانہ علم و ادب نے بھی شائع کیا ہے۔

غزالہ

محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کی؛ اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے لیکن سن اشاعت تحریر نہیں کیا گیا۔ محمد طفیل صاحب نے ایک انٹرویو میں اس کا سن اشاعت اگست ۱۹۴۷ء بتایا ہے۔ غزالہ لکھنؤ کے نواب ملک رفعت کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ان کے یہاں اچانک آگ لگ جاتی ہے اور غزالہ کو آگ کے شعلوں میں سے نکالنا مشکل نظر آ رہا ہے کہ پڑوس میں رہنے والا ایم۔ اے کا طالب علم ''نسیم'' غزالہ کو اس آگ سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نواب ملک رفعت اس کے اس احسان کے بدلے ''غزالہ کی شادی'' ''نسیم'' سے کر دیتے ہیں۔ یہ ناول ۲۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

سسرال

ادارہ فروغ اردو، لاہور نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں سویرا پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ یہ ناول ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب یہ ہے ''ان پاکستانیوں کے نام جن کی بیویاں اور سسرالیں ہندوستان

میں ہیں۔“ اس ناول کا موضوع اس انتساب کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ شفقت (ہیرو) لاہور کے ایک کالج میں پروفیسر ہے جبکہ اس کی بیوی بلقیس اور بیٹا فردوس دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ ایسے حالات میں معاشی مسائل اور معاشرتی مشکلات کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ مصنف نے ان مسائل کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے اور اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

چار سو بیس

اقبال بک ڈپو سمرسٹ اسٹریٹ، صدر کراچی نے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔ ۱۹۵۳ء تک اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ اس کتاب کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں ضیاء پریس کراچی سے چھپا۔ یہ ایڈیشن ہماری نظر سے گذرا ہے اس کے ۲۸۸ صفحات ہیں۔ ناول کا نام دیکھتے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی چار سو بیس شخص کے ”کارنامے“ اس میں بیان ہوں گے: لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ ”ناہید“ تیز و طرار اور ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی ہے جو ”مسعود“ سے محبت تو کرتی ہے لیکن ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ دوستوں اور سہیلیوں نے اس کے خلاف سازش تیار کی اور بالآخر ناہید کو محبت کا اقرار کرنا پڑا۔

بقراط

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے پی۔ آر۔ بی۔ ایس پریس سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے جنوری ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ یہ ناول ۲۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب یہ ہے ”ڈاکٹر سید ممتاز حسین کے نام۔ بقراط حکیم تھا یہ ڈاکٹر ہیں۔ اگر اس ڈاکٹر نے میرا علاج نہ کیا ہوتا تو میں یہ کتاب نہ لکھ سکتا“ اس ناول کے مرزا صاحب حکمت کی ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے لیکن ہر وقت حکیم بقراط بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے اپنے مخصوص انداز میں ان کے واقعات بیان کر کے انہیں ہر فن مولا بنانے کی کوشش کی ہے۔

سپنے

ایم ظہیر الدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بک سٹال لاہور سے پہلی مرتبہ اگست ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ اپریل

۱۹۵۲ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ ناول ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں میر صاحب کا کردار پیش کرکے زندگی کے مختلف زاویوں کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی بجائے خود کامیڈی نظر آنے لگتی ہے۔ مزاحیہ انداز کے ساتھ ساتھ انہوں نے سنجیدہ پاکستانی مسائل بھی پیش کیے ہیں۔ وہ تعمیری دور میں بے عملی کو پسند نہیں کرتے۔

سانچ کو آنچ

سانچ کو آنچ کے نام سے شوکت تھانوی نے پہلے ایک افسانہ لکھا جو نقوش لاہور کے شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ پھر اس افسانے کو بڑھا کر ناول بنا دیا۔ یہ ناول پہلی مرتبہ ادارہ فروغ اردو لاہور سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جو ۲۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب یوں ہے ’’اپنی بھتیجی زرینہ سلمان کے جہیز میں‘‘۔ بھارت میں یہ کتاب سردار پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ نے شائع کی۔

بیگم صاحبہ

۱۹۵۵ء میں پہلی بار شمع بک ڈپو، شاہ عالم گیٹ، لاہور سے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپ کر شائع کیا اس کا دوسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۶۳ء میں شائع کیا گیا۔ یہ ناول ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا موضوع یہ ہے کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا تو بیگم صاحبہ تنہا رہ گئیں۔ دولت کی وجہ سے بہت لوگوں نے ان سے شادی کرنا چاہی لیکن بیگم صاحبہ کو معلوم تھا کہ یہ سب لوگ ان کی بجائے ان کی دولت میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ناول کا انتساب بہت دلچسپ ہے ’’اقربا پروری کے اس دور میں اپنے نام — شوکت تھانوی‘‘۔

داماد

۱۹۵۹ء میں پہلی مرتبہ شمع بک ڈپو، شاہ عالم گیٹ، لاہور سے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپ کر شائع کیا۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۶۳ء میں چھاپا گیا۔ یہ ناول ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے

کہ اہل ثروت ہر چیز کو دولت سے خریدنے کی کوشش کرتے ہیں حتی کہ اپنی بیٹی کا رشتہ بھی کسی ایسے شخص سے کرے کی کوشش کرتے ہیں جسے گھر داماد بنایا جا سکے۔ مسعود کے والد کا انتقال ہوگیا تو نواب ممتاز الدولہ نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس لیے قبول کر لی تاکہ بعد میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی نیر سے اس کی شادی کر سکیں۔

ہکلی

شوکت تھانوی کے اچھے ناولوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسے ایم۔ آر۔ خاں چودہری نے ضیا برقی پریس کراچی سے چھپوا کر لارک پبلشرز، جہانگیر روڈ، کراچی نمبر ۵ سے شائع کیا۔ اس کا انتساب یہ ہے ''اپنی بیوی زہرہ شوکت کے نام، جو ہکلی نہیں ہیں'' اس کتاب پر سن اشاعت درج نہیں کیا گیا۔ ناول میں گل رخ کے والد حکیم صاحب پرانی روایات اور اقدار پر خود بھی سختی سے عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں۔ وہ پسند کی شادی کو غیر شریفانہ فعل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی گل رخ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دیتے ہیں تو اس کا دماغی توازن خراب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے مصنف کو یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ دنیا کی ہر کشش سے زیادہ ہم خیالی کی کشش ہوتی ہے۔

نیلوفر

ہماری نظر سے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن گذرا ہے جس پر لکھا ہے ''محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی۔'' ہندوستان میں اس کتاب کی طباعت کی اجازت آزاد بک ڈپو امرتسر کو دی گئی۔ اس کتاب پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ادارہ فروغ اردو کا ریکارڈ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے۔ اس ناول کا موضوع ''غزالہ'' کے موضوع سے کافی حد تک ملتا ہے۔ اس ناول میں ڈاکٹر لطیفی کی اکلوتی بیٹی نیلوفر کو ڈاکو اٹھا کر لیے جا رہے تھے تو ''شہاب'' ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کرکے نیلوفر کو ان سے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لطیفی، شہاب کو اپنے گھر لے آئے اور نیلوفر سے شادی کر دی۔ یہ ناول ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے آزاد بک ڈپو امرتسر نے بھی شائع کیا ہے جس کے ۴٦۴ صفحات ہیں۔

مولانا :

یہ ناول ادارہ فروغ اردو، لاہور نے شائع کیا۔ اس کا سن اشاعت معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا انتساب ”مولانا عبدالمجید سالک کے نام، جنہوں نے مجھ کو کچھ نہیں سکھایا اور جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا“۔ اس ناول کا موضوع یہ ہے کہ اعلیٰ مرتبہ پر فائض لوگ مذہب سے بیگانگی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ شہاب ایک کالج میں لیکچرار ہیں، وہ جج صاحب کے یہاں گئے تو حسب عادت وہاں بھی نماز پڑھی اور اس نماز کی بدولت جج صاحب کے یہاں سب نے انہیں مولانا کہنا شروع کر دیا۔ یہ ناول ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

خدانخواستہ :

یہ ناول ادارہ فروغ اردو، لاہور نے انشا پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ سن اشاعت کتاب پر درج نہیں ہے۔ شوکت تھانوی نے ”ایک بات“ میں اس کے موضوع کے بارے میں وضاحت کی ہے ”۱۹۳۹ء میں ریڈیو کے لیے میں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا ”کایا پلٹ“۔ روح اس ڈرامہ کی یہی تھی کہ اگر عورتیں پردہ کے باہر آ جائیں اور مرد پردہ نشیں ہو جائیں تو کیا ہو؟“ اس ناول کا موضوع اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتا ہے۔ اس ناول میں موازنہ اور صورت واقعہ کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔

بھابی :

یہ شوکت تھانوی کا ان کی زندگی میں چھپنے والا آخری ناول ہے۔ جسے ادارہ اردو لاہور نے پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ یہ ناول ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ علم و ادب کراچی نے اسے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا اور ادارہ فروغ اردو لاہور نے اس ناول کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا جس کے ۲۹۰ صفحات ہیں۔ ریاض اور شہاب بچپن کے دوست ہیں۔ شہاب ریاض کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی بھائی کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان ”بھائی صاحب“ کو ”بھابیاں“ دلانے کا بہت شوق ہے۔ موصوف تین شادیاں کر چکے ہیں۔ شوکت تھانوی کا یہ ایک معاشرتی ناول ہے جس میں بار بار شادی کرنے کے اثرات مزاحیہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

بہروپیا :

یہ ناول لارک پبلشرز، اورنگ زیب مارکیٹ، بندر روڈ، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ ناول ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول شوکت تھانوی کے انتقال کے کافی عرصہ بعد شائع ہوا۔ اس ناول کی زبان اور اسلوب بیان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شوکت تھانوی کی تحریر کردہ کتاب نہیں ہے۔

پہلی بیگم :

لارک پبلشرز، کراچی کی شائع شدہ فہرست میں اس ناول کا نام بھی شامل ہے۔ کوشش کے باوجود لاہور، راولپنڈی اور کراچی کی کسی لائبریری سے یا کسی بک سیلر سے ہمیں یہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔

رعنا :

یہ شوکت تھانوی کے ایک غیر مطبوعہ ناول کا نام ہے جس کے صرف دو باب محمد طفیل، مدیر نقوش نے نقوش لاہور کے شوکت نمبر میں صفحہ ۱۳۵ تا ۱۵۰ چھاپ دیے ہیں۔ یہ ناول محمد طفیل، مالک ادارہ فروغ اردو لاہور چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

نواب صاحب :

نقوش لاہور شوکت نمبر کے آخری صفحہ پر اس ناول کا اشتہار ہے۔ محمد طفیل صاحب مدیر نقوش نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ شوکت تھانوی کا یہ نامکمل ناول ہے اس لیے شائع نہیں ہو سکا۔ ان کا ارادہ ہے کہ اسے اسی حالت میں کچھ ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد شائع کر دیں۔

مسٹر ۔ 58 :

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے کیٹلاگ میں شوکت تھانوی کی تصانیف میں اس کتاب کا نام ناول کی حیثیت سے شامل ہے۔ جسے گوشۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ لائبریری سے یہ کتاب گم ہو چکی ہے۔ بازار سے تلاش کرنے کے باوجود یہ کتاب نہیں مل سکی۔

ڈراما

منشی جی :

یہ کتاب شوکت تھانوی کے گیارہ ریڈیو ڈراموں پر مشتمل ہے۔ جسے مولوی محمد صدیق، پبلشر، نے بہ اہتمام سید توسل حسین، یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ میں چھپوا کر صدیق بک ڈپو، لکھنؤ سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ اس کا مقدمہ خواجہ حسن نظامی نے ''پیر جی نے بسم اللہ پڑھائی'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے موضوعات یہ ہیں : (۱) منشی جی نے کہانی لکھی، (۲) منشی جی نے چاہ بنائی، (۳) منشی جی نے خط لکھا، (۴) منشی جی نے دوا پی، (۵) منشی جی نے صفائی کی، (۶) منشی جی نے تصویر کھنچوائی، (۷) منشی جی سودا لائے، (۸) منشی جی نے سبق پڑھایا، (۹) منشی جی نے سفر کیا، (۱۰) منشی جی نوکر ہو گئے، (۱۱) منشی جی نے مکان بدلا۔ پاکستان میں سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی نے آرمی پریس، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

سنی سنائی :

یہ بارہ ریڈیائی تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ جسے پریم چند اگروال پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ لاہور سے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے موضوعات یہ ہیں : (۱) نہیں مگر ہاں، (۲) برلن کا اسپتال، (۳) لاٹری کا ٹکٹ، (۴) سچ، (۵) لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا، (۶) زندگی بنام زندہ دلی، (۷) خدا حافظ، (۸) جھوٹا خواب، (۹) پارٹی کے بعد، (۱۰) ملازمہ کی تلاش، (۱۱) انتیس کا چاند، (۱۲) سالگرہ۔

غالب کے ڈرامے :

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر ۱۹۵۱ء میں شائع کی۔ یہ کتاب ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب یہ ہے : ''اپنی ننھی سی بچی شوکیہ کے نام، جس کو میں غالب کے اشعار کی طرح مرغوب، مگر غور طلب سمجھتا ہوں''۔ اس کتاب میں غالب کے جن اشعار کو موضوع ڈراما بنایا گیا ہے ان کی تفصیلات ڈراما نگاری کے باب میں پیش کی جا رہی ہیں۔

قاضی جی :

جلد اول ، جلد دوم ، جلد سوم ۔

ادارہ فروغ اردو لاہور نے قاضی جی ، جلد اول، ۱۹۴۸ء میں ، جلد دوم ۱۹۴۹ء میں اور جلد سوم ۱۹۵۰ء میں شائع کی ۔ جلد اول کے ۲۵۵ ، جلد دوم کے ۲۵۶ اور جلد سوم کے ۲۵۵ صفحات ہیں ۔ ریڈیو ڈراموں کی تعداد جلد اول میں ۲۳ ، جلد دوم میں ۲۰ اور جلد سوم میں ۱۹ ہے ۔ اس طرح تریسٹھ ڈرامے ان تینوں جلدوں میں محفوظ ہیں ۔

قاجی جی : (حصہ چہارم)

غیرمطبوعہ اردو ریڈیو ڈرامے محمد طفیل، مالک ادارۂ فروغ اردو ، لاہور کے پاس محفوظ ہیں ، جنھیں وہ قاضی جی ، حصہ چہارم کی شکل میں چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

کھی کھی :

یہ گیارہ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے ، جسے شوکت تھانوی کے انتقال کے بعد ۱۹۶۴ء میں محمد طفیل ، مالک ادارہ فروغ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ، جو ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کے موضوعات یہ ہیں : (۱) پہلی تاریخ ، (۲) پارٹی کے بعد ، (۳) لین سو چھیاسٹھ ، (۴) دربار، (۵) جہاں پناہ ، (۶) آم اور جامن ، (۷) نقش و نگار، (۸) مرقع ، (۹) وہمی ، (۱۰) ڈاکٹر صاحب ، (۱۱) دو رخ ۔

شاعری

کہرستان :

شوکت تھانوی نے یہ مجموعۂ کلام شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے خود چھاپا ہے ۔ اس کا مقدمہ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے تحریر کیا ہے ۔ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ، جو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس مجموعۂ کلام میں ۹۳ غزلیں ، دو نعتیں اور دو نظمیں شامل ہیں ۔

کہرستان کے بعد :

یہ قلمی نسخہ خورشید شوکت کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ جس میں ''کہرستان'' کے بعد کی صرف ۲۲ غزلیں لکھی ہوئی ہیں جو ۱۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ۔

آپ بیتی

ما بدولت:

یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو محمد طفیل، مالک ادارہ فروغ اردو نے تعلیمی پرنٹنگ پریس، بیرون اکبری دروازہ، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا، جو ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شوکت تھانوی کے منجھلے بیٹے خورشید شوکت کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمارے پاس اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے جو نقوش پریس لاہور سے چھپا۔ یہ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ شوکت تھانوی کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے پیدائش، تعلیم، شاعری، مضمون نگاری، والد کی وفات، صحافت اور ریڈیو لکھنؤ کی ملازمت تک کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

کچھ یادیں کچھ باتیں:

محمد طفیل، مالک ادارہ فروغ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شوکت تھانوی کی وفات کے بعد ۱۹۶۳ء میں پہلی مرتبہ شائع کی۔ ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے نام سے شوکت تھانوی نے روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی میں ایک کالم شروع کیا تھا، جس میں وہ اپنی گذری ہوئی زندگی کے واقعات لکھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ شوکت تھانوی کا انتقال ہو گیا۔ اس میں بھی وہی واقعات بیان ہوئے ہیں جو ''ما بدولت'' میں بیان ہو چکے تھے۔ یہ کتاب ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعری، والد کا انتقال، صحافت اور سودیشی ریل وبال جان کے موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔

خاکے

شیش محل:

۱۹۴۳ء میں ایم۔ ظہیرالدین پرنٹر و پبلشر نے استقلال پریس، لاہور سے چھپوا کر اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور سے شائع کیا، جو ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو بارہ (۱۱۲) شخصیتوں کے مختصر خاکے پیش کیے گئے ہیں۔

قاعدہ بے قاعدہ:

یہ کتابچہ محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے فردوس پریس (شاہ عالمی) لاہور

سے چھپوا کر شائع کیا ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ہمارے پاس موجود ہے لیکن اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے ۔ یہ ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں امتیاز علی تاج ، میاں بشیر احمد ، احمد شاہ پطرس بخاری ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، میرا جی ، جوش ملیح آبادی ، عبدالرحمن چغتائی ، حفیظ ہوشیار پوری ، خدیجہ مستور ، خواجہ دل محمد ، ذوالفقار بخاری ، رشید احمد صدیقی ، زہرہ نگاہ ، سعادت حسن منٹو ، شوکت تھانوی ، صلاح الدین احمد ، ضیاء جالندھری ، محمد طفیل ، ظفر علی خان ، مولوی عبدالحق ، غلام عباس ، فراق گورکھپوری ، احمد ندیم قاسمی ، کرشن چندر ، ل ۔ احمد ، مجنوں گورکھپوری ، ن ۔ م ۔ راشد ، وقار عظیم ، ہاجرہ مسرور ، حکیم یوسف حسن ، مرزا یاس یگانہ کے خاکے ہیں ۔

متفرقات

بار خاطر :

۱۹۵۶ء میں محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی ۔ یہ شوکت تھانوی کے خطوط کا مجموعہ ہے ، جو انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبار خاطر'' کی پیروڈی کے طور پر لکھے ہیں ۔ یہ خطوط رسالہ نقوش ، لاہور میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ۔ یہ کتاب ۳۱۱ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ خطوط اڑتالیس شخصیتوں کے نام لکھے گئے ہیں ۔

گولر کا پھول :

شوکت تھانوی نے بچوں کے لیے یہ کتاب تحریر کی ہے ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، پبلشرز ، ادبی مارکیٹ ، چوک انارکلی ، لاہور نے شائع کی ۔ یہ کتاب ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں بچوں کے لیے اکیس کہانیاں ہیں ۔ ان کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں :

(۱) پہلا بول ، (۲) سوتے جاگتے ، (۳) فیشن ایبل پرستان ، (۴) پرستان کا شہزادہ سہیل ، (۵) پرستان کا جلوس ، (۶) پریوں کے جھرمٹ میں ، (۷) عجائبات ، (۸) مادام نیلی ، (۹) ملکہ کی دعوت ، (۱۰) فوجی پریڈ ، (۱۱) اعلیٰ حضرت شاہ پری زاد ، (۱۲) شیشے کی گاڑی ، (۱۳) پرستان کی فلم ، (۱۴) اڑن قالین ، (۱۵) شرموز کی سیر ، (۱۶) عجیب و غریب ضیافت ، (۱۷) بزرگ قولو ، (۱۸) تورا توری ، (۱۹) دادا جان ، (۲۰) شاہ شیام ، (۲۱) بلورستان میں جب آنکھ کھلی ۔

شیطان کی ڈائری:

نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ یہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں شیطان کے کئی روپ دکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سولہ قصوں کو ڈائری کی مناسبت سے سولہ ورق کہا گیا ہے۔ ہر ورق پر شیطان ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ شوکت تھانوی کے مخصوص مزاحیہ انداز نے ان قصوں میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔

پہاڑ تلے:

یہ روزنامہ جنگ، راولپنڈی میں چھپنے والے شوکت تھانوی کے مزاحیہ کالم کا نام ہے۔ محمد طفیل، مالک ادارہ فروغ اردو اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۶ء تک یہ کتاب شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آ سکی۔

تیسرا باب

شاعری

شوکت تھانوی نے غزل بھی کہی اور نظم بھی۔ انہوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی اور مزاحیہ شاعری بھی۔ شوکت تھانوی میں شعری ذوق پیدا کرنے کا سہرا ارشد تھانوی کے سر ہے، جو پہلے پہل شوکت تھانوی کی طرف سے نظمیں اور مضامین لکھ کر بچوں کے رسالوں ''پھول'' اور ''عزیز'' میں چھپوایا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی جب یہ نظمیں اور مضامین اپنے نام سے چھپے ہوئے دیکھتے تو بے انتہا خوش ہوتے۔ کچھ بڑے ہوئے تو شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے۔ رسالوں میں چھپنے کی وجہ سے ان کی شہرت بحیثیت شاعر ہونے لگی تو ارشد تھانوی کی غزلیں مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ مولانا ارشد تھانوی اس واقعہ کو اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جب پہلے پہل انہوں نے اخبار ''پھول'' میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا اور مجھ سے مزید فرمائشیں کیں، علاوہ ''پھول'' اخبار کے، بچوں کے ایک ماہنامہ پرچے ''عزیز'' میں ان کی طرف سے ہلکی پھلکی نظمیں چھپوائیں۔ اس سے ان کی تشنگیٔ شوق میں اور اضافہ ہوا اور جذبۂ شہرت پسندی اندر ہی اندر نشو و نما پاتا اور اضافۂ عمر کے ساتھ مختلف طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا، جیسا کہ اپنی لکھی ہوئی ''کچھ یادوں کچھ باتوں'' میں انہوں نے خود بھی لکھا، وہ میری غزلیں اپنا تخلص لگا کر مشاعروں میں پڑھتے رہے۔ میں نے جب پہلے پہل ان کا تخلص شوکت سنا تو کہا کہ تم نے اپنی بھابی جان کا نام کیوں چرا لیا؟ (ان کی حقیقی بھابی جو ساتھ ہی رہتی تھیں، ان کا نام شوکت جہاں ہے) تو میاں محمد عمر المتخلص بہ شوکت نے بتایا کہ ایک تو ارشد کے وزن پر ہے۔ بھابی آپ کا مقطع شوکت کا مقطع

بن جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علی برادران کی اعلی شخصیتوں سے نسبت دینا چاہتا تھا۔ مولانا محمد علی کے نام سے تو تخلص بنایا نہیں جا سکتا، مولانا شوکت علی کے نام سے مدد لی ہے۔ یہ عقیدت اس درجہ تھی کہ کافی عرصہ کے بعد میری اور اپنی تصویر امین سلونوی کے رسالہ میں ساتھ ساتھ اس لیے چھپوائی کہ اس کے نیچے علی برادران کے اتباع میں ''تھانوی برادران'' لکھ سکیں اور عرصہ تک لکھنؤ کے ایک حلقۂ احباب میں ہمیں تھانوی برادران ہی کہا جاتا رہا''۔[۱]

شوکت تھانوی نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ابتداء میں ارشد تھانوی کی غزلیں اپنے نام سے پڑھتے تھے۔ ''ما بدولت'' میں بھی انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور '' کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں بھی وہ لکھتے ہیں:

> ''بھائی جان کی شاعرانہ عظمت کا میں کچھ ایسا قائل تھا کہ خود اپنے کو بھی شاعر بنائے بغیر نہ رہ سکا۔ شروع شروع میں تو شاعری کی بھی ''پرائیویٹ پریکٹس'' کرتا رہا۔ جس میں چوری اور سینہ زوری دونوں کو دخل تھا کہ ان ہی بھائی جان کا کلام نقل کر کرکے اپنے دوستوں میں لے جاتا تھا اور ان کے تخلص کی جگہ اپنا تخلص فٹ کرکے اپنے دوستوں کو وہ کلام لہک کر سناتا تھا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ اور عرض کروں، میں چاہتا ہوں کہ میرے تخلص والی بات نہ رہ جائے کہ میں نے شوکت تخلص کیوں رکھا۔ بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں، میں شاعر بن رہا تھا علی برادران اور مہاتما گاندھی کا بڑا شہرہ تھا۔ اب یا تو میں اپنا تخلص گاندھی رکھ سکتا تھا، ورنہ علی برادران میں سے کسی کا نام اپنے تخلص کے لیے منتخب کر سکتا تھا۔ مولانا محمد علی کے نام کے دونوں اجزاء مجھے تخلص کے لیے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوئے۔ البتہ مولانا شوکت علی کا شوکت میرے دل میں اتر گیا۔ پھر اس تخلص کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بھائی کا تخلص ارشد ہٹ کر اس شوکت کو نہایت

۱۔ ارشد تھانوی، نقوش لاہور، شوکت نمبر (شوکت سلمہ جو اب مرحوم و مغفور ہو گیا) ص ۳۳۰۔

آسانی سے فٹ کیا جا سکتا تھا"۔[1]

شوکت تھانوی بہت عرصہ تک اپنے دوستوں کو چوری کی غزلیں سناتے رہے اور اپنی دھاک بٹھاتے رہے۔ ان کے شاعر ہونے کی اطلاع اردو کے استاد مولوی حفاظت علی صاحب کو ہوئی تو وہ بھی انہیں قدر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایک دن انہوں نے اپنے احباب کو تازہ غزل سنائی، جو ان کے استاد مولوی حفاظت علی تک بھی پہنچ گئی۔ مولوی صاحب نے اس غزل کو دیکھنے کے بعد انہیں بہت داد دی اور کہا کہ شاعری خدا کی دین ہے اس کے لیے عمر یا قابلیت کی کوئی قید نہیں۔ دوسرے دن شوکت تھانوی کے ایک ہم جماعت محمد ایوب حسن ایک رسالہ لے آئے جس میں وہ غزل چھپی تھی۔ انہوں نے وہ رسالہ مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ مولوی صاحب نے اس کو دیکھا اور بہت ہنسے۔ اب شوکت تھانوی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ دوستوں نے بہت مذاق اڑایا، مگر شوکت تھانوی نے ہمت نہ ہاری اور شعر کہنے کے لیے خود محنت شروع کر دی۔ "مابدولت" میں انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں لکھا ہے:

> "چوری کھلنے کے اس واقعہ کے بعد ہم کو واقعی عبرت حاصل ہوئی اور اس سلسلہ میں ہم ایوب صاحب کے ہمیشہ کے لیے شکرگذار ہیں کہ اس نے شرارت کے پردے میں ہم سے بہت بڑی دوستی کی۔ چنانچہ ہم نے پھر کبھی کسی شاعر کا شعر نقل نہیں کیا اور خود شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ گھنٹوں غور کر کے ایک مصرعہ کہا بھی تو پتہ چلا کہ اس میں یا تو کچھ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا ہے اور گھنٹہ بھر اس کی کتر بیونت کی، راتوں کے بیٹھے مصرعے کہہ رہے ہیں اور کاٹ رہے ہیں"۔[2]

غزل کی چوری کھلنے سے شوکت تھانوی کی جو ساکھ خراب ہوئی تھی اب اس کی تلافی ہونے لگی اور ان میں شعر کہنے کی ایک نئی امنگ پیدا

۱۔ شوکت تھانوی، کچھ یادیں کچھ باتیں، مطبوعہ نقوش پریس، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۲۶۔

۲۔ شوکت تھانوی، مابدولت، مطبوعہ نقوش پریس، لاہور، ص ۶۵، ۶۶۔

ہوئی اور ایک دن غزل کہنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ :

> ''ایک دن ناگاہ ایک غزل مجھ سے بھی سرزد ہوگئی اور کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم، جب میں نے اپنی ذاتی پہلی غزل مکمل کرکے احباب سے داد حاصل کی ہے، مگر چونکہ یہ چوری کی غزل نہ تھی لہذا بے ساختہ جی چاہنے لگا کہ یہ غزل میرے نام سے کہیں نہ کہیں چھپ ضرور جائے۔ میں نے اس غزل کی کئی نقلیں کیں اور اپنے گھر آنے والے تمام ادبی رسالوں کے پتہ پر ایک ایک نقل اس اپیل کے ساتھ روانہ کر دی کہ
> بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے''۔[1]

چند دنوں کے بعد شوکت تھانوی کو ایک رسالہ ڈاک کے ذریعے موصول ہوا تو دیکھا کہ اس میں ان کی غزل چھپی ہوئی ہے اور عنوان کے نیچے ان کا نام ''نتیجہ فکر شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی'' چھپا ہوا ہے۔ اس رسالہ کا نام ''ترچھی نظر'' تھا اور اس کے مدیر امین سلونوی تھے جو بعد میں شوکت تھانوی کے اہم دوستوں میں شمار ہوئے۔ شوکت تھانوی نے کئی مرتبہ اپنی غزل کو پڑھا، لیکن اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ حقیقت ہے یا فسانہ — بالآخر اسے حقیقت تسلیم کرنا پڑی اور اب ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے گھر کے دوسرے افراد بھی اس غزل کو دیکھیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک میز پر اس رسالہ کا وہی غزل والا صفحہ کھول کر رکھ دیا تاکہ اس کی زیارت سے ہر اہل بصیرت مشرف ہوسکے۔ سب سے پہلے اس رسالے پر جس کی نظر پڑی وہ ان کے والد صاحب قبلہ ہی تھے :

> پہلے تو یوں ہی سرسری نظر سے اس رسالہ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھٹکے۔ واپس لوٹے، رسالہ کو اٹھایا اور چشمہ لگا کر پوری توجہ سے اس کو دیکھتے رہے غالباً انھوں نے بھی ایک مرتبہ پڑھنا کافی نہ سمجھا اس لیے کہ دیر تک پہلے تو اسی صفحہ کو دیکھتے رہے اس کے بعد رسالہ بند کرکے اس کا سرورق دیکھا پھر

۱۔ شوکت تھانوی، کچھ یادیں کچھ باتیں، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ص ۷۔

رسالہ کے باقی صفحات پر بھی جستہ جستہ نظر ڈالی اور آخر اس رسالہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں سے والدہ محترمہ کو آواز دی :

"میں نے کہا کہاں ہیں آپ ذرا تشریف لائیے" اس قسم کی آواز وہ عموماً ان مواقع پر دیا کرتے تھے جب ان کو والدہ محترمہ سے کسی کی شکایت کرنا ہوتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے کمرے میں پہنچیں تو والد صاحب نے ان کو دیکھتے ہی کہا آپ کے صاحبزادے بلند اقبال فرماتے ہیں کہ :

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ اس نامعقول کوچہ میں جاتے ہی کیوں ہیں "والدہ بیچاری نے نہایت معصومیت سے فرمایا" مجھے تو خبر نہیں کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے ۔"[1]

شوکت تھانوی کے والد صاحب نے جب رسالہ کا نام دیکھا تو لاحول پڑھتے ہی بن پڑی اور کہنے لگے کہ بھلا "ترچھی نظر" بھی کسی ادبی رسالہ کا نام ہو سکتا ہے اور برخوردار کو کلام چھپوانے کے لیے صرف "ترچھی نظر" ہی ملا ہے ۔ شوکت تھانوی امین سلونوی سے ملے تو انھوں نے گزارش کی کہ مہربانی فرما کر اپنے رسالہ کا نام بدل دیجیے ۔ امین سلونوی پہلے ہی اس کا نام تبدیل کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہنے لگے کہ آئندہ یہ رسالہ صرف "نظر" کے نام سے شائع کیا جائے گا ۔ امین سلونوی خود بھی شاعر تھے اور انھیں مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ ایک دن امین سلونوی نے شوکت تھانوی کو اپنے استاد مولانا آسی کا ایک شعر سنایا :

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

یہ شعر شوکت تھانوی کو ایسا اچھا لگا کہ وہ تا دیر اس شعر کو گنگناتے رہے اور امین سلونوی سے استدعا کی کہ شعر گوئی میں وہ اس

۱۔ شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ، ص ۹ ، ۱۰

شخص سے روحانی حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ایک دن امین سلونوی انہیں مولانا آسی کے مکان پر لے گئے۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''مولانا بڑے تپاک سے ملے۔ امین صاحب کی درخواست پر تقریباً بادل ناخواستہ اپنی وہی غزل ارشاد فرمائی جس کا ایک شعر میں تین دن سے گنگناتا پھر رہا تھا اور اس کے بعد امین سلونوی صاحب ہی نے میری اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور تو فرما لیا مگر میں اب تک اس شش و پنج میں تھا کہ اگر میری شاعری کی والد محترم کو پھر اطلاع ہو گئی تو کیا ہوگا مگر یہ کہنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں بصیغۂ راز شاعر بننا چاہتا ہوں اور جب تک والد صاحب اجازت نہ دے دیں انڈر گراؤنڈ رہنا چاہتا ہوں۔''[1]

شوکت تھانوی نے مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ شاعری شروع کی۔ والد صاحب کے خوف کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت نہ کرتے ہوئے صرف مشق سخن پر ہی توجہ دیتے تھے۔ وہ اپنے استاد کے پاس پرسکون لمحات میں جایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی غلطیوں اور خامیوں کو سمجھ سکیں اور اصلاحی نکتے ان کے ذہن نشین ہو سکیں۔ ایک روز مولانا آسی نے فرمایا کہ پنڈت جگت موہن لعل رواں نے اناؤ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوں۔ یہ گویا شوکت تھانوی کا پہلا مشاعرہ تھا، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے بڑی محنت سے غزل کہی۔ مولانا آسی نے بھی اس غزل کو خصوصیت کے ساتھ پسند کیا۔ چونکہ پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہو رہا تھا لہٰذا اس کی دھن بھی غسلخانے میں چھپ چھپ کر بنائی۔ اس زمانہ میں آواز بھی آج کل کی سی بھیانک نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے میں غزل خوب چمکی مگر جب غزل چمک چکی تو ایک بجلی بھی مجھ پر یہ گری کہ اسی مشاعرے کے ایک شاعر مرزا فخر اللہ بیگ مشاعرے کے بعد میرے پاس آئے، نہایت شفقت

۱۔ شوکت تھانوی: کچھ یادیں کچھ باتیں، ناشر ادارۂ فروغ اردو، لاہور
ص ۱۷، ۱۸

> سے داد دی ۔ بڑی دیر تک گلے لگاتے رہے اور آخر میں یہ کہہ کر میرا دم نکال لیا کہ وہ والد محترم کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ہیں لہذا مجھ کو مشاعرے میں سرسبز دیکھ کر ان کو بے حد مسرت ہوئی ہے ۔''[1]

شوکت تھانوی کو جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ اگلے روز مرزا فخر اللہ بیگ ، شوکت تھانوی کے والد کے پاس پہنچ گئے اور اناؤ کے مشاعرہ کی ساری روداد انھیں سنا دی اور شوکت تھانوی کی غزل کی بے حد تعریف کی اور یہ شعر ان کے والد کو سنایا :

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شب غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کوئی ارماں نکلا

یہ شعر سن کر ان کے والد صاحب بھی خوش ہوئے ۔ اس طرح شوکت تھانوی کو اپنی شاعری کے چھپانے کی ضرورت نہ رہی اور اب انھوں نے لکھنؤ کے مشاعرے بھی پڑھنا شروع کر دیے ۔ شوکت تھانوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

> ''اب گویا والد صاحب کو خدا نے صبر کی توفیق عطا کر دی تھی کہ جوان بیٹا شاعر نکل گیا ہے تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے اور اب وہ اس سلسلے میں اپنی قسمت پر شاکر تھے ۔ گھر پر اگر کوئی شاعر دوست آ جاتا تھا تو اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے ۔''[2]

یہاں اس ماحول کا جائزہ لینا بے محل نہیں ہوگا جس نے والد کی مخالفت کے باوجود انھیں شاعر بننے پر مجبور کیا ۔ شوکت تھانوی ابھی دس برس کے تھے کہ ان کے والد صاحب نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ یعنی ۱۹۱۳ء میں جب وہ بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو تھانہ بھون جانے کے بجائے لکھنؤ چلے آئے تھے ۔ لکھنؤ میں علم و ادب کا غیر معمولی چرچا تھا ۔ شوکت تھانوی جب ذرا بڑے ہوئے تو انھوں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ لکھنؤ کا ہر شخص

۱۔ شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ص ۲۴ ، ۲۵

۲۔ شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ص ۲۸

زبان و بیان پر خاص طور سے توجہ دیتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شعری تجربات کے اظہار کے لیے بہتر سے بہتر الفاظ اور اسالیب بیان کام میں لائے جانے چاہئیں۔ اس زمانے میں شاعر کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ سچے شعری تجربات سے قطع نظر کرکے بھی الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان کے ایک وسیع خزانے پر دسترس رکھے اور انہیں قافیہ، ردیف اور وزن کے سانچے میں ڈھال کر ادب کا جز بنا دے۔

لکھنؤ میں زندگی کے ایک ایک گوشے میں ایسی رنگا رنگی اور ہما ہمی تھی کہ دوسری جگہ ساری زندگی میں ملنا محال تھی۔ اس لیے یہاں مروج و مستعمل الفاظ و محاورات کا ایک وافر ذخیرہ موجود تھا۔ مشرقی علوم کی تعلیم نے عربی و فارسی کے مشکل الفاظ و تراکیب کا سرمایہ بھی مہیا کر دیا تھا۔ اس لیے شوکت تھانوی نے بھی اپنی شاعری میں زبان و بیان پر خاص طور سے توجہ دی ہے۔

لکھنؤ والے اپنے عہد کی خوشحالی اور عیش و نشاط کا بڑا احساس رکھتے تھے اور اس پر نازاں تھے۔ وہاں حسن کا مطلب حسن نسوانی تھا۔ حسن کی ایک موہوم سی جھلک نہ تھی، جلوؤں کا اژدہام تھا اور نتیجہ حیراں کے بجائے سیرابی۔ معاشی اور جنسی آسودگی کی فضا زندگی اور عشق میں گہری اندرونی چوٹوں کے بجائے ہلکے بیرونی چرکوں کے لیے زیادہ سازگار تھی۔ چنانچہ نفس مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ اسکول کی شاعری میں داخلی عناصر کے مقابلے میں خارجی عناصر کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔

ایک اور خصوصیت جس نے لکھنو کی شاعری میں مذکورہ معاشرتی حرکات سے بار پایا معاملہ بندی تھی۔ لکھنؤ میں عاشق کے لیے پردہ داری، شرم و حیاء اور دوسری اخلاقی سختیوں سے آزادی کی بڑی دلچسپ راہیں نکل آئی تھیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان حرف و حکایات اور وصل و ملاقات کے دروازے کھل گئے تھے اس لیے یہاں عاشق کو واردات کے مقابلے میں معاملات سے زیادہ سروکار تھا۔ بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ''جہاں معشوق خود ہی وصال طلب ہو وہاں کاوش ہجر اور لذت غم کیسی'' چنانچہ عاشق و معشوق کے ملنے جلنے کی صورت میں ربط و اختلاط اور راز و نیاز کی جو باتیں پیش آ سکتی ہیں اس دور کی لکھنوی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں پر مشتمل تھا۔

١۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی : دلی کا دبستان شاعری، ١٩٤٩ء، ص ٣٢٥

فکر و فن کے اعتبار سے یہ ایسی خصوصیات تھیں جن سے اس دور کی لکھنوی شاعری عام طور پر پہچانی جاتی تھی۔ اشعار کا ایک بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں ایک وقت ان میں سے اکثر خصوصیتیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے شاعری کا جو تصور ان خصوصیات سے ابھرتا ہے وہ لکھنوی شاعری کو دہلوی شاعری سے واضح طور پر الگ کر دیتا ہے لیکن لکھنؤ کے مذاق سخن کے کچھ ایسے پہلو بھی تھے جو اگرچہ ضمنی حیثیت رکھتے تھے لیکن جن کو نظر انداز کر دینے سے اس کے متعلق صحیح نتائج نہیں نکل سکتے۔ لکھنؤ والوں نے سیاسی آزادی اور معاشی خوشحالی کے زعم میں دہلی کی تہذیبی برتری کے طلسم کو توڑ دیا تھا۔ دنیائے شاعری میں ان کارگذاریوں کا بڑا دخل تھا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کا نقطہ نظر کچھ بھی رہا ہو شعر و سخن میں وہ اپنی بڑائی اور انفرادیت کا شدت سے احساس رکھنے کے باوجود دہلی کی عظمت کے بھی قائل تھے یہاں کے شعراء اساتذۂ دہلی کی مشہور غزلوں پر غزلیں کہتے تھے ان کی تقلید کرتے تھے اور مقطعوں میں ان سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔

معاشرتی ماحول افراد پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ایک زمانے کے افراد کی زندگی میں کچھ ایسی مشترک باتیں پائی جاتی ہیں جو اجتماعی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں لیکن سخت سے سخت اور حاوی سے حاوی ماحول میں ایسے ذہنی اور جذباتی تجربات کی راہیں بالکل مسدود نہیں ہو جاتیں جن کی نوعیت نجی یا ذاتی ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی جمال ریز اور نغمہ بار فضا میں ایسی نجی دھنوں کا لگنا ناممکن تھا جو داخلی گداز کی مالک ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر معاشرتی ماحول اپنا ایک پس منظر بھی رکھتا ہے اور اپنی جدت پسندی اور انفرادیت کے باوجود گذشتہ روایات سے بالکل بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ ادب کی نشو و نما میں بھی کم و بیش یہی صورت سامنے آتی ہے۔ ہر دور اپنے الگ تقاضے اور میلان لے کر آتا ہے بعض ادوار ادبی تصورات میں انقلابی تبدیلیوں کے حامل ہوتے ہیں لیکن ماضی کی روایات سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا اور اول و آخر کسی نہ کسی شکل میں وہ اپنی جگہ بنا کر رہتی ہیں۔ چنانچہ شوکت تھانوی کے دور کی لکھنوی شاعری میں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو واردات قلبی اور جذبات نگاری سے تعلق رکھتے ہیں۔

شوکت تھانوی جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اس کا اثر یقیناً ان کی شاعری پر پڑا ہے۔

غزلیات

ترانوے (۹۳) غزلیات پر مشتمل شوکت تھانوی کا ایک مجموعہ "گہرستان" کے نام سے ۱۹۳۳ء یا اس کے بعد شائع ہوا۔ جو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے شوکت بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ شوکت بک ڈپو کا مطلب یہ ہوا کہ شوکت تھانوی نے یہ مجموعۂ کلام کسی پبلشر کو دینے کی بجائے خود چھاپا تھا۔ اس کا مقدمہ نواب مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی نے تحریر کیا ہے۔ مقدمے کے آخر میں ۲۱ جولائی ۱۹۳۳ء کی تاریخ درج ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء میں مرتب ہوا راقم الحروف نے اس دور کے رسائل اور اخبارات بھی دیکھے ہیں جس میں گہرستان کے چھپنے کی اطلاع دی گئی ہے اور بعض رسائل میں اشتہار دیا گیا ہے ان شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۳۳ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس وقت شوکت تھانوی کی عمر تیس سال تھی۔

شوکت تھانوی دوسرا مجموعہ "گہرستان کے بعد" کے نام سے ترتیب دینا چاہتے تھے جس کے ابھی صرف انھوں نے سولہ صفحات تحریر کیے تھے۔ ان سولہ صفحات میں ۲۲ غزلیں تحریر کی گئی ہیں۔ بہت باریک اور خوبصورت لکھا ہوا یہ مجموعہ شوکت تھانوی کے منجھلے صاحبزادے خورشید شوکت (لاہور) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے یہ مجموعہ ان کے پاس دیکھا ہے۔ "گہرستان" کے ساتھ ہی کچھ کاغذ لگا کر اس مجموعے کی جلد بندی کرائی گئی تھی۔ سفید کاغذوں کی جلد بندی کے بعد شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ریڈیو اور اخبارات کی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس مجموعے کو ترتیب نہ دے سکے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے شاعری کے بجائے نثر پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی اور شاعری صرف مشاعروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے وہ مصرعہ طرح پر غزل کہتے اور مشاعرہ پڑھنے کے بعد وہ غزل کسی اخبار میں چھپوا دیا کرتے تھے۔

شوکت تھانوی ایک فطری شاعر تھے۔ ابتدائی دور میں غزل ان کی محبوب ترین صنف تھی اور غزل محبوب کی زبانی جذبے کے بیان کا نام ہے۔ جذبے کی رمزی اور ایمائی کیفیت کا مکمل اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا

جب تک ایسے علامتی الفاظ کو استعمال نہ کیا جائے جن میں وجدان کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت ہو۔ اچھی غزل کی تخلیق کے لیے زبان پر قدرت اور الفاظ کی جوہری انفرادیت کی معرفت لازمی اور ناگزیر ہے اس کے بغیر نہ اچھا شعر نظم کیا جا سکتا ہے نہ ان میں رمزی اور ایمائی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ شوکت تھانوی کا آرٹ ان کے جذبے کا رمز ہے جسے انہوں نے الفاظ کی علامتوں سے ظاہر کیا ہے۔ شوکت تھانوی کو لکھنؤ کی زبان سے عشق تھا اس زبان کو مقبول خاص و عام بنانے اور حیات ابدی دینے کا یہی واحد ذریعہ تھا کہ اس کو شعری جامے میں ملبوس کر دیا جائے چنانچہ شوکت تھانوی نے یہی کیا۔ شوکت تھانوی اپنے اشعار میں لکھنوی روزمرہ کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

تم اپنے وعدوں کو بھول کر بھی اگر ہمیں یاد رکھ سکو گے
یہ دل سلامت تو ہم اسے پھر فریب میں مبتلا کریں گے

خوشی کا تو خیر ذکر کیا ہے ہمارا غم بھی نہ غم رہے گا
ہمارے رونے پہ دیکھ لینا ہمارے آنسو ہنسا کریں گے

وہ جس طرف گئے رخ تاباں لیے ہوئے
ہم دیکھتے رہے دل حیراں لیے ہوئے

زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا
جو بسر ہو جائے اس کو زندگی کہہ لیجیے

شوکت تھانوی نے ہمیشہ سادہ، سہل، آسان الفاظ اور دلنشین ترکیبوں کا استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے ادب شناس ذوق کی وجہ سے الفاظ کی در و بست اور ترکیب کے توازن کے نکتہ سے بخوبی واقف تھے اور ان کا استعمال ایسی خوبصورتی سے کرتے تھے کہ ان کی شاعری میں مصوری کی جھلک نظر آنے لگی ہے اور ان کی بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے:

سچ ہے ان کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ تو اب کام دیوانے سے کیا

میرے غم نے ساری دنیا کو پریشاں کر دیا
آئینہ نے آئینہ خانہ کو حیراں کر دیا

———

جس طرح گذری ہے اب تک اب بھی گذرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا

سہل ممتنع، سادگی و حسن بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شخص کے لیے آسان ہے لیکن جب کوشش کرکے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔ شوکت تھانوی کے کلام میں صداقت کی وجہ سے سلاست و فصاحت پیدا ہو گئی ہے کیونکہ جو ان کی زندگی تھی وہی ان کی شاعری ہے دونوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دقتوں کے باوجود سلاست و روانی انتہائی کمال تک ملتی ہے ان کے بعض اشعار کو نثر کرنے کے بعد بھی ان کی ترکیب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی متعدد چھوٹی بحر کی غزلیں سہل ممتنع کی تعریف پر پوری اترتی ہیں مثلاً:

لاکھ پردوں میں اس کو دیکھ لیا
عشق نے کیا نگاہ پائی ہے

———

تم تصور میں ہوئے تھے ہم کلام
سوچتا ہوں میں نے کس سے بات کی

———

میں ہوں شوکت اور مری تنہائیاں
حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

حسن و عشق ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے۔ اس یگانگت کے باوجود ہم حسن و عشق کے درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں۔ حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں

یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور عشق اسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے جیسے ہم خود ہیں ویسا ہی ہمارا عشق ہے۔ شوکت تھانوی کا تصور حسن و عشق بھی شوکت تھانوی کی شخصیت سے علیحدہ نہیں ہے ان کا عشق کتابی یا روایتی نہیں ہے بلکہ یہ تجربات و مشاہدات ان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اظہار میں شوکت تھانوی نے ایک دلچسپ کیفیت پیدا کر دی ہے:

عشق کا عالم جدا ہے حسن کی دنیا جدا
مجھ کو آبادی سے کیا اور تم کو ویرانے سے کیا

—————

ہزار بار سنے ہم نے عشق کے نالے
مگر کسی نے جو دیکھا تو بے زباں دیکھا

—————

حقیقت ایک ہے لیکن نظر کا فرق ہے شوکت
وہ جس کو کچھ نہیں سمجھے اسے ہم دل سمجھتے ہیں

—————

صنعتوں کا استعمال

بعض شاعروں نے صنعتوں کا استعمال اتنی بے اعتدالی سے کیا ہے کہ انہیں دیکھ کر طبیعت مکدر ہوتی ہے لیکن کسی شے کے غلط استعمال سے نفس شے میں کوئی خرابی نہیں آسکتی اس میں شک نہیں کہ اگر سلیقہ کے ساتھ صنعتوں کا استعمال کیا جائے تو کلام کے حسن میں یقیناً اضافہ ہو جاتا ہے شوکت تھانوی نے اپنے کلام میں صنعتوں کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ان کے کلام کا حسن بڑھاتی ہیں۔ شوکت تھانوی نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ صنعتوں کو اتنا ابھرنے نہیں دینا چاہیے کہ وہ سامع کے ذہن کو معنی سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ اس دعوے کی دلیل میں چند مثالیں:

صنعت مراعاۃ النظیر

سرگذشت عہد مجنوں نجد کے ذروں سے پوچھ
اب وہاں مجنوں نہیں ، لیلی نہیں محمل نہیں
کون سے دریا میں ہے یا رب سفینہ عشق کا
ہر زبان موج کہتی ہے یہاں ساحل نہیں

صنعت تضاد

فصل خزاں کو کیا کہوں خبر خزاں تو ہے خزاں
مجھ سے خزاں نصیب کو چین نہیں بہار میں
بعد سا بعد تھا مگر بعد ہی قرب بن گیا
آپ سے متصل رہے آپ کے انتظار میں

نظم و نثر دونوں میں الفاظ کی سادگی اور دلنشین ترکیبوں کے استعمال سے ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ ترکیبوں کے برمحل استعمال سے شاعری جگمگا اٹھتی ہے ۔ اردو کے تمام شاعروں نے فارسی اور عربی کی دلاویز ترکیبوں سے اپنا کلام آراستہ کیا ہے شوکت تھانوی بھی اس سے بچ نہ سکے انھوں نے حتی الامکان فارسی کے استعمال سے احتراز کیا ہے لیکن بعض موقعوں پر انہوں نے فارسی ترکیبوں کو اس طرح کھپایا ہے کہ فارسی اور اردو کی مثالی آمیزش سے ایک طرح کا خوش منظر گنگا جمنی رنگ پیدا ہو گیا ہے :

اگرچہ خانہ بر انداز دل ہے مایوسی
زمین کاوش امید کو قرار تو ہے

————

راہرو راہ وفا اک بات سنتا جا مری
یہ خبر مشہور ہے اس راہ میں منزل نہیں

————

کافی ہے مجھ کو اک نظر التفات دل
سرگرم آرزوئے تماشا نہیں ہوں میں

شوکت تھانوی کے کلام میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے اس کے چند اسباب ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے جو شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کی ہیں ان میں بات کو صفائی، سادگی اور اختصار سے ادا کرنا لازمی اقتضا تھا۔ بعض ایسی بحریں ہوی ہیں جن کی تخلیق میں فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا عنصر بہت زیادہ ہے اس لیے جب ان میں شعر کہا جاتا ہے تو طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش میں بڑی کوشش سے کام لیا ہے۔ ردیف حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری میں خیالات کی وسعت، بیان کی رنگینی اور تنوع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال میں خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مد نظر رکھا ہے کہ حروف قافیہ میں کیفیت آمیز توازن قائم رہے اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے جن کے حروف میں بیگانگی یا آواز میں کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے۔ شوکت تھانوی کے ہاں سے شگفتگی اور روانی کے ذیل میں چند مثالیں:

وفا نا آشناؤں سے وفا کی
خطا کی اور بڑی ہم نے خطا کی

———

جہاں تک ہو سکا دل کی دوا کی
اب اس کے بعد جو مرضی خدا کی

———

ملی جنت ترے کوچہ کے بدلے
جزا میں بھی ہے نوعیت سزا کی

———

داخلیت اور خارجیت کا امتزاج

بعض ناقدین نے دہلوی رنگ کی تمام خصوصیات کو ''داخلیت'' اور لکھنوی رنگ کی خصوصیات کو ''خارجیت'' کہہ کر ظاہر کیا ہے داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر قلبی کیفیات اور داخلی جذبات کی ترجمانی پر زور صرف کرتا ہے اس کے برخلاف خارجیت میں متعلقات حسن اور خارجی لوازمات پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اگر ان کیفیات کی مصوری کی جائے جو

حسن کی دید سے یا فراق کی کیفیت سے دل پر گذرے تو یہ داخلی رنگ میں داخل ہوگا اور اگر محبوب کے خد و خال ، اس کے جسم کے مختلف اعضاء ، ملبوسات زیورات اور سنگھار کا بیان ہو تو اسے خارجی رنگ قرار دیتے ہیں۔ شوکت تھانوی کی شاعری داخلیت اور خارجیت کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ شوکت تھانوی نے ''گھرستان'' میں ''غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد'' کے عنوان کے تحت اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نہ وہ لکھنوی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ دبستان دلی سے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''میں کسی دعویٰ کے ساتھ یا چیلنج کے طور پر یہ مجموعہ پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس اعتراف کے ساتھ کہ نہ میں لکھنوی ہوں اور نہ دہلوی، نہ مجھ کو دعوائے سخن ہے نہ زباندانی کا زعم۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کو اس مجموعہ میں کوئی چیز اپنی طرف متوجہ کر سکے تو اس کو فیضان آسی سمجھیے گا ، استاذی علامہ آسی نے آفتاب علم بن کر مجھ ایسے خدا جانے کتنے ذروں کو ضیا بخشی ہے۔''[1]

شوکت تھانوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں خارجی زندگی کے ساتھ داخلی زندگی کے اثرات نظر آتے ہیں :

یوں موت پہ میں جاں کو قربان نہ کرتا
تو نے مجھے شاید کوئی پیغام دیا تھا
عشق بھی اپنا نہ تھا اور حسن بھی اپنا نہ تھا
تیرے کوچہ میں زمین و آسماں بیگانہ تھا

تاثیر ہی بیاں میں نہ ہو جب تو کیا کروں
کیا اپنا حال ان کو سناتا نہیں ہوں میں

کوئی دیکھے ان کی دزدیدہ نگاہی کے فریب
کوئی پوچھے جان لیتا کون سا اعجاز ہے

---

[1] شوکت تھانوی : گھرستان ، شوکت بک ڈپو ، لکھنو ، ص ۱۹ ۔

شوکت تھانوی نے اپنی شاعری کی ابتداء تو غزل سے کی، لیکن انتہا نظم پر ہوئی۔ عمر کی آخری دہائی میں وہ غزل کی بجائے نظم پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ مشاعروں میں زیادہ تر طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں پڑھ پڑھ کر وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ ”گہرستان“ میں جو شوکت تھانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے چند نظمیں بھی ملتی ہیں۔ پہلی نظم ”محمد عربی صلعم“ کے عنوان کے تحت ”مسدس“ کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس کے ۳۳ بند ہیں۔ دوسری نظم ”نذر حبیب“ کے عنوان کے تحت، تیسری نظم ”سکوت شب“ اور چوتھی نظم ”شاعر کا مذہب“ کے عنوان کے تحت شامل کی گئی ہیں۔ یہ چاروں نظمیں اس مجموعہ کے صفحہ ۱۸۵ سے ۲۰۷ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان چار نظموں کے علاوہ جو باقاعدہ کسی مجموعے میں شامل کی گئی ہیں شوکت تھانوی نے نظموں کی اور کوئی کتاب ترتیب نہیں دی، حالانکہ نظم سے ان کا شغف تا آخر رہا۔ لیکن ان نظموں کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا وقت شاید ان کے پاس نہیں تھا، اس لیے ان کے انتقال کے بعد چند کتابیں ان کے دوستوں اور مداحوں نے مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ”غم غلط“ ہے، جسے بیگم رفعت جہاں عرشی اور آنسہ زہرہ عرشی نے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ دہلی پرنٹنگ پریس، رام پور، اپریل و مئی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں تئیس نظمیں (۲۳) چند رباعیات اور قطعات شامل ہیں۔ ایک اور کتاب ”اردو کے چار مزاحیہ شاعر“ مرتبہ احمد جمال پاشا ہے، جسے ”شاہکار کتاب“ کے تحت سید قاسم محمود نے مکتبہ شاہکار، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۵۳، لاہور سے ۱۵ جون ۱۹۷۶ء کو الجدہ پریس، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کتاب میں چار شاعروں (۱) ظریف لکھنوی، (۲) شوکت تھانوی، (۳) سید محمد جعفری، (۴) مجید لاہوری کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شوکت تھانوی کی صرف بارہ نظمیں شامل کی گئی ہیں، جن میں سے کچھ ”غم غلط“ میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ چند اہم نظمیں نقوش کے شوکت نمبر اور ”کتاب“ لکھنؤ کے شوکت نمبر میں شامل کی گئی ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ ”نقوش“ کے شوکت نمبر میں پانچ نظمیں شامل ہیں۔ (۱) شاعر کی بیوی، (۲) مری، (۳) آٹا، (۴) کراچی کی بسیں، (۵) الوداع۔ ماہنامہ ”کتاب“ لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۳ء کے شوکت نمبر میں چار نظمیں شامل کی گئی ہیں۔

(۱) روح رواں وطن، (۲) فیملی پلاننگ، (۳) مد و جزر صحافت،

(۳) اگر میں وزیر ہوتا۔

شوکت تھانوی کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظم نگاری کی خصوصیات ان کی غزل گوئی کی خصوصیات سے ملتی جلتی ہیں۔ نظم میں بھی وہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تشبیہات، استعارہ اور صنعتوں کے استعمال سے اپنے بیان کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شگفتگی اور روانی جو غزل میں نظر آتی ہے، وہی نظم میں بھی موجود ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ شوکت تھانوی کی نظم نگاری کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

روح عصر کا آئینہ:

شوکت تھانوی کی نظموں میں شروع سے آخر تک وہ عنصر چھایا ہوا ہے جسے "روح عصر" کہتے ہیں اور جدید اصول تنقید کی رو سے جس کے بغیر ادب صحیح معنوں میں ادب نہیں ہوتا۔ دبستان لکھنؤ کی شاعری میں یہ عنصر سرے سے مفقود تھا۔ کسی شاعر کو اپنے ماحول اور زمانے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ شوکت تھانوی جب تک لکھنؤ رہے، غزل کہتے رہے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔ اس دور کے کلام کو روح عصر کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ حالات و واقعات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں شوکت تھانوی نے ہم کو دی ہیں وہ ان کے عہد کے کسی اور شاعر کے ہاں مشکل ہی سے نظر آئیں گی۔ ان کی ایک نظم "دانۂ گندم" کے دو بند ملاحظہ کیجیے۔ اس نظم میں انہوں نے چور بازاروں اور ذخیرہ اندوزوں کو کھری کھری سنانے کی کوشش کی ہے۔

حضرت آدم پہ جو گذری ہے سب کو یاد ہے
دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولاد آدم پر وہی افتاد ہے
اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی استاد ہے

دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرین چور بازاری کے غم خواروں میں ہے

ان میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں
دل تہہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں
اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں

توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لیے درکار ہے[1]

ایک اور نظم "شاعر کی بیوی" میں انھوں نے بہت خوبصورت انداز میں اپنے معاشرے کی سوچ پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ زمانہ مادیت پرست ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے فنون لطیفہ کی قدر ختم ہوتی جا رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ شاعر اور اس کی بیوی کے نظریات میں بڑی اختلاف ہے۔

وہ یہ کہتی ہے کہ جائے بھاڑ میں شاعری
ایڑی چوٹی پر کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری
یاد کر لو خود دسمبر، جنوری پھر فروری

تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ؟
مجھ کو روٹی چاہیے اور تم کو خالی واہ واہ[2]

شوکت تھانوی کو عمر کی آخری دہائی میں طنز و مزاح کا شاعر کہا جاتا رہا۔ اس دور میں ان کی مقبولیت کا بڑا سبب طنزیہ و مزاحیہ کلام ہی ہے۔ مزاح کے مقابلے میں طنز ایک سنجیدہ چیز ہے۔ یہ عموماً نفرت و حقارت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے معاشرے کی لکیر سے ہٹ جانے والے پر ضربیں لگانا اور اسے لکیر پر واپس لے آنا۔ طنز نگار، حماقتوں، برائیوں، گناہوں، بد دیانتیوں اور منافقتوں کو نفرت اور حقارت کے تیروں سے چھلنی کر دینا چاہتا ہے، اس لیے طنز نگار وہی ہو سکتا ہے جس کا ایک طے شدہ نقطۂ نظر ہو اور وہ اس نقطۂ نظر کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا رشتہ رکھتا ہو۔ شوکت تھانوی کے ہاں طنزیہ اور مزاحیہ عنصر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی کم و بیش ہر نظم میں اس انداز کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم "کراچی کی بسیں" سے ایک مثال:

دلربا، اے نازنینو! اے کراچی کی بسو
تم پہ صدقے ہو کے ہم مر جائیں لیکن تم جیو

۱۔ شوکت تھانوی: غم غلط (مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی، آنسہ زہرہ عرشی)، ص ۶۳، ۶۴۔

۲۔ شوکت تھانوی: غم غلط (مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی، آنسہ زہرہ عرشی)، ص ۳۳۔

کج روی بھولے فلک اب چال تم ایسی چلو
ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو

تم نہ ہم عشاق کا چالنا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار
جو ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دل بے اختیار
اور نظروں سے کرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

ہو کے چکنا چور اترے بس سے باحال خراب
جیسے بندر نوچ کر پھینکے منڈیری سے کتاب
اس زبوں حالی پہ بھی خوش ہیں کہ ہم ہیں کامیاب
مل گئی ہے گھر کی جنت جھیل کر یوم الحساب

رات بھر یہ بس رہے گی ذہن پر اپنے سوار
صبح دم ہم پھر وہی ہوں گے وہی اپنی قطار[1]

پیروڈی :

شوکت تھانوی کے یہاں طنز و مزاح پیدا کرنے کا ایک اہم حربہ تحریف یا پیروڈی ہے۔ پیروڈی کسی مشہور فن پارے میں جزوی تبدیلی کرکے اسے نیا مفہوم عطا کرنے کا نام ہے۔ ذیل میں چند اشعار شوکت تھانوی کے تحریف شدہ اشعار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں تاکہ تحریف کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

غالب :

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

---

[1] شوکت تھانوی : کراچی کی بسیں، نقوش شوکت نمبر، ص ۲۳۲، ۲۳۳۔

شوکت تھانوی :

اگ رہا ہے تیرے رخسار پہ سبزہ غالب
تو ہے سجدے میں ترے رخ پہ بہار آئی ہے

اقبال :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

شوکت تھانوی :

پتلون ہو اک کوٹ ہو کالر ہو ہو ٹائی
یہ چار عناصر ہوں تو انسان ہے انگریز

اسماعیل میرٹھی :

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

شوکت تھانوی :

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
جو کھوٹا تھا کل تک کھرا ہو گیا

ذوق :

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلیف نہیں کرتے

شوکت تھانوی :

اے ذوق شکر خوری ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو شکر ہی نہیں کھاتے

داغ دہلوی :

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

شوکت تھانوی:

اگر یہی اپنی اصلیت ہے تو اس کو کب تک چھپا سکیں گے
جو چپ رہے گی زبان قینچی تو دھار چمکے گی استرے کی

مرزا شوق لکھنوی:

آخری بار اک لگاتے جائیں
یاد اپنی انہیں دلاتے جائیں

شوکت تھانوی:

ساتھ تصویر اک کھنچاتے جائیں
یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

شوکت تھانوی عام طور پر مشاعروں میں پڑھنے کے لیے نظمیں کہا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی نظموں میں عوامی رنگ کی جھلک نمایاں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے ڈرامے ''قاضی جی'' نے ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اسی لیے جب وہ مشاعرے میں پڑھتے تھے تو ان سے لوگ یہی توقعات وابستہ کرتے تھے کہ وہ عوامی انداز میں ہلکی پھلکی نظمیں سنا کر لوگوں کو محظوظ کریں۔ شوکت تھانوی نے اپنی نظموں میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی اور عوام نے انہیں بہت دیر تک یاد رکھا۔ اپنی ایک نظم ''فیملی پلاننگ'' میں انہوں نے عوام کو بتایا کہ یہ کیوں ضروری ہے:

ہم نے یہ مانا کہ پیدا ہو گیا کھائے گا کیا؟
گھر میں دانے ہی نہ پائے گا تو بھنوائے گا کیا؟
اس نکھٹو باپ سے مانگے گا کیا؟ پائے گا کیا؟

دیکھ کہنا مان لے جان پدر، پیدا نہ ہو
اے مرے بچے! مرے لخت جگر پیدا نہ ہو[1]

دبستان لکھنؤ کے شاعر مناظر فطرت کی تصویر کشی میں مہارت رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے بھی یہ خصوصیت وہیں سے حاصل کی ہے۔ وہ مناظر فطرت

۱۔ شوکت تھانوی: غم غلط (مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی، آسیہ زہرہ عرشی)، مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس، رام پور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۔

کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرہ کی تصویر بھی اپنی نظموں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس بات پر زور دیا کرتے ہیں کہ مفید ترین آرٹ وہ ہے جو خدا کی بزرگی و شان ہم پر آشکارا کرے۔ اگر شوکت تھانوی کی منظر نگاری کو دیکھا جائے تو اس میں کائنات کی ایسی دلکش جھلک ملتی ہے جو خدا کی بزرگی اور عظمت کی طرف برابر متوجہ کرتی رہتی ہے۔ شوکت تھانوی کی ایک نظم ''مری'' کے دو بند دیکھیے:

اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن
اے چمن اندر چمن اور اے چمن اوپر چمن
اف تری رعنائیاں، اللہ رے یہ بانکپن
جنت کشمیر کی بے شک ہے تو چھوٹی بہن

میں تو کہتا ہوں زمانے میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے

زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری
خود ہی کوہ قاف ہے تو اور خود اس کی پری
مال پر اللہ اکبر حسن کی کاریگری
عشق پر طاری ہے جس کو دیکھ کر اک تھرتھری

یہ بناوٹ، یہ سجاوٹ، یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن'

شوکت تھانوی کی شہرت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری پر مبنی ہے، لیکن وہ محض نظم اور غزل کے شاعر ہی نہیں تھے۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ ان کے کلام میں دیگر اصناف سخن کا بھی وافر ذخیرہ ہے۔ ان کی تخلیقات میں مرثیہ، نعت، رباعی، قطعہ اور سہرا شامل ہیں۔

شوکت تھانوی نے جو مرثیہ تحریر کیا وہ دبستان انیس راولپنڈی کی تحریک پر لکھا گیا اور سب سے پہلے دبستان انیس میں ۱۹۶۰ء میں پڑھا گیا۔ دبستان انیس کے تعارف میں سید سبط حسن رضوی لکھتے ہیں:

''اس موقع پر ہم کو دوسرے مرحومین بھی یاد آ رہے ہیں جنھوں نے

۱۔ شوکت تھانوی: ''مری'' نقوش شوکت نمبر، ص ۳۲۹۔

دبستان انیس کی محفلوں کو رونق بخشی تھی، جیسے جناب عبدالعزیز فطرت، زیبار دولوی، ندیم بدایونی، عبدالحفیظ تاثیر، عابد علی عابد، شوکت تھانوی، ڈاکٹر انعام الحق (ڈھاکہ)، مختار صدیقی، باقی صدیقی، حفیظ ہوشیارپوری اور ممتاز حسن احسن"۔[1]

یہ مرثیہ ۵۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا حال اس میں بیان کیا گیا ہے۔ نقوش کے شوکت نمبر اور کتاب لکھنؤ کے شوکت نمبر میں صرف ۱۷ بند دیے گئے ہیں۔ دونوں رسالوں کے بندوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ راقم نے یہ پورا مرثیہ زہرا شوکت کی لائبریری (لاہور) میں دیکھا ہے۔ اس کے کچھ بند روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں چھپے ہیں اور کچھ بند دبستان انیس راولپنڈی کے یادگاری مجلہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ مرثیہ نگاری بہت مشکل فن ہے۔ غالب اور میرتقی میر جیسے استاد جب مرثیہ کہنے بیٹھے تو چند بندوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکے اور اس بات کا اعتراف کر لیا کہ مرثیہ کہنا ایک مشکل کام ہے۔ شوکت تھانوی کسی کام کو مشکل نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے انہوں نے دبستان انیس راولپنڈی کے تحت منعقد ہونے والی مرثیوں کی سالانہ مجالس میں مرثیہ پڑھنے کا وعدہ کیا اور پھر اس وعدہ کو نبھایا۔ اس مرثیہ میں فلسفہ غم کا تجزیہ انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے:

در اصل غم ہے ٹھوس حقیقت، خوشی سراب
تعبیر غم ہے اور خوشی صرف ایک خواب
قلزم صفت ہے غم تو مسرت فقط حباب
دیباچہ انبساط ہے غم مستقل کتاب
تاریخ ہم نے پائی ہے اپنی ملال میں
ڈھونڈا خوشی کو جب تو ملی وہ خیال میں

غم پائیدار اور خوشی مستعار ہے
غم معتبر خوشی کا کسے اعتبار ہے
اس زندگی کا غم ہی پہ دار و مدار ہے
محور یہ غم کے گردش لیل و نہار ہے

۱۔ سید سبط حسن رضوی: دبستان انیس راولپنڈی کا یادگار مجلہ "البحر" سلسلہ صد سالہ برسی، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء، تعارف ص: ج

آرام کا وجود ہے آزار کے لیے
پھولوں میں پل رہا ہے چمن خار کے لیے

بزم ازل نے غم کے سوا ہم کو کیا دیا
اشکوں میں خاک گوندھ کے انساں بنا دیا
تیری سرشت غم ہے یہ ہم کو بتا دیا
پھر حکم یہ قضا و قدر نے سنا دیا
انسان غم سے ربط بڑھاتا ہوا چلے
روتا ہوا یہ آئے رلاتا ہوا چلے[1]

فلسفۂ غم مرثیہ کے "چہرہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ گریز میں شوکت تھانوی نے بہت مہارت کا ثبوت دیا ہے اور ایک ہی بند میں گریز کرکے اصل مقصد کی طرف آگئے ہیں :

آ اے قلم کہ تجھ کو سعادت عطا کریں
جنبش میں تجھ کو لائیں ترا حق ادا کریں
جس غم میں مبتلا ہیں تجھے مبتلا کریں
تیری زباں سے ذکر شہ کربلا کریں
ذکر حسین اصل میں ذکر رسول ہے
یہ وہ مماثلت ہے جو سب کو قبول ہے[2]

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں واقعہ نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے۔ انہوں نے جہاں بھی واقعہ نگاری کی ہے نمایاں جزئیات کا پورا خیال رکھا ہے۔ اور واقعات کی مختلف کڑیوں کو اس طرح ملایا ہے کہ پورا سلسلہ نہایت مربوط انداز میں نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا "اردو کی قدیم اصناف شعر" میں واقعہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "واقعہ نگاری کا کمال یہ نہیں کہ ہر قسم کی تفصیلات اور جزئیات کو بلا کم و کاست بیان کر دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ ایسی تفصیلات کا انتخاب کیا جائے جو تمام واقعہ کو سامنے لے آئیں،

۱- شوکت تھانوی : مرثیہ در حال حضرت امام حسین علیہ السلام، مطبوعہ دبستان انیس، راولپنڈی کا یادگار مجلہ "انیس" بسلسلہ صد سالہ برسی ۱۰ دسمبر، ۱۹۷۴ء، ص ۳۲۳، ۳۲۴-

۲- ایضاً، ص ۳۲۴-

کیونکہ کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو نگاہیں صرف نمایاں جزئیات پر پڑتی ہیں"۔[۱]

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں جب واقعہ نگاری سے کام لیا ہے تو انہوں نے ایسی تفصیلات کا انتخاب کیا ہے جس سے اس واقعہ کے اسباب کا پتہ چلتا ہے:

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسول
کیا ان مطالبات کو کر لیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید ہمارا ہے کیا اصول
پھر بحث اس نے چھیڑی ہے ہم سے یہ کیا فضول

کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اس کے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسول کی غیرت، نہیں نہیں
قرآن کی اور ختم ہو عظمت، نہیں نہیں
ہو داغ دار کعبہ کی حرمت، نہیں نہیں
میں اور کروں یزید سے بیعت، نہیں نہیں

سن لے بگوش ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار بھی نہیں سو بار ہے مجھے

اب کیا تھا اک گھٹا سی اٹھی فوج شام کی
کوندی افق پہ برق سی اک انتقام کی
ہر چند تھی وہ فوج بڑے احتشام کی
خاطر میں اس کو لائی نہ عظمت امام کی

کثرت سے کیا ڈرے کہ جو وحدت پرست ہو
یہ عزم وہ نہ تھا کہ جو اس طرح پست ہو[۲]

۱۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: اردو کی قدیم اصناف شعر، ص ۲۳۵، مطبوعہ استقلال پریس، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

۲۔ شوکت تھانوی: شہادت عظمیٰ، مطبوعہ ماہنامہ کتاب، لکھنؤ، شوکت تھانوی نمبر، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۹۶، ۹۷۔

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں زبان و بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ یہ خصوصیت ان کی غزل اور نظم میں بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے اور یہاں مرثیہ میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔ اس کی وجہ لکھنوی ماحول میں تربیت ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری بھی اس مرثیہ کی اہم خصوصیات ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے مرثیہ میں دلنشین الفاظ کی اتنی بہتات ہے کہ ہر شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

شوکت تھانوی کے مجموعۂ کلام ''گہرستان'' میں دو نظمیں نعتیہ ہیں۔ پہلی نظم ''محمد عربی صلعم'' ہے جو مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور یہ نظم ۳۳ بندوں پر مشتمل ہے۔ دوسری نظم ''نذر حبیب'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے۔ یہ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور ۲۱ اشعار پر مبنی ہے۔

شوکت تھانوی کی صرف آٹھ مطبوعہ نعتیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شوکت تھانوی نے خواجہ الطاف حسین حالی کی جدید شاعری کی تحریک کا اثر قبول کیا ہے اور انھوں نے نعت کو حصول سعادت اور تسکین خاطر کا ذریعہ سمجھا ہے۔

شوکت تھانوی نے رباعیات اور قطعات اپنے اخباروں کے لیے تحریر کیے ہیں۔ روزنامہ ''طوفان'' میں جس کے شوکت تھانوی خود ہی مالک تھے اور خود ہی مدیر، انھوں نے جو رباعیات اور قطعات لکھے ہیں اس پر درج ہے ''طوفان کے خاص شاعر کے قلم سے'' اور وہ خاص شاعر خود شوکت تھانوی ہی تھے۔ ان کی رباعیات اور قطعات کا ذخیرہ زیادہ تر ''طوفان'' میں ہی موجود ہے۔ شوکت تھانوی کی رباعیات و قطعات اپنے ماحول کے آئینہ دار ہیں۔ اس زمانہ کے افراد اور خاص طور سے مسلمان جن خرابیوں میں مبتلا تھے ان کی عکاسی شوکت تھانوی نے اپنی رباعیات اور اپنے قطعات میں کی ہے۔ ان کی رباعیات کی تعداد ۱۶ اور قطعات کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کے ''طوفان'' میں طوفان کی آمد پر جو رباعی کہی وہ یہ ہے۔

طوفان آئے ہیں گو مٹانے کے لیے
بنیاد زمانہ کو ہلانے کے لیے
لیکن یہ ہے اپنی نوعیت کا طوفان
آیا ہے یہ سوتوں کو جگانے کے لیے[1]

اس رباعی سے ان کے اخبار "طوفان" کی آمد کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ مسلمان قوم جو اس وقت سو چکی تھی، اسے جگانے کے لیے یہ اخبار جاری کیا گیا ہے۔

شوکت تھانوی کی صحافت اور شاعری سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور قائد اعظم کی قیادت کو درست سمجھتے تھے۔ جناح نہرو خط و کتابت کے موضوع پر انہوں نے اپنے اخبار کے لیے ایک رباعی کہی جو ۱۷ جون ۱۹۳۸ء کے "طوفان" میں شائع ہوئی:

صلح کی کوشش ہو کیونکر کامیاب
مصلحت جب ہے حجاب اندر حجاب
لیگ نے جو کانگریس کو خط لکھے
آئیں بائیں شائیں ہے ان کا جواب[2]

شوکت تھانوی کی رباعیات میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا گیا ہے اور اس طرح ان کی رباعیات خواجہ الطاف حسین حالی کی رباعیات کے قریب تر ہو جاتی ہیں۔ ان کی رباعیات و قطعات میں اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی شگفتگی اور تازگی بھی ہے۔ شوکت تھانوی کے زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست اپنے عروج پر تھی اس لیے حساس اور باشعور انسان کو ان دونوں میں سے کسی ایک کی حمایت کرنا تھی۔ باشعور مسلمان مسلم لیگ میں شامل تھے۔ شوکت تھانوی کی تمام رباعیات اور قطعات مسلم لیگ کی حمایت میں اور کانگریس کی مذمت میں تحریر کی گئی ہیں جس سے شوکت تھانوی کا نظریہ سیاست آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ شوکت تھانوی: روزنامہ "طوفان" لکھنؤ، ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء۔

۲۔ شوکت تھانوی: روزنامہ "طوفان" لکھنؤ، ۱۷ جون ۱۹۳۸ء۔

شوکت تھانوی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اور ان کے کلام کی داخلی اور خارجی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے فن کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس میں اجتہادی شان پائی جاتی ہے۔ شوکت تھانوی نے بہت سے شاعروں کی زمینوں میں شعر کہے اور بعض اوقات تو ان کی تقلید پسندی بہت واضح انداز میں سامنے آتی ہے۔ اس تقلید پسندی کے باوجود وہ اردو شاعری کی وسعت اور ہمہ گیری کے لیے زبان و بیان کے نئے نئے تجربوں کو بہت ضروری خیال کرتے تھے لیکن چونکہ ان کے ادبی اشغال متنوع تھے اس لیے انہیں اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ اپنی ان مصروفیتوں کو چھوڑ کر صرف شعر و سخن کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کر دیتے۔ شوکت تھانوی نے روزی کمانے کے لیے صحافت کا انتخاب کیا تھا۔ اس لیے صحافت میں داخل ہوتے ہی وہ نثر پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ صحافت کے بعد ریڈیو سے تعلق رہا۔ وہاں بھی انہوں نے نثر ہی لکھی۔ اس طرح ان کی توجہ نثر پر زیادہ رہی اور شاعری کی طرف کم ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ ان کا ایک مجموعۂ کلام ”گہرستان“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی مجموعۂ کلام ۱۹۶۳ء تک یعنی ان کی زندگی میں منظر عام پر نہ آ سکا۔ جب کہ انہوں نے ناولوں، افسانوں اور مضامین کے مجموعوں کے ڈھیر لگا دیے۔

شوکت تھانوی کی صحافتی ذمہ داریوں اور ریڈیو کی مصروفیات کے باعث شعری سرمایہ بہت کم رہ گیا اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کی کبھی شعوری کوشش نہیں کی۔ جو کچھ لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ ان کی زیادہ تر غزلیں مصرعہ طرح پر کہی گئی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بیشتر غزلیں مشاعروں میں پڑھنے کی وجہ سے کہی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے نظمیں کہنا شروع کیں جن میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ ان نظموں کی وجہ سے شوکت تھانوی کو عوام و خواص میں حیرت انگیز شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے اس حسن قبول کو دیکھ کر دوسرے شعراء نے بھی اسی رنگ میں نظمیں کہنا شروع کر دی تھیں۔ شوکت تھانوی جس مشاعرے میں پہنچ جاتے تھے وہاں کسی اور شاعر کا رنگ جمنا مشکل ہو جاتا۔

شوکت تھانوی کی مقبولیت اور شہرت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنی افتاد طبع اور مزاج کو ہی نہیں پہچانا تھا بلکہ اس زمانے کے رجحان اور لوگوں کے مذاق کو بھی سمجھ لیا تھا۔ نثر میں ان کی شہرت چونکہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے شاعری میں بھی طنز و مزاح کو اختیار کر کے مقبولیت حاصل کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے عوام دکھوں اور مصیبتوں کا شکار ہیں اس لیے ان کے سامنے اس قسم کا ادب پیش کیا جائے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے رنج و غم کو بھول جائیں۔ چنانچہ انہوں نے نثر اور شاعری دونوں میں طنز و مزاح سے کام لے کر مقبولیت حاصل کی۔

شوکت تھانوی کی شاعری کے مطالعہ کے بعد اردو شاعری میں ان کے مقام کو متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلو اور ان کے فن کے گوناگوں محاسن انہیں جدید اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی تفسیر ہے، جس میں اصلیت اور صداقت ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے قابل ذکر رجحانات کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ شوکت تھانوی کے یہاں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر بہت سی نظمیں، رباعیات اور قطعات ہیں جو ان کی ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے عہد کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح میں قدم رکھ کر سماج میں پھیلے ہوئے زہر کی نشاندہی کی اور اپنی شاعری میں سماجی اصلاح کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاح میں طنز کا عنصر غالب ہے۔ اس طرح شوکت تھانوی کی شاعری میں موضوعات کی رنگا رنگی بھی ہے اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ بھی۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوکت تھانوی کی شاعری کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لیے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق 03478848884
سدرہ طاہر 03340120123
حسنین سیالوی 03056406067

چوتھا باب

مضمون نگاری اور افسانہ نگاری

انیسویں صدی میں لکھے جانے والے مضامین کو موضوعات کے اعتبار سے بڑی حد تک چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول رسم و رواج اور اصلاح معاشرہ، دوم مذہبی، سوم تاریخی اور چہارم اخلاق۔ بیسویں صدی کے مضمون نگاروں کے یہاں موضوعات میں بڑی تبدیلی نظر آتی ہے وہ معاشرے پر تنقید اور عام زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کو اپنے مضامین کا موضوع بناتے ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے جو تبدیلی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفیانہ نثر کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح نے اردو نثر میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اردو میں بہت سے ایسے ادیب نمایاں ہوئے جن کے مضامین کا اسلوب طنز اور مزاح کے لطیف امتزاج نے بنایا تھا۔ ایسے ادیبوں میں پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، سید امتیاز علی تاج، عظیم بیگ چغتائی، سجاد حسین، شوکت تھانوی، عبدالعزیز فلک پیما، کنہیا لال کپور، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری اور فکر تونسوی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان مزاح نگاروں کی نثر زندگی کے ایک ایسے دور میں شروع ہوئی جب دروں بینی کو اپنا وتیرہ بنانے کے بجائے ادیب کو زندگی کے ہنگاموں کا ساتھ دینا ہوتا تھا لیکن ان مزاح نگاروں نے زندگی کا ساتھ دے کر بھی لوگوں کے لیے حظ کا سامان مہیا کیا ہے۔ حظ کا یہ سامان مہیا کرنے والوں میں شوکت تھانوی نے اپنے لیے ایک خاص جگہ بنائی ہے اور مضمون، افسانے، ڈرامے، ناول اور صحافت کو اپنے فلسفۂ حیات کے پیش کرنے اور لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ بعض لوگوں نے شوکت تھانوی کو خالص مزاح نگار کہا ہے لیکن میرے نزدیک وہ چونکہ الفاظ کی بازیگری، رعایت لفظی، فقرہ بازی اور حاضر جوابی سے مزاح پیدا کرتے ہیں اس لیے انہیں ایک بذلہ سنج کہا جا سکتا ہے۔ بذلہ سنجی اور خالص مزاح نگاری کا فرق ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

> ”لفظی بازی گری سے پیدا ہونے والے مزاح کے سلسلے میں اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بالعموم الفاظ کے بگاڑ، رعایت لفظی، تضمین، تصرف، محاورہ اور دوسری لفظی شعبدہ بازیوں سے کام لے کر ”مزاحیہ نکتے“ پیدا کیے جاتے ہیں اور یہ طریق کار بہ حیثیت مجموعی بذلہ سنجی (Wit) کہلاتا ہے۔ وٹ کو برمحل حاضر جوابی، فقرہ بازی یا ”لفظوں کا کھیل“ سمجھنا چاہیے۔ لفظوں کا ایجاز و اختصار، بذلہ سنجی کی سب سے ضروری شرط ہے اور اس کے لیے یہ تضمین، تصرف اور محاورہ کے حربے استعمال کرتی ہے مگر مزاح اور بذلہ سنجی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مزاح ایک برق رو کی طرح سارے کے سارے مزاحیہ پارے میں جاری ہوتا ہے اور ہم کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں مزاح موجود ہے۔ اس کے برعکس بذلہ سنجی کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اس کو علیحدہ کر کے بھی دکھایا جا سکتا ہے“۔[1]

شوکت تھانوی نے پہلا مزاحیہ مضمون ”میٹھے چاول“ کے نام سے لکھا اس کا اعتراف انہوں نے ”مابدولت“ میں اس طرح کیا ہے:

> ”ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون ”میٹھے چاول“ کے نام سے لکھ دیا۔ یہاں عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس مضمون سے پہلے ہم نے کوئی مزاحیہ مضمون دیکھا یا سنا بھی نہ تھا“۔[2]

اس بات کو ”کچھ یادیں کچھ باتیں“ میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ”امین سلونوی صاحب کے بے حد اصرار پر ایک مضمون ”میٹھے چاول“ کے نام سے لکھا۔ یہ میری پہلی نثری کاوش تھی اور یہ میرا پہلا مضمون ہی مزاحیہ تھا“۔[3]

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا: ”اردو ادب میں طنز و مزاح“ ص ۹۹، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء، مکتبۂ عالیہ، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: ”مابدولت“ ص ۸۵، بار چہارم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۳۔ شوکت تھانوی: ”کچھ یادیں کچھ باتیں“ ص ۱۳، بار اول ۱۹۶۳ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

شوکت تھانوی کا یہ پہلا مضمون ان کے پہلے مجموعہ مضامین ‘‘موج تبسم’’ میں شامل ہے ۔ جو انیس سو بتیس عیسوی میں شائع ہوا ۔ ‘‘موج تبسم’’ کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> ‘‘نسیم صاحب نے ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ ‘‘موج تبسم’’ کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ یہ گویا ہماری پہلی کتاب تھی اور مصنف بننے کے شوق میں ہم بھوک پیاس بھولے ہوئے تھے ۔ کتابت کے دوران میں کاتب کا گویا ناک میں دم کر رکھا تھا ۔ طباعت کے وقت پریس میں نظر آتے تھے ، کاپیاں دیکھتے تھے ، پروف پڑھتے تھے اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح آج ہی کتاب ہاتھ میں آ جائے ۔ خدا خدا کر کے کتاب تیار ہوئی’’ ۔[1]

مضامین کا پہلا مجموعہ ‘‘موج تبسم’’ شوکت تھانوی کی پہلی کتاب تھی جسے نسیم انہونوی نے نسیم بک ڈپو سے شائع کی ۔ اس کی اشاعت کے بارے میں نسیم انہونوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

> ‘‘میں نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مضامین کتابی شکل میں مرتب کریں اور نسیم بک ڈپو سے اس کی اشاعت کی جائے ۔ شوکت صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور موج نسیم کے نام سے اپنے ابتدائی منتخب مضامین کو مرتب کرکے دیا ۔ اس کی اشاعت $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۱۶}$ سائز پر ہوئی ۔ پورے کپڑے کی جلد بنی اور سنہری الفاظ میں کتاب کا نام چھاپا گیا جس طرح شوکت تھانوی کا نام میرے تعاون سے پہلی بار کسی اخبار پر ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا گیا اسی طرح یہ فخر بھی مجھ ہی کو ملا کہ میں ان کی پہلی کتاب کا پبلشر بنا’’ ۔

شوکت تھانوی کی تحریروں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ تین چیزیں ان کی ادبی تخلیقات کا محرک بنیں ۔ اول یہ کہ ان کے ذہن نے اپنے ماحول کی بعض باتوں کا گہرا اثر قبول کیا اور ان کی طبیعت نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے اس تاثر کو دوسروں تک پہنچائیں ۔ اس گہرے تاثر اور احساس کے تحت انہوں نے جو کچھ لکھا وہ فنی حیثیت سے قابل تعریف ہے ۔

۱۔ شوکت تھانوی : ‘‘مابدولت’’ ص ۔ ۱۳۴ ، بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

۲۔ ماخوذ از نقوش لاہور ، شوکت نمبر ص ۳۹۳ ، ۳۹۴ ۔

دوسری چیز جو ان کی تحریروں کا محرک بنی وہ فرمائش یا فہمائش ہے یعنی دوسرے لوگوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ کچھ ان کے لیے لکھیں۔ ان تحریروں میں وہ بات نہیں جو کہ اول الذکر قسم کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ تیسری چیز مالی منفعت ہے جو ان کی اکثر تحریروں کا محرک بنی۔ اس تحریک کے تحت جو مضامین لکھے گئے ان میں بھی آمد کی بجائے آورد زیادہ ہے۔

شوکت تھانوی کے مضامین کو جس طرح معیار فن کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اسی طرح موضوع کے اعتبار سے بھی ان کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کے مضامین میں شوکت تھانوی نے معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ دوسری قسم کے وہ مضامین ہیں جن میں ادبی موضوعات سے بحث کی گئی ہے اور تیسری قسم کے وہ مضامین ہیں جن کا تعلق معاشرتی اور ادبی زندگی کے کسی خاص مسئلے سے نہیں۔ ان مضامین کو انشائیے کہا جا سکتا ہے۔

شوکت تھانوی نے جن مضامین میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے ان میں زیادہ ایسے ہیں جو گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کے متعلق شوکت تھانوی کے واضح نظریات ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین میں ان نظریات کا جا بجا اظہار ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میاں بیوی کو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے گنجائش اور ایک دوسرے کی بات کے لیے برداشت کا مادہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح زندگی آرام و سکون سے بسر ہو سکتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جن مضامین میں موضوع بحث بنایا گیا ہے ان میں بیوی کے رشتہ دار، ہم زلف، سالیاں، اشتہاری شادی، مردود خانہ، ہمسایہ، بیری اور ڈھیلے، دولہا بھائی، مرحومہ، تکیہ کا غلاف اور نو روپے تیرہ آنے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شوکت تھانوی کے ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی نفسیات کے ماہر تھے انہوں نے بعض مضامین میں عورتوں کی اس عادت کو اپنا موضوع بنایا ہے کہ وہ بات بات پر اپنے شوہر سے ناراض ہو کر میکے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہیں جس کا نتیجہ بعض اوقات بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ ایک اور چیز جو ازدواجی زندگی میں عام طور سے دیکھی جاتی ہے وہ یہ کہ عورتیں بعض اوقات مرد کی ہر بات پر اتنا روک ٹوک کرتی ہیں کہ مرد اس صورت حال سے

بدظن ہو کر اپنی بیوی کو ترقی کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگتا ہے۔ اسی طرح بعض مردوں میں بھی کچھ خامیاں ہوتی ہیں مثلاً وہ اپنی بیگم کے سامنے دوسری عورتوں کا خواہ مخواہ ذکر کرتے ہیں اور ان کی تیار کی ہوئی چیزوں کی تعریف کرکے عورت میں حسد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور عورت بھی اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے بجائے کسی دوسری عورت کی اچھی عادت کو اپنانے کے خواہ مخواہ اس سے حسد اور مرد سے لڑنا شروع کر دیتی ہے۔

گھریلو ماحول کی عکاسی کرنے کے علاوہ شوکت تھانوی نے بعض مضامین عورتوں اور مردوں کی اصلاح کے لیے بھی لکھے ہیں۔ ایک مضمون ''طوطی خانہ میں نقارہ'' میں عورتوں کی اس کمزوری کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ کسی ایک جگہ اکٹھی ہو جاتی ہیں تو وہاں سوائے شور و شر کے کچھ نہیں ہوتا۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''طوطی خانہ میں نقارہ کی آواز کے دب جانے کا اگر آپ کو منظر دیکھنا ہے تو کسی شادی یا غمی کی زنانی محفل کے منتظم بن کر دیکھ لیجیے کہ کیا ہوتا ہے۔ آپ ڈیوڑھی میں ٹاٹ کے پردے کے پاس کھڑے ہو کر گلا پھاڑ کر اپنی مردانہ آواز میں چیخیں گے ''رحیمن بڑی دیگ دے جا'' لیکن اس کے جواب میں اندر سے جو آوازیں آئیں گی وہ عیں غیں، غوں عوں غوں، ٹاؤں شاؤں، ہوہاؤں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گی۔ آپ پھر اس انداز سے نعرہ بلند کریں گے کہ گویا اب کی مرتبہ آسمان زمین پر آ رہے گا لیکن اندر سے جو جواب آئے گا، اس سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس گھر میں کوئی محفل نہیں ہے بلکہ جنگ عظیم ہو رہا ہے۔''[1]

شوکت تھانوی کے بیشتر مضامین کا موضوع فیشن اور اس کے برے نتائج ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں فیشن پرستی کو بھیڑ چال قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے پیش نظر وہ مناظر ہیں کہ ہمارے اس دعوے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کسی بڑے آدمی نے مونچھیں صاف کرا دیں

---

[1] ۔ شوکت تھانوی: ماخوذ از ''مسکراہٹیں'' ص ۹۷، لارک پبلشرز کراچی۔

> بس تمام ملک مونچھوں سے فارغ البال ہوگیا، کسی نے ''کرم خوردہ'' یعنی دم کٹی ہوئی مونچھیں رکھیں بس ہر ایک نے اپنی اچھی خاصی مونچھوں کو نذر مقراض کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس فیشن کو بھیڑ چال کہیے، کورانہ تقلید کہیے، بوزنہ نقالی کہیے غرض کہ جو کچھ کہیے صحیح اور یہ وبا ہندوستان میں تو اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔''[1]

شوکت تھانوی نے ''نو روپیہ تیرہ آنے'' میں عورتوں کی فیشن پرستی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض عورتیں مردوں کی خوشنودی کے لیے فیشن اختیار کرتی ہیں۔ اس مضمون میں بیگم صاحبہ نو روپے تیرہ آنے کی سرخی پوڈر اور کریم وغیرہ خرید کر لائیں اور ایک روز بن سنور کر بیٹھیں تو شوہر نے کہا کہ اسے یہ بہروپ پسند نہیں ہے۔ میاں بیوی میں تھوڑی سی تکرار ہوئی اور اس کے بعد بیوی نے شوہر کی خوشنودی کو مقدم سمجھتے ہوئے کہا:

> ''مجھے ضرورت کیا پڑی ہے کہ ان چیزوں کو خریدوں جب آپ ہی کو پسند نہیں ہیں تو میرے کس کام کی۔''
>
> ہم نے خوش ہو کر کہا:
>
> ''ہاں مجھے پسند تو کیا معنی انتہائی نفرت سی ہو گئی ہے اور اگر دو چار مرتبہ آپ اسی طرح یہ پاؤڈر وغیرہ لگا کر میرے سامنے آجائیں تو میں شاید آپ ہی سے گھبرانے لگوں۔''
>
> بیگم نے کہا:
>
> ''بھلا بتائیے تو مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے کہ میں ایسی چیزیں خریدوں۔''[2]

شوکت تھانوی نے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق بھی کئی مضامین مزاحیہ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کو معاشرتی نقطۂ نظر

۱۔ شوکت تھانوی: ''فیشن'' ماخوذ از موج تبسم، ص ۲۳۷، بار دوم صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''نو روپیہ تیرہ آنے'' ماخوذ از مسکراہٹیں، ص ۱۳۶، لارک پبلشرز، کراچی۔

سے ایک مضر چیز سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین ''یک نہ شد دو شد''، ''صاحب دل اولاد سے''، ''پیدائش روکو مہم'' وغیرہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس معاشرتی برائی کے خاتمہ کے لیے چند تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے عہد میں سینما بینی کا نیا نیا شوق ایک خبط کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اس لیے شوکت تھانوی نے کئی مضامین میں اس روش کو موضوع بنا کر لوگوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''فلم اسٹار دلہن''، ''فلم اسٹار'' اور ''فلمیریا'' میں سینما بینی کے مہلک اثرات اور نتائج کی نقاب کشائی کی ہے۔ ''فلم اسٹار دلہن'' میں ایک صاحب فلم دیکھ کر اسٹار سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اپنے تمام عزیز و اقارب کی ناراضگی کے باوجود جب وہ شادی کر لیتے ہیں تو ان پر اصلیت کھلتی ہے اور وہ فرماتے ہیں:

> ''ہے تو وہی مگر اب اپنے اصلی رنگ میں ہے اور فلم میں میک اپ کرکے آئی تھی۔ ہائے ری تقدیر۔''
> ہم نے کہا۔ ''میک اپ''؟ رضوان نے کہا ''میک اپ'' اندر سے آواز آئی۔ ''میاں دلہن بی بلاتی ہیں'' اور رضوان ''جہنم میں ڈالو دلہن بی کو'' کہتا ہوا آرام کرسی پر گر پڑا۔''

شوکت تھانوی کچھ عرصے کے لیے پنچولی آرٹ سے وابستہ رہے۔ اس لیے ''فلمیریا'' کے اثرات کا مشاہدہ بہ نفس نفیس کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو اس مرض کے بے شمار بیماروں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جو بجائے اسپتال جانے کے فلم کمپنیوں میں ہر روز بہت بڑی تعداد میں آیا کرتے ہیں اور اعتقاد یہ رکھتے ہیں کہ یہی ان کا دارالشفا ہے ایک سے ایک شریف زادہ ہے جن میں سے اکثر کے والد محترم کسی مسجد میں مؤذن، کسی مکتب کے ملا اور اچھے خاصے مرد مومن ہوتے ہیں اور بعد اقبال ان کا نام روشن کرنے کے لیے فلم ایکٹر بنا

۱۔ شوکت تھانوی: ''فلم اسٹار دلہن'' ماخوذ از مسکراہٹیں، ص ۲۰۵، لارک پبلشرز، کراچی۔

چاہتے ہیں۔''[1]

شوکت تھانوی اندھا دھند تقلید کو پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اس موضوع کو بار بار اپنے مضامین میں بیان کیا ہے۔ ''مسٹر''، ''لیڈر''، ''ملک التجار'' اور ''جس محلہ میں ہے ہمارا گھر'' میں انھوں نے علامہ اقبال سے وابستگی اور تقلید کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

> ''یہ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال سے وابستہ ہیں اور ہر ایک کو دعویٰ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے سب سے زیادہ مراسم اسی سے تھے۔ چنانچہ حکیم صاحب کے دوا خانہ کا نام ہے ''جواب شکوہ دواخانہ طب یونانی''۔ ہیئر ڈریسنگ سیلون پر سائن بورڈ لگا ہے ''اقبال ڈریسنگ سیلون''۔ پہلوان صاحب کے اکھاڑہ کا نام ہے ''اکھاڑہ حکیم الامت'' اور فالودے والے کی دوکان کے دروازے پر سفیدے سے لکھا ہوا ہے ''اقبال فالودے دی ہٹی'' سوڈا، لیمونیڈ۔ آلو، چھولے۔''[2]

شوکت تھانوی کے بعض مضامین لوگوں کی ان کمزوریوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جنھیں بداخلاقی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ مثلاً ''کالا برقعہ'' میں ان نوجوانوں کو برا کہا گیا ہے جو برقع پوش عورتوں کو چھیڑ کر اپنی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ''عالی جاہ'' میں انھوں نے معاشرت کے اس پہلو پر نکتہ چینی کی ہے جس کی وجہ سے لوگ ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور وہ پہلو ظاہری شان و شوکت کا ہے۔ ظاہری شان و شوکت سے نہ صرف بھانڈا پھوٹتا ہے بلکہ انسان رہا سہا وقار بھی کھو دیتا ہے۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے ساتھی نے خان سے کہا: خان صاحب اسی سی رقم کے لیے آپ اتنے بڑے آدمی پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟''
>
> خان نے بگڑ کر کہا:

---

[1] شوکت تھانوی: ''قلمبریا'' ماخوذ از وغیرہ وغیرہ ص ۱۱۳، بار دوم ۱۹۵۳ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

[2] شوکت تھانوی: ''جس محلہ میں ہے ہمارا گھر'' ماخوذ از شوکتیات، ص ۱۶۲، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

"اوہ ہم جانتے ہیں کتنا بڑا آدمی ہے۔ پچیس پچیس روپے کر کے چار دفعہ ہم سے قرض لیا۔ ہماری خوشامد کی، ہاتھ جوڑے کہ آج راشن نہیں ہے۔ آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے۔"

عالی جاہ نے جلدی سے کہا:

"خیر ان باتوں سے کیا غرض، تمہارا روپیہ معہ سود کے کل ہی تم کو دے دوں گا۔ میں خود اس قسم کا روپیہ رکھنا نہیں چاہتا اور نہ میں ایسے تقاضوں کا عادی ہوں۔"

خان نے کہا:

"کل کا حوالہ آج نہیں چلے گا آج بہت دنوں کے بعد باہر بیٹھے ملے ہو۔ میں تو اسی وقت سر توڑ کر روپیہ لے لوں گا۔"

عالی جاہ نے ہمارے ساتھی سے کہا ذرا ان کو یہ بتا دیجیے کہ یہ کس سے گفتگو کر رہے ہیں۔

خان صاحب نے اپنی لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے کہا:

"ہم جانتے ہیں ہم کس سے بات کر رہے ہیں اور آج ہم یہ بات پوری کر کے اٹھیں گے۔ ہمارا روپیہ نکالو تم اسی وقت۔"

"ایک ملازم کی ضرورت ہے" میں شوکت تھانوی نے ملازموں کے بارے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایماندار ملازم ملنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ تھوڑا سا اعتبار کرو تو چند ہی دن میں وہ ہاتھ دکھا کر فرار ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غالباً چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک بائیسکل جو ملازموں کے لیے رہتی تھی، دس روپے کا ایک نوٹ جس میں سے ان کو چائے کا ڈبہ لانا تھا ایک کمبل جو وہ اوڑھے ہوئے تھے، لے کر جو غائب ہوئے ہیں تو آج آتے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ تو لکھوا دی ہے مگر پولیس والوں کے پاس ایک یہی کام تو ہے نہیں کہ ان کے ہجر سے بے قرار ہو کر ان کی جستجو شروع کر دیں۔"

۱۔ شوکت تھانوی: "عالی جاہ" ماخوذ از شوکتیات، ص ۲۶، ۲۷، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: "ایک ملازم کی ضرورت ہے" ص ۱۲۳، ایضاً۔

''روزہ چور'' میں شوکت تھانوی نے ڈاکٹروں اور حکیموں پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بغیر تشخیص کیے مریض کو دوا تجویز کر دیتے ہیں خواہ مریض نے بیماری کا ڈھونگ ہی کیوں نہ رچایا ہو۔ ''اقربا ہوگئے مرے آگا،'' میں شوکت تھانوی ایک معاشرتی برائی کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جونہی کوئی شخص کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا ہے اس کے دور دراز کے عزیز یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے جائز و ناجائز ہر قسم کے کام کرے۔ اگر کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا تو اسے مجبوراً نوکری سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے جیسا کہ شوکت تھانوی لکھتے ہیں۔

> ''میں ان دونوں بزرگوں کو اسی کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آ کر ایک میز کے سامنے بیٹھ کر استعفیٰ لکھنے لگا کہ چونکہ میں پاکستان کے ساتھ اقربا نوازی اور خویش پروری کرکے غداری کرنا نہیں چاہتا، لہٰذا یہ استعفیٰ پیش کر رہا ہوں۔ انیس سو سنتالیس کے ہنگامہ میں میرے بہت ضروری اعزاء مارے گئے مگر غیر ضروری اعزاء چونکہ اب تک زندہ ہیں لہٰذا میں مستعفی ہوتا ہوں''۔[1]

''جگر کے مریض'' میں کورانہ تقلید پر نکتہ چینی کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ لوگ بالعموم کسی مشہور شاعر کی ظاہری چیزوں کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان جیسی سیرت و کردار پیش نہیں کر سکتے۔ یہ تقلید کرنے والے ہر مشہور شخص کے صرف ایک ہی پہلو کی تقلید کرتے ہیں۔ اس نکتہ چینی سے شوکت تھانوی کی مراد یہ ہے کہ ہماری قوم کے افراد تقلید کی بجائے اپنے حالات و واقعات کے مطابق اپنے لیے نئے راستے کا انتخاب کریں۔ ''السلام علیکم'' ! یہ مضمون رسالہ سروش لاہور کے سالنامے جنوری انیس سو اکتیس عیسوی میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں شوکت تھانوی نے تعلیم یافتہ طبقے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے مذہب اور اپنی معاشرت کا شعور بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس کے برعکس جاہل اور نچلے درجے کے لوگوں میں ابھی تک اپنے مذہب سے محبت ہے، وہ اپنی اسلامی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تعلیم یافتہ طبقہ السلام علیکم کو باعث شرم ور

---

[1] شوکت تھانوی: ''اقربا ہوگئے مرے آگا،'' ماخوذ از شوکتیات، ص ۱۹۱، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

گڈ مارننگ کو باعث افتخار تصور کرتا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

> ’’ہمارے نزدیک تو یہی راز ہے ’’السلام علیکم‘‘ کے متروک ہونے کا کہ لوگوں نے اس کو جولاہوں کا سلام سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اور جولاہے اپنے ’’سلاما لیکم‘‘ کو عادتاً اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ وہ تو کہیے کہ جولاہوں میں یہ بات اچھی ہوتی ہے کہ جو عادت پڑ جاتی ہے مشکل سے چھوٹتی ہے ورنہ السلام علیکم صرف مسجدوں اور علی گڑھ کالج میں رہ جاتا ۔ علی گڑھ کالج میں ڈھیلا مارنے کی طرح اور مسجد میں بم کی آواز بن کر ، لیکن شکر ہے کہ جولاہے حقہ کی طرح ، ’’سلاما لیکم‘‘ کے بھی عادی ہیں‘‘۔ [1]

شوکت تھانوی کے دوسری قسم کے مضامین وہ ہیں جن میں انھوں نے ادب اور ادب سے تعلق رکھنے والے مسائل کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے ۔ یہ مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے نہیں ہیں ۔ ان کا دائرہ صرف مشاعروں ، جلسوں اور زبان کے بعض مسائل تک محدود ہے ۔ ان مضامین میں شوکت تھانوی نے ادبی زندگی کے بعض ذاتی تجربات کو شگفتہ انداز بیان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بعض مضامین میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر ’’اردو میں انگریزی‘‘ اور ’’ہائے اردو‘‘ میں اردو کو نستعلیق رسم الخط میں لکھنے پر زور دیا گیا ہے اور رومن رسم الخط کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں ۔ ’’ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں ؟‘‘ میں پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی قومی زبان کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کے لیے قومی زبان بننے کے سب سے زیادہ قوی امکانات ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ’’پاکستان اردو کو اپنانے کے لیے اس وجہ سے بھی مجبور ہے کہ مسلم روایات جس حد تک اس دیسی زبان سے وابستہ ہیں شاید کسی اور زبان سے نہیں ہیں ۔ پاکستان میں اردو کی بقاء کے لیے یک جہتی کے ساتھ بہت کچھ کیا جائے گا ، مگر اس کے لیے ہم کو ابھی سے تیار رہنا چاہیے کہ اردو اب چھوٹی موٹی بن کر نہیں رہ سکتی ۔ اس کے حدود میں وسعت کے گوشے پیدا ہوں گے اور اس کی موجودہ

[1] ۔ شوکت تھانوی: ’’السلام علیکم‘‘ ماخوذ از بحر تبسم، ص ۵۵ ، بار اول ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۔

> شکل ایک حد تک ہمارے ہاتھوں نہ سہی زمانے کے ہاتھوں ضرور تبدیل ہوگی: بغیر اس کے، ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ خود اردو کو بھی پاکستان کی قومی زبان بننے کا حق حاصل نہ ہو سکے گا۔ مگر اب یہ انقلاب اس لیے خوش اسلوبی سے گزر جائے گا کہ مسلمانوں کو صوبجاتی تعصبات کو بھول کر اب صرف مسلمان ہونا شاید یاد آ چکا ہے اور وہ اغیار کے مقابلہ میں اپنوں سے یگانگت برتنے کے جذبے کو بیدار کر چکے ہیں”۔[1]

“ہندوستان میں اردو” اور “انیس سو ستاون عیسوی کا ایک مشاعرہ” میں شوکت تھانوی نے برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت میں اردو کی حالت زار بیان کرتے ہوئے اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو بولنا اور اردو لکھنا ایک ایسا جرم بن جائے گا جو قابل دست اندازی پولیس ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> “اس قسم کی خبریں بھی آنے لگیں گی کہ پولیس کی ایک جماعت نے ایک مکان پر چھاپہ مار کر پانچ ایسے اشخاص کو گرفتار کیا ہے جو پوشیدہ طور پر ناجائز زبان میں ایک دوسرے کو شعر سنا رہے تھے۔ پولیس نے ان کی تلاشی لے کر اشعار کی کتابیں بھی برآمد کیں۔ معلوم ہوا ہے کہ شہر میں کچھ دنوں سے اس قسم کی وارداتیں چوری چھپے ہو رہی تھیں۔ امید ہے ان پانچ گرفتار شدگان سے اردو کے مزید اڈوں کا بھی پتہ چلے گا جہاں اردو ناجائز طور پر کشید کی جاتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت اردو بولنے والوں کے بعض لائسنس ہولڈرز کے لائسنس بھی اسی سلسلہ میں منسوخ کرنے والی ہے”۔[2]

“انیس سو ستاون عیسوی کا مشاعرہ” میں شوکت تھانوی لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہوئے اردو زبان اور اردو شاعری کی حالت پر افسوس کرتے ہیں۔ مصنف کے میزبان، سراج الہ آبادی سے دیپک پرباگی بن چکے ہیں۔ وہ شوکت تھانوی کو وہاں کے حالات سناتے ہوئے گذارش کرتے

۱۔ شوکت تھانوی: “ہوا میں بھی کوئی گل ہوں؟” ماخوذ از وغیرہ وغیرہ، ص ۶۶ - ۶۷، بار دوم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: “ہندوستان میں اردو”، ماخوذ از شوکتیات، ص ۲۱۰، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

ہیں کہ ''بھیا میری دو تین باتیں گرہ میں باندھ لو۔ تفصیل تو گھر جا کر بتاؤں گا، فی الحال یہی کہنا ہے کہ یہ بات بھول کر بھی کسی سے نہ کہنا کہ تم کسی مشاعرے کی شرکت کے لیے یہاں آئے ہو۔ بس تم میرے بھائی ہو اور مجھ سے ملنے آئے ہو۔ پاکستان کی تعریف اور ہندوستان کی برائی جہاں تک ہو سکے مجھ سے بھی نہ کرنا۔ کسی کو شعر سنانے کی کوشش بھول کر بھی نہ کرنا، کسی سے شعر سنانے کی فرمائش بھی خطرے سے خالی نہیں ہے مختصر یہ کہ ادبی اور سیاسی ذکر تو چھیڑنا ہی نہیں۔

میں نے تعجب سے کہا ''عجیب مسخرے ہیں آپ بھی، اتنا بڑا مشاعرہ کر رہے ہیں کہ پاکستان سے اڑ کر آیا ہوں اور احتیاطیں اتنی شدید''۔ سہمے ہوئے انداز میں میرا بازو دبا کر بولے:

> ''وہ مشاعرہ بڑے راز کی چیز ہے۔ یہی تو مطلب ہے کہ کسی کو مشاعرہ کا شبہ بھی نہ ہونے پائے۔ میں گھر چل کر تم کو سب کچھ تنہائی میں بتا دوں گا''۔[۱]

''مادری اور سوتیلی زبانیں'' میں قومی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو محبت کرنے اور محبت کو پروان چڑھانے کی زبان قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''معلوم نہیں کیوں مختلف زبانوں کی تقسیم کچھ یوں ہو کر رہ گئی ہے کہ عبادت کرنے کے لیے عربی، گالی دینے کے لیے انگریزی اور محبت کرنے کے لیے اردو ہی کچھ مناسب اور برمحل زبانیں معلوم ہوتی ہیں''۔[۲]

شوکت تھانوی کے بعض مضامین کا موضوع شاعری اور مشاعرہ ہے ''واہ اچھے مرزا'' میں شاعری کو ذریعہ معاش بنانے کی روش اور شاعری میں سرقے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ''صدر مشاعرہ'' میں مشاعروں میں صدر کے طویل خطبات پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ خطبے اتنے طویل

۱۔ شوکت تھانوی: ''۱۹۵۷ء کا مشاعرہ'' ماخوذ از شوکتیات، ص ۲۱۸، ۲۱۹، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''مادری اور سوتیلی زبانیں''، ماخوذ از شوکتیات، ص ۵۳، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

ہوتے ہیں کہ زیادہ وقت خطبات کی نذر ہو جاتا ہے اور مشاعرہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "آج کل لاہور میں مشاعرے کے صدر کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جس نے "مشاعرہ" کو "مصادرہ" سا بنا کر رکھ دیا۔ ممکن ہے کہ مشاعرے کے عادی اس "مصادرہ" کو نہ سمجھ سکیں لہذا اس کی تشریح ضروری ہے۔ یہ بھی دراصل ایک قسم کا مشاعرہ ہوتا ہے مگر اس میں مشاعرہ کم اور صدر زیادہ ہوتا ہے۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے مگر ہم عرض کریں گے کہ ہو اس لیے سکتا ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے اور اس مصادرے میں شرکت کی ہے۔۔۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ مشاعرہ کم سے کم ہوتا ہے اور صدارت زیادہ سے زیادہ۔ صاحب صدر ہر شاعر کے متعلق ایک مستقل خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہیں۔"

اسی طرح کی جھلک شوکت تھانوی کے دوسرے مضامین میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جن میں "ایک شعر"، "ایک مشاعرے کی کہانی"، "سودیشی مشاعرہ"، "شاعر اور شاعری"، "مشاعرہ اور جوتا" خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ "مشاعرہ اور جوتا" کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> "جوتا چرانے کی رسم پہلے مسجد کے لیے مخصوص تھی لیکن جب نمازیوں نے نعلین در بغلین کا فیشن ایجاد کیا تو یہ رسم مسجد سے نکل کر شادی بیاہ کے موقعوں، دعوتوں، رقص کی محفلوں بلکہ ان تمام محفلوں میں جو فرنیچری نہیں بلکہ "فرشی" ہوں پھیل گئی یہاں تک کہ ادبی محفل یعنی مشاعرہ میں بھی اس کے جراثیم پائے جانے لگے"۔

"شاعر اور شاعری" میں شوکت تھانوی نے "ماضی" کے شاعروں کا "حال" کے شاعروں سے موازنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

> "دنیا کے ساتھ ساتھ شاعر بھی رنگ بدل رہے ہیں جو حالت شعراء

١۔ شوکت تھانوی: "صدر مشاعرہ" ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے، ص ٥٨، ٥٩۔ بار دوم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

٢۔ شوکت تھانوی: "مشاعرہ اور جوتی" ماخوذ از موج تبسم، ص ٨٨، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔

کی پہلے تھی وہ اب نہیں ہے اور جو اب ہے وہ کچھ دن بعد نہ ہوگی۔ ہم کو تو کچھ ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد عام انسانوں اور شاعروں میں مشکل سے امتیاز ہو سکے گا۔ ابھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان سے تو بس یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں ہر قسم کے انسان شاعر ہونے لگیں گے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ شاعر دنیا کے اور کسی کام کا نہ رہتا تھا۔ اس کو دن رات مصرع کے اوپر مصرع یا مصرع کے نیچے مصرع لگانے کی ایسی فکر ہوتی تھی کہ دنیا کے دوسرے کام کیسے، کھانا پینا تک دشوار ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن اب جو شاعر پیدا ہو رہے ہیں وہ وکالت بھی کرتے ہیں اور ڈپٹی کلکٹری بھی، پروفیسری بھی کرتے ہیں اور ایڈیٹری بھی، طباعت بھی کرتے ہیں اور تجارت بھی، ٹکٹ کلکٹری بھی کرتے ہیں اور کارکی بھی اور اس کے بعد شاعر بھی ہیں۔"[۱]

'یہ اقبالیے اور اقبالیات" میں اہل ملک کی اس روش پر تنقید کی گئی ہے کہ ہر شخص اقبال کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کوئی اس کی تقلید کو شہرت کا ذریعہ بناتا ہے اور کوئی اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے کلام اقبال کی غلط سلط تاویلیں کرتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کے متعلق یہ تو خیر طے ہی ہے کہ وہ پڑھے لکھے سمجھ داروں اور فکر و نظر والوں کا شاعر ہے تو اب آپ ہی بتائیے کہ کس کو اس بات کا شوق نہ ہوگا کہ وہ بس اس ذرا سی بات سے اپنے کو پڑھا لکھا، سمجھ دار اور اہل فکر و نظر ثابت کر دے۔ اس سلسلہ میں نہ تو کسی لائسنس کی ضرورت ہے نہ کسی پر کوئی قانونی پابندی عائد ہو سکتی ہے اور نہ اس کا امکان کہ کوئی صاحب امتحان لینے بیٹھ جائیں گے۔ لہذا آبروئے شیوہ اہل نظر جائے یا رہے مگر بوالہوس تو حسن پرستی شعار کرنے سے باز رہ نہیں سکتے اور کیوں باز رہیں، مفت میں ایک بھرم قائم ہو سکتا ہے تو کیوں نہ قائم ہو۔"[۲]

۱۔ شوکت تھانوی: "شاعر اور شاعری" ماخوذ از موج تبسم، ص ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔

۲۔ شوکت تھانوی: "اقبالیات" ماخوذ از وغیرہ وغیرہ، ص ۱۶۹، بار دوم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

"ماسٹر چھوٹے لال عاصم" میں شوکت تھانوی نے اشعار کی غلط تشریح کرنے والے اساتذہ پر تنقید کی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ شعری ذوق نہ ہونے کے سبب شعر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور طلبہ پر اپنی علمیت کا رعب ڈالنے کے لیے مشکل الفاظ میں تشریح کرتے ہیں۔ ماسٹر چھوٹے لال عاصم کی معلومات اسلامی تہواروں کے بارے میں بہت محدود ہیں، وہ بقرا عید اور عید الفطر کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں لیکن اپنے طالب علموں کو ایک ایسے شعر کی تشریح جس میں عید الفطر کا تصور ابھرتا تھا اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

> "خدا کے ایک پیغمبر تھے حضرت ابراہیم، جن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خدا کی راہ میں ہر قربانی دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جب ان کے اس دعویٰ کی خبر ہوئی تو اس نے آپ کو حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے اسمعیل کو اپنے ہاتھ سے خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ حضرت ابراہیم نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی اور اپنے بیٹے اسمعیل کو لے کر جنگل پہنچے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کو لٹا دیا اور چھری پھیرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابراہیم تم اپنے امتحان میں پورے اترے اور تمہاری قربانی میں نے قبول کر لی۔ میں تمہارا بیٹا نہیں چاہتا بلکہ تمہارے لیے بکرا بھیج رہا ہوں۔ اس کو تیس دن تک روزے رکھ کر عید کے دن قربان کر دینا۔۔۔ اسی طرف میرا اشارہ ہے کہ:
>
> روزہ داری فضل باری سے کٹی
>
> یعنی اگر فضل باری نہ ہوتا تو روزہ داری نہ کٹتی بلکہ اسمعیل کی گردن کٹتی مگر چونکہ فضل باری تھا لہذا کیا چیز کٹی؟ عرض کیا "روزہ داری"۔

"افسانہ نگار" میں افسانہ نگاروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر معمولی لکھا پڑھا شخص افسانہ نگار بن جاتا ہے اور وہ معیار سے گرے ہوئے اور فحش افسانے لکھتا ہے جس کی وجہ سے ہمارا ذوق سلیم زندہ

۱۔ شوکت تھانوی: "ماسٹر چھوٹے لال عاصم"، ماخوذ از شوکتیات، ص ۴۷، ۴۸، طبع سوم، اردو بک سٹال، لاہور۔

درگور ہو جاتا ہے اور یہ اخلاق سوز ادب قومی کردار پر بھی بہت برا اثر ڈالتا ہے۔ ''تکبند شاعر'' میں شوکت تھانوی نے تکبند شاعروں پر تنقید کی ہے اور ان کو سانپوں سے تشبیہہ دی ہے کہ جس طرح سانپ خطرناک اور زہریلا ہوتا ہے اسی طرح اس قسم کا شاعر اپنے کلام سے زہر پھیلاتا ہے اور معاشرے کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ''ادیبوں کی لڑائی'' میں کہا گیا ہے کہ نقاد دیانتداری سے تنقید نہیں کرے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ادیبوں کی لڑائی میں عام طور پر صرف ایک جذبہ کار فرما نظر آتا ہے یعنی اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اچھالنے کا جذبہ، اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ اسی اکلوتے جذبے کو آپ بہت سے ماتحت جذبوں میں تقسیم کر دیں مثلاً دوسروں کی غیر معمولی مقبولیت اور اپنے بجھتے ہوئے چراغ پر کسی ادیب کو اگر غصہ آ جاتا ہے تو وہ لڑ بیٹھتا ہے۔ اس لڑائی کو عام طور پر تنقید سے شروع کیا جاتا ہے اور چونکہ تنقید محض بہانہ ہوتی ہے لہذا تنقید تو برائے نام رہ جاتی ہے تو تو، میں میں البتہ زیادہ ہوتی ہے۔۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنی بات تو خیر کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی، رہ گئی خالص لڑائی وہ بھی کچھ یوں ہی سی ہو کر رہ گئی ہے یعنی نہ ادب نہ بے ادبی بلکہ سچ پوچھیے تو کچھ اناڑی پن سا دونوں حیثیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ گویا ارادہ تھا اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اچھالنے کا، مگر اچھل کر رہ گئی دونوں کی ٹوپی اور نام بدنام ہوا ادب اور لڑائی دونوں کا۔''[1]

''لکھنؤ''، ''تکلفات لکھنؤ'' اور ''موازنۂ لکھنؤ و لاہور'' میں لکھنوی تہذیب کے تکلفات کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادیب یا نقاد کو تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہیے۔

شوکت تھانوی نے ''ادبی مضامین'' مختلف رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لیے تحریر کیے ہیں اس لیے وہ اس قسم کے مضامین کو ''نمائشی مضامین'' کہتے ہیں۔ یہ نمائشی مضامین کس مجبوری کے تحت لکھے جاتے ہیں اس سلسلے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ ان کے تین قریبی دوست ''اقبال نمبر'' نکال رہے تھے اس لیے تینوں کے لیے مضامین

---

[1] شوکت تھانوی: ''ادیبوں کی لڑائی'' ماخوذ از لاہوریات، ص ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، بار چہارم، اردو بک سٹال، لاہور۔

لکھنا ازبس ضروری تھا۔ ایسا ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آ پڑا تھا یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا کہ لکھوانے والے خود کشی کریں گے۔ لہٰذا ایک مضمون لکھا سر کھپ کر۔ اب سوال یہ تھا کہ دوسرا اور تیسرا کیوں کر لکھا جائے۔ آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ اس مضمون کا درمیانی حصہ اگر پہلے لکھ دیا جائے۔ آخری حصہ درمیان میں لکھ دیا جائے اور ابتدائی حصہ آخر میں آ جائے تو معلوم ہوگا کہ جیسے نیا مضمون ہے۔ لیجیے دوسرا مضمون بھی ہو گیا۔ اب اسی فارمولے سے تیسرا مضمون تیار کر لیا کہ تیسرے مضمون میں آخری حصہ شروع میں تھا، درمیانی حصہ آخر میں تھا اور آخری حصہ کی جگہ پہلا حصہ تھا۔ یہ تینوں مضامین تین مختلف اقبال نمبروں میں چھپ گئے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ایک بہت بڑے نقاد قسم کے بزرگ نے صرف یہ لکھا کہ شوکت تھانوی کے یہاں خیالات و افکار کی تکرار اور تواتر کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔''[۱]

شوکت تھانوی کے تیسری قسم کے مضامین وہ ہیں جنھیں ہم انشائیہ قرار دے سکتے ہیں۔ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں اب تک جن خیالات کا اظہار ہوا ہے ان میں جانسن کے الفاظ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ''جانسن انشائیہ کو ایک ایسی ذہنی ترنگ سمجھتا ہے جس میں کسی نظم و ضبط اور ترتیب کا اہتمام نہیں ہوتا اور جس میں فنکار اپنے ناپختہ جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ جانسن بذات خود ایک ممتاز انشائیہ نگار تھا۔ لہٰذا اس کی انشائیہ کی تعریف میں ایک ناقد کا تجزیہ ہی نہیں بلکہ ایک انشائیہ نگار کا ذاتی نقطۂ نظر بھی شامل ہے۔''[۲]

شوکت تھانوی کے جن مضامین کو ہم انشائیہ کہہ سکتے ہیں ان میں چائے، میز، کھجلی، مطب، مروت، چوری، ہنسی، آزادی، مکھیاں، مینار میں کمند، کیرم بورڈ، اتوار، آئینہ کے سامنے، مشرقی اور مغربی کتا قابل ذکر ہیں۔

۱۔ شوکت تھانوی: ''اپنے مضامین اپنی نظر میں'' ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ، شوکت تھانوی نمبر، ص ۹۲، ۹۳۔

۲۔ ڈاکٹر آدم شیخ: ماخوذ از ''انشائیہ''، ص ۲۶۔ طبع اول ۱۹۶۵ء، مطبع رحیمی پریس، بمبئی ۸۔

شوکت تھانوی کے انشائیوں کی نمایاں خوبی اختصار، جامعیت اور عدم تکمیل ہے۔ وہ انداز بیان پر قدرت کی وجہ سے اختصار اور معلومات و مشاہدات کی وسعت کی بناء پر جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں تشریح، وضاحت اور تفصیل کی بجائے چند مسائل کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں، جس سے عدم تکمیل کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''چائے''، ''میز'' اور ''مروت'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

شوکت تھانوی کے انشائیوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے قائل ہیں۔ اور بالواسطہ انداز برتنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے لیے وہ دو صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ وہ ایسے لطیفے اور چٹکلے بیان کرتے ہیں کہ جس سے پس منظر کی ہستی ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے اور دوسری صورت یہ کہ وہ شخصیت کے کسی پہلو کو چھیڑتے ہوئے اشعار اور حکیمانہ اقوال کے چوکھٹے میں اس طرح فٹ کر دیتے ہیں کہ خوبی یا خرابی خود بخود نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان دونوں صورتوں کی تکمیل کے لیے شوکت تھانوی زیادہ تر مزاح سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحریروں کو شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ تبسم زیر لب کی بات پیدا ہو جائے۔ اس قسم کے انشائیوں میں ''کھجلی''، ''مکھیاں''، ''ہنسی''، ''چوری'' اور ''مینار میں گنبد'' خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔

شوکت تھانوی کے اخبارات و رسائل میں چھپنے والے، ریڈیو پر نشر ہونے والے اور کتابی صورت میں شائع ہونے والے مضامین کی تعداد دو سو چونتیس کے لگ بھگ ہے۔ ان میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جنہیں شوکت تھانوی نے فرمائشی، فہمائشی، نمائشی، معاشی اور پیدائشی مضامین کہا ہے اور ان کے معیار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر ان مضامین کو آپ ادبی کسوٹی پر جانچیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی، جو مضامین اس معاملات پر لکھے جائیں کہ جتنا ہی گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا پاؤ گے، ان مضامین کو ادبی معیار پر جانچنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے''۔[1]

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ، ص ۶۳۔

شوکت تھانوی نے یہاں انکساری سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بہت سے مضامین ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ بعض مضامین میں موضوع کی یکسانیت اور تواتر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''پڑوسی عذاب'' اور ''ایک مکان کی ضرورت ہے'' میں؛ ''بلائے جاں''، ''سمدھن'' اور ''دوست'' میں، ''ابوے کیوں کر؟'' اور ''ڈنیگر'' میں؛ ''اقبالیے'' اور ''اقبالیات'' میں موضوع کی یکسانیت نظر آتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنے زمانے میں ''زیادہ بکنے'' والے ادیب مانے جاتے ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ ان کی اس حیثیت سے ان کے پبلشرز نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے پہلے سے کتابی صورت میں شائع ہونے والے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا۔ مثال کے طور پر لارک پبلشرز، اورنگ زیب مارکیٹ، بند روڈ، کراچی نے ''خواہ مخواہ'' کے نام سے شوکت تھانوی کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ جبکہ یہ اٹھارہ مضامین ''طوفانِ تبسم'' میں جو شوکت تھانوی کا چوتھا مجموعۂ مضامین ہے، شائع ہو چکے ہیں۔ ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے چند اہم مضامین کا انتخاب کرکے اور چند نئے مضامین لکھوا کر ''برے بھلے'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں سترہ مضامین شامل کیے گئے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو کتاب کا نام ''برے بھلے'' کی بجائے ''سودیشی ریل اور دوسرے افسانے'' کر دیا گیا۔

اس بے احتیاطی کے باوجود شوکت تھانوی کے مضامین کا فنی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو بقول نیاز فتحپوری ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ:

> ''شوکت، ایک فطری ادیب و شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعہ کے بہت شائق ہیں اور ان کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن کھلنڈرے پن کے ساتھ، اور یہی وہ چیز ہے جس نے انھیں ''مزاح نگار'' بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت پطرس، رموزی، رشید اور عظیم بیگ چغتائی بہت مشہور ہیں۔ لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں''۔[1]

---

[1] ماخوذ از بحرِ تبسم، ص ۹، بار اول، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔

شوکت تھانوی ذہانت اور زندہ دلی کا مجسم پیکر تھے اور زبان کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط تھے ۔ وہ نازک سے نازک خیال کو سلجھا کر پیش کرتے تھے ۔ ان کے مضامین میں کوئی الجھاؤ اور ابہام نظر نہیں آتا ۔ وہ سیدھی سادی بات کو بلاوجہ دقیق اور فلسفیانہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے کہ پڑھنے والے کو مزاحیہ مضامین میں سوچنا پڑے کہ یہ مزاح ہے یا کچھ اور ہے ۔ شوکت تھانوی کے تراشے ہوئے جملے ، ان کے مزاح کا بے ساختہ پن ، ان کی ادائیگی اور ان کی بندشیں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

''ادیبوں کی لڑائی'' میں شوکت تھانوی نے ضلع جگت کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''فرض کر لیجیے کہ کوئی بے چارہ شاعر ایسا ہے جو شاعری ذوق کے لیے اور کپڑے کی دوکان پیٹ کے لیے کرتا ہے ۔ اب اس پر جن صاحب کو غصہ آئے گا وہ کچھ اس طرح کی تنقید فرماویں گے کہ 'جناب کے کلام میں ململ کی سی نرمی ، مخمل کی سی نفاست اور کمخواب کی سی دلاویزی تو بظاہر بہت ہے مگر عروض سے شاید آپ کو کوئی سروکار نہیں'۔ مصرعے بھی غالباً گز ہی سے ناپتے ہیں اور گرہ دو گرہ کی کمی بیشی کی چنداں پروا نہیں کرتے''۔[1]

شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کے زیادہ شگفتہ اور زیادہ مؤثر نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں جب ان کی ذہانت ، 'رنگینیٔ تخیل' اور 'ندرتِ فکر' کو ابھارتی اور ان کے میل جول سے لفظوں کا طلسم خانہ آباد کرتی ہے ۔ لفظوں کے اس میل ملاپ کی ان کے یہاں مختلف صورتیں ہیں ۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ہی جملے میں اتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے ۔ اس کی مثالیں خاکہ نگاری کے باب میں پیش کی جا چکی ہیں ۔

پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول :

> ''شوکت تھانوی کے بے تکلف اور بے ساختہ مزاحیہ اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں بات میں بات نکلتی ہے

---

[1] شوکت تھانوی : ''ادیبوں کی لڑائی'' ، ماخوذ از لاہوریات ، ص ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، بار چہارم ، اردو بک سٹال ، لاہور ۔

اور اس کے باوجود کہ وہ برابر بڑھتی چلی جاتی ہے اس کی لطافت اور شگفتگی میں فرق نہیں آتا اور آورد آورد ہونے کے باوجود آمد کا مزہ دیتی ہے۔ اس مزے دار آمد میں ہر جگہ لفظوں کا طلسم اپنا کام کرتا ہے۔ کبھی لفظوں کا تضاد، کبھی ایہام اور رعایت، کبھی فقرہ بازی، کبھی پھبتی اور معترضہ جملے اور کبھی محض لفظوں کی الٹ پھیر۔ لفظوں کو پرلطف اور پر معنی تبصرے اور تنقید کا ذریعہ بنانا شوکت کی شخصیت نگاری اور مزاح نگاری کی مشترک خصوصیت ہے۔"[1]

شوکت تھانوی عورتوں کی زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں "مونڈی کاٹے" کے تمام مضامین ان کی اس مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

شوکت تھانوی کی زبان و بیان کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ:

"شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کیے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آج کل ہماری انشاپردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس و ترکستان وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور کھٹیوں میں ہے! شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں۔"[2]

شوکت تھانوی کے مضامین کے اقتباسات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اسلوب پر کسی دوسرے ادیب کی چھاپ نہیں ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی سے ہر آدمی ہنسنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ سید احتشام حسین ان کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ ماخوذ از نقوش لاہور، شوکت نمبر ص ۳۲، ستمبر ۱۹۶۳ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ ماخوذ از دنیائے تبسم، ص ۱۱، حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر، دہلی۔

''شوکت کا مزاج بھی زندگی میں پروان چڑھا تھا اور اس کی سطح وہی تھی جو لکھنؤ کے ذہین اور طبیعت دار تعلیم یافتہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ لفظوں، فقروں اور جملوں سے مزاح پیدا کرنا، واقعات کے معمولی پیچ و خم سے ظرافت کے پہلو نکالنا، بات میں بات پیدا کرکے ہنسانا شوکت کے لیے معمولی بات تھی۔ ان کے تخیل کی جولانی واقعات کو وہ شکل دینے میں کامیاب ہو جاتی تھی جو امکانی حدوں کے اندر لطف پیدا کرے۔''

شوکت تھانوی کے چوتھے مجموعۂ مضامین ''طوفان تبسم'' کا مقدمہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے '' کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو ہر شخص سمجھے کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھیں تو بڑے بڑے معجز نگار ہزاروں دفعہ قلم دوات میں ڈبوئیں اور ویسا ایک شعر نہ لکھ سکیں، بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ یہی میرے دل میں ہے لیکن دل کی اس بات کو زبان قلم پر لانے والے ڈھونڈنے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں۔ دور کیوں جاؤ خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لو یہاں ہزاروں اخبارات اور سینکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہوگا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ مضمون نہ ہوتا ہو لیکن بس رہنے ہی دیجیے :

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں''

شوکت تھانوی کو اس بات کا احساس تھا کہ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ان کے مضامین کا معیار وہ نہیں رہا جو ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے ایک مضمون ''اپنے مضامین اپنی نظر میں'' بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

۱۔ ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، ص ۳۷ ، جولائی ۱۹۶۳ء۔

۲۔ ماخوذ از طوفان تبسم ، ص ۸ ، ۹ ، صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

> "اب اگر مجھ کو غم روزگار اور فکر معاش دونوں سے آزاد کر کے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی کم سخت جان مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں، باقی سب ردی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجیے اور میرے مضامین کو میری نظر بد سے بچائیے۔"[۱]

شوکت تھانوی کی اس رائے کے باوجود ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شوکت تھانوی اردو کے ایک صاحب اسلوب مضمون نگار ہیں۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر شگفتہ مضامین لکھ کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ موضوع اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ موضوع کو برتنے والا اسے اچھا اور برا بنا دیتا ہے۔ شوکت تھانوی نے علم اشیاء کے مقابلے میں مشاہدۂ اشیاء سے زیادہ کام لیا ہے۔ انداز بیان کا بے ساختہ پن اور زبان و بیان کی شگفتگی کی وجہ سے اردو مضمون نگاری کی تاریخ میں شوکت تھانوی کا نام ہمیشہ ادب اور احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

اردو ادب میں "افسانہ" کی عمر ایک صدی سے بھی کم ہے، لیکن دیگر اصناف ادب کی طرح یہ ابتدا ہی سے ارتقاء کے مراحل طے کرتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے اردو ادب میں ایک مستقل اور ممتاز صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "جس طرح انگریزی میں Fiction کا لفظ ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں افسانہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اور . . . . افسانوی ادب کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے وقت اس بظاہر سیدھے سادے لفظ کے ان گنت اور ایک سے زیادہ ایک رنگین تصور ہماری نظر کے سامنے آتے ہیں"۔[۲]

ڈاکٹر جعفر رضا نے "پریم چند کہانی کا رہنما" میں مختصر افسانہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

۱۔ ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ، ص ۹۳، شوکت تھانوی نمبر، جولائی ۱۹۶۳ء۔

۲۔ سید وقار عظیم: "نیا افسانہ"، ص ۱۳، اردو اکیڈمی سندھ، بندر روڈ، کراچی، ۵۵ء

> “کہانی اس صنف نثر کو کہتے ہیں جس میں کسی واقعہ، کردار یا تجربہ کو مختصر اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے قارئین یا سامعین کو تاثیر کی یک جہتی کا احساس ہو اور ان میں ادبی فن پارے کی تخلیقی انبساط مسحور کرتی رہے۔ اس لیے کہانی کے پیکر کو مرکزی نقطہ پر استوار ہونا چاہیے”۔[1]

شوکت تھانوی نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو انھوں نے افسانہ کی تعریف اور اس کی بنیادی خصوصیات کو مد نظر رکھ کر افسانے نہیں لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون کو افسانہ اور افسانے کو مضمون کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شوکت تھانوی “ما بدولت” میں لکھتے ہیں:

> “ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر “ترچھی نظر” کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ لیجیے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے”۔[2]

شوکت تھانوی کا پہلا افسانہ “امرود کا چور” رسالہ “ترچھی نظر” میں شائع ہوا۔ ماہر القادری ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> “پہلا افسانہ جس سے وہ دنیائے اردو میں متعارف ہوئے “امرود کا چور” ہے”۔[3]

شوکت تھانوی کا پہلا افسانہ “امرود کا چور” سیلاب تبسم میں ہے۔ یہ شوکت تھانوی کا تیسرا مجموعۂ مضامین ہے۔ پہلا مجموعۂ مضامین “موج تبسم” انیس سو تیس عیسوی میں شائع ہوا تھا۔ جس میں شوکت تھانوی کا مشہور افسانہ “سودیشی ریل” شامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر “مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ”، ص ۳۳، طبع اول، ۱۹۵۷ء، مطبوعہ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔

۲۔ شوکت تھانوی: “ما بدولت”، ص ۷۰، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۳۔ ماخوذ از نقوش، لاہور، “شوکت نمبر”، ص ۳۸۰۔

کہ شوکت تھانوی نے پہلے مجموعے کے لیے اچھے مضامین اور اچھے افسانوں کا انتخاب کیا اور ''امرود کا چور'' پہلا افسانہ ہونے کے باوجود تیسرے مجموعے ''سیلاب تبسم'' میں شائع ہوا۔

شوکت تھانوی ''سودیشی ریل'' کو کبھی مضمون اور کبھی افسانہ کہتے ہیں۔ ''ما بدولت'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اسی زمانہ میں رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے سالنامہ انیس سو تیس عیسوی کے لیے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ ''سودیشی ریل'' کے نام سے لکھا''۔[1]

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''انیس سو تیس عیسوی میں سودیشی ریل نامی جو مضمون لکھا تھا اس کی مانگ اب تک بہت زیادہ تھی، حالانکہ وہ چھپن مرتبہ مختلف زمانوں کے مختلف رسالوں میں چھپ چکا تھا''۔[2]

''کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرے لیے خود میرا ہی ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' اچھی خاصی مصیبت بن چکا تھا۔ یہ مضمون میں نے انیس سو تیس عیسوی میں رسالہ نیرنگ خیال، لاہور کے سالنامے کے لیے لکھا تھا''۔[3]

شوکت تھانوی نے ''سودیشی ریل'' کو دوستوں کے اصرار پر انیس سو چھتیس عیسوی میں ناول کی شکل دے دی اور اسے شوکت بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع کیا۔ مقدمہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری نے لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ افسانہ اب سے چھ سال پہلے نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ کے صفحات کی جان بن چکا ہے اور ملک میں عام طور پر مقبول ہوا تھا۔ اب مصنف نے اسے ضروری اضافہ و ترمیم کے بعد پہلے سے زیادہ دلچسپ

---

[1] شوکت تھانوی: ''ما بدولت''، ص ۱۲۷، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

[2] ایضاً، ص ۱۹۳۔

[3] شوکت تھانوی: ''کچھ یادیں کچھ باتیں''، ص ۱۲۱، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

بنا کر علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا یہ افسانہ دونوں حالتوں میں پڑھا ہے''۔[1]

شوکت تھانوی نے اسی کتاب میں ''عنوان بیان'' کے تحت تحریر کیا کہ:

> ''خود میری رائے ہو یا نہ ہو لیکن عام رائے یہ ہے کہ ''سودیشی ریل'' میرے مزاحیہ افسانوں میں سب سے بہتر افسانہ ہے جو میں نے رسالہ نیرنگ خیال، لاہور کے سالنامہ انیس سو تیس عیسوی کے لیے اب سے چھ سال پہلے لکھا تھا اور اس وقت تک ستاون مرتبہ مختلف زبانوں کے اخبارات و رسائل میں چھپ چکا ہے اور انگریزی کے علاوہ ہندی، مرہٹی، گجراتی، گورمکھی اور بنگالی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں''[2]۔

شوکت تھانوی کا یہ شاہکار افسانہ کن حالات میں لکھا گیا۔ اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن لکھتے ہیں:

> ''ہماری عادت تھی کہ ہم نوجوان اور نوخیز ادیبوں کو مختلف ڈھنگوں سے لکھنے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور بعض کو بعض سے اصلاح لے لینے پر بھی مجبور کرتے تھے.... شوکت صاحب نے کہا ''افسانہ لکھوں؟'' میں نے کہا افسانہ! افسانے تو بہت آ جاتے ہیں اور نظموں کے لیے تو جگہ نہیں نکلتی۔ نثری علمی مقالے کم ملتے ہیں لیکن اگر آپ مزاحیہ یعنی مزاحیہ افسانہ لکھیں تو بات دلچسپ رہے گی۔ اس انداز میں لکھنے والے عنقا ہیں اور آپ میں بڑی صلاحیت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مزاحیہ افسانہ جب پوری کوشش سے لکھا جائے تو وہ کامیاب نہ ہو۔ ذرا ذہن پر زور دے کر کوئی پلاٹ سوچیے اور مزاح کا رنگ بھرتے جائیے.... ہم نوجوان کو اکساتے رہے، شوکت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور کہا میں کوشش کروں گا۔ اس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سودیشی ریل کے مصنف سے بات چیت کر رہا ہوں یا

۱۔ ماخوذ از سودیشی ریل، ص ۱۲، بار اول، شوکت بک ڈپو، لکھنؤ۔

۲۔ ماخوذ از سودیشی ریل، ص ۱۲، بار اول، شوکت بک ڈپو، لکھنؤ۔

> میری اس تحریک کے نتیجہ میں ایک شاہکار مضمون کی تخلیق ہونے والی تھی۔ نیرنگ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے، مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا"[1]

انیس سو اٹھائیس عیسوی میں "سودیشی ریل" کے چھپنے سے دنیائے ادب میں تہلکہ مچ گیا اور شوکت تھانوی ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں داخل ہوئے۔ "سودیشی ریل" کے حوالے سے شوکت تھانوی کی اتنی شہرت ہوئی کہ شوکت تھانوی اور "سودیشی ریل" لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ شوکت تھانوی نے اس افسانے کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا، لیکن لوگ اس مضمون کے شائع ہونے کے پندرہ بیس سال بعد بھی اگر شوکت تھانوی سے ملتے ہیں تو وہ تعریف صرف "سودیشی ریل" ہی کی کرتے تھے۔ حالانکہ بقول شوکت تھانوی:

> "اس کے بعد میں نے اور بھی بہت سے مضامین لکھے، جن میں سے بعض خود مجھے "سودیشی ریل" سے زیادہ پسند تھے"۔[2]

لوگوں کی اس عادت کی وجہ سے شوکت تھانوی کو "سودیشی ریل" وبال جان معلوم ہونے لگی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ادبی رسائل کی طرف سے فرمائشیں کچھ اس قسم کی آتی تھیں کہ "ہمارے لیے آپ سودیشی ریل کی قسم کا ایک سودیشی ڈاک خانہ لکھ دیجیے" اور "ہمارے لیے ایک مضمون سودیشی یونیورسٹی کے نام سے لکھ دیجیے جو آپ کی سودیشی ریل کی قسم کا ہو" عاجز آ گیا تھا ان فرمائشوں سے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جلنے لگا تھا سودیشی ریل کے نام سے کہ اس ایک مضمون نے مجھ کو عجیب سودیشی بھنڈار بنا کر رکھ دیا تھا۔ لاکھ لوگوں سے کہتا کہ خدا کے لیے سودیشی ریل لکھنے کے اس قصور کو بخش دو، مگر توبہ کیجیے نہ وہ کہاں بخشنے والے تھے۔ خط و کتابت ہو یا آمنے سامنے کی

۱۔ ماخوذ از نقوش، لاہور "شوکت نمبر"، ص ۳۰۱ - ۳۰۲۔

۲۔ شوکت تھانوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" ص ۲۲۱، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

گفتگو، یہ بات وہ بات اور سودیشی ریل۔ اور میرا یہ حال کہ جس طرح بعض لوگ اِمرتی اور گلاب جامن سے چڑنے لگتے ہیں کہ جہاں اِمرتی اور گلاب جامن کا نام آیا وہ پٹری سے اترے اور لگے اول فول بکنے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت میں میں اپنے کو بھی مبتلا ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا“۔[1]

شوکت تھانوی کے افسانوں اور مضامین میں خط امتیاز کھینچنا کافی حد تک مشکل ہے چونکہ ان کے بالعموم ہر مضمون میں افسانے کا رنگ اور ہر افسانے میں مضمون کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی کا مقصد افسانہ نگاری یا مضمون نگاری نہ تھا بلکہ ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ لکھنا اور اپنی تحریروں میں مزاح کا رنگ پیدا کرنا تھا۔ وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ افسانے کی بنیادی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر شوکت تھانوی کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو پچاس کے لگ بھگ تحریروں کو افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے ”ترچھی نظر“، ”سرپنچ“، ”حریم“، ”نقوش“، ”ساقی“ اور ”نگار“ جیسے اہم رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ ان افسانوں کو شوکت تھانوی وقتاً فوقتاً مجموعۂ مضامین میں شامل کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے مجموعۂ مضامین ”موج تبسم“ (انیس سو بتیس عیسوی) میں ”سودیشی ریل“، ”خود کشی“ اور ”آسیبی محل“ تین افسانے شامل ہیں۔ تیسرے مجموعۂ مضامین ”سیلاب تبسم“ (انیس سو تینتیس عیسوی) میں ”امرود کا چور“، ”ہم زلف“، ”کھاکھرا پار“ اور ”شامت“ افسانے ہیں۔ چوتھے مجموعۂ مضامین میں ”افیونی“، ”لاٹری کا ٹکٹ“ اور ”آبنوس کا کندہ“ افسانے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں کچھ مضامین ایسے ہیں جنہیں مکمل طور پر افسانہ تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ان میں افسانوی رنگ جھلکتا ہوا ضرور نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ”ہنسی“، ”سالیاں“، اور ”نہ ہو میں بیوی“ وغیرہ۔ پانچویں مجموعۂ مضامین ”دنیائے تبسم“ میں ”اختلاج“، ”مرحومہ“، ”قلم فوجدار“، ”احمق اداکار“، ”شہتوت“، ”بردکھوا“ اور ”مردود خانہ ہمسایہ“ افسانے ہیں۔

---

[1] شوکت تھانوی: ”کچھ یادیں کچھ باتیں“، ص ۱۲۳، ۱۲۴، بار اول، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

شوکت تھانوی کی زیادہ تر کتابیں "مجموعۂ مضامین" کہلاتی ہیں صرف دو کتابیں افسانوں کے مجموعے کی حیثیت سے شائع ہوئیں ایک کا نام ہے "سودیشی ریل اور دوسرے افسانے" جسے ادارہ فروغ اردو لاہور نے شائع کیا اور دوسری کتاب کا نام ہے "کائنات تبسم" (افسانے) جسے علوی بک ڈپو، بمبئی نے جنوری انیس سو انسٹھ عیسوی میں شائع کیا۔ ان دونوں کتابوں کے افسانے دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان افسانوں کے مجموعوں میں بہت سے مضامین شامل کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "سودیشی ریل اور دوسرے افسانے" میں پانچ افسانے اور بارہ مضامین شامل ہیں اور جو افسانے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں وہ کئی مرتبہ مختلف رسالوں میں شائع ہونے کے علاوہ کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں۔ یہی حال "کائنات تبسم" کے افسانوں کا ہے اس میں صرف چار افسانے ہیں اور باقی سولہ مضامین ہیں۔

ان تفصیلات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو سکے کہ شوکت تھانوی کے مضامین میں افسانویت اور افسانوں میں مضمون کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ شوکت تھانوی کے افسانوں کا فنی تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے ہمیں ان کے افسانوں کے "پلاٹ" کو دیکھنا ہوگا کیونکہ نقاد افسانہ اور پلاٹ کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> "پلاٹ زندگی کے واقعہ کی ہوبہو شکل نہیں ہو سکتا اسے زندگی کے کسی واقعہ سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہونا پڑتا ہے۔ اس کی ترتیب میں جب تک تھوڑا بہت تصنع نہ ہو اس کی فنی شکل پیدا نہیں ہوتی۔ تصنع کی یہ ہلکی سی چاشنی ہی زندگی کے کسی واقعہ کو افسانہ بناتی ہے۔"[1]

شوکت تھانوی کے افسانوں کے "پلاٹ" سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں جس کی وجہ سے قاری پر ان کا مقصد واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ "جلوس" میں ایک مزدور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تین دن فاقہ میں مبتلا رہا تو سود خور مہاجن، زمیندار، مولانا، مندر کے پجاری اور مزدوروں کے لیڈر کے پاس باری باری بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے

---

[1] سید وقار عظیم: "فن افسانہ نگاری" ص ۱۵، طبع اول، ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی اکتوبر ۱۹۴۹ء۔

لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی تو وہ مندر کے باہر بیٹھ جاتا ہے اور شدید سردی کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ صبح کو لوگ جب اسے مرا ہوا پاتے ہیں تو اسے ''سادھو'' سمجھ کر اس کا شاندار جلوس نکالتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے یہ افسانہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے شوکت تھانوی اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا اس زمانے میں ایسے افسانے فیشن میں داخل سمجھے جاتے تھے اور ہر افسانہ نگار اس قسم کے افسانے شعوری یا لاشعوری طور پر لکھ رہا تھا چنانچہ بظاہر شوکت تھانوی نے بھی لاشعوری طور پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو قبول کرکے ایک شاہکار افسانہ تحریر کیا۔

''نمک مرچ'' میں شوکت تھانوی نے اس بات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے کہ مشرق کے رہنے والے جب مغربی معاشرت اختیار کرتے ہیں تو ان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے ان کا مشرقی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں اسلم کی پرورش خالص مشرقی ماحول میں ہوئی لیکن وہ اپنے آپ کو مغربی معاشرت میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لیے اسے چھری کانٹے سے کھانے کی پریکٹس کرنا پڑی۔

''خواہ مخواہ'' میں شوکت تھانوی نے کوئی اصلاحی مقصد یا اخلاقی مسئلہ بیان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی سے موضوع میں الفاظ کے ذریعے مزاح پیدا کرکے قارئین کو ہنسانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بھائی صاحب یہ مکان نہیں بلکہ مکان کا نصف حصہ ہے۔ نصف بہتر میں خود مالک مکان عبدالغفور صاحب، ٹھیکیدار رہتے ہیں اور اس نصف بدتر میں پہلے صرف میں رہتا تھا اب تم بھی رہو گے۔''[1]

اسی افسانہ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''ان کے یہاں ایک ایسا نامعقول ریڈیو ہے جو سننے کے لیے نہیں ہے بلکہ کان پڑی آواز سننے نہ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''[2]

''لاحول و لاقوۃ'' میں لکھنوی معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہے اس افسانے میں نواب صاحب کی مضحکہ خیز حرکتوں، کرداروں کے دلچسپ مکالموں اور مصنف کی بامحاورہ زبان سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی

۱۔ ماخوذ از نقوش لاہور شوکت، صفحہ ۲۴۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲۔

گئی ہے۔

''ان کی تصویر'' ایک خیالی افسانہ ہے لیکن شوکت تھانوی نے اس میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رکھی ہے اور پڑھنے والا یہ سوچتا ہے کہ زندگی دلچسپ واقعات کا مجموعہ ہے اور اس کے لیے قدم قدم پر ہنسنے کے سامان موجود ہیں۔

''آسیب'' کا مقصد بھی محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ افسانے کے تمام واقعات خیالی ہیں اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی میں اس طرح کی حالتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ افسانہ پڑھنے میں منہمک رہتا ہے۔ بیان کی شگفتگی اسے ذرا سی دیر کے لیے بھی کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ ''سودیشی ریل'' میں بھی بیان کی شگفتگی سے قاری کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شوکت تھانوی نے اپنے افسانوں کے لیے زندگی سے جو موضوعات چنے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم انسانی فکر اور عمل کے وہ پہلو ہیں جو تمسخر کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ انسان فکر اور عمل کے اعتبار سے جہاں اشرف المخلوقات ہے وہاں عجیب الخلقت بھی ہے۔ کوئی فن کار اگر دوسری چیز کو چھوڑ کر اس کی زندگی کے اس پہلو پر نظر رکھنے کو اپنی عادت بنا لے تو اسے اپنے فن کے لیے ایسا مواد مل جاتا ہے جو اسے دوسروں سے منفرد کر دیتا ہے۔ اب اگر فن کار میں اس مضحکہ خیز پہلو کو ذہانت کے ساتھ شگفتہ انداز میں پیش کر دینے کی قوت بھی موجود ہے تو یہ انفرادیت قابل رشک بن جاتی ہے۔ شوکت تھانوی کے افسانوں میں انفرادیت کا یہ پہلو ان کی فنی زندگی کے آغاز سے ان کی خصوصیت رہا ہے۔ انہوں نے عورتوں اور مردوں کے میک اپ کو بارہا اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے کہ وہ اس مصنوعی میک اپ کے ذریعے اپنی اصلیت کو کس طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے افسانے ''بردکھوا'' کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے۔ ایک مرتبہ تو حجام نے بال کاٹنے کے ساتھ داڑھی صاف کی۔ دوسری مرتبہ کوئی دو گھنٹے کے بعد خود ہم نے ''دست خود دہان خود'' کے اصول پر چلتے ہوئے احتیاطاً اس لیے نظرثانی کر لی کہ مبادا کوئی کھونٹی رہ گئی ہو، اس کے بعد غسل خانہ میں پیر سوپ کی ایک ٹکی ختم اور دوسری نصف سے زیادہ اس کوشش میں صرف ہوئی کہ کسی طرح سنگ موسیٰ کو سنگ مرمر بنا دوں۔ غسل خانہ میں دو گھنٹہ تک سخت محنت کرنے کے بعد

لباس بھی اسی اہتمام سے تبدیل کیا اور آئینہ کے سامنے نوک پلک کی احتیاط کے ساتھ سولہ سنگھار کیے ، اور جب اپنے متعلق ہر حیثیت سے اطمینان کر لیا تو ایک منصف مزاج غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے خود اپنے اوپر نظر ڈالی کہ آیا ہم کسی معزز گھرانے کے داماد اور خوش مذاق ، تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکی کے شوہر بننے کے قابل ہیں یا نہیں ؟ اور جب اس اعتبار سے بھی اپنے آپ کو خوب اچھی طرح پرکھ لیا تو اپنی ہونے والی سسرال کی طرف ایک مانگے کے موٹر پر روانہ ہوگئے“۔[1]

”بیگم کی جنت“ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے اپنی ازدواجی زندگی کا ایک ورق پیش کیا ہے ۔ وہ ایک رات دوستوں کی محفل میں گھر جانے کے باعث رات کے بارہ بجے کے بعد گھر پہنچتے ہیں تو بیگم صاحبہ کو اپنا منتظر پاتے ہیں ۔ ان سے گفتگو کے دوران میں تخیل کے بنائے ہوئے وہ مناظر پیش کرنے شروع کر دیتے ہیں جن میں عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنا دیتے ہیں ۔ اس افسانے کی تمام تر دلچسپی مزاحیہ فقروں کی وجہ سے ہے ۔ شوکت تھانوی نے اس افسانہ کے خیال کو طول دے کر ناول ”خدانخواستہ“ میں پیش کیا ہے ۔ اس موضوع کو ایک ریڈیو ڈراما ”کایا پلٹ“ میں بھی بیان کیا ہے ۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ شوکت تھانوی کو اخبارات ، رسائل ، ریڈیو ، دوستوں اور پبلشروں کی خاطر اتنا زیادہ لکھنا پڑا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں خیالات کی اس کمی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالات کی اس کمی کو الفاظ کے الٹ پھیر سے پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

افسانہ کو جانچنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس افسانے نے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر کتنا اور کیسا اثر کیا ؟ افسانہ نگار کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ جو اثر اپنے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی ۔ اگر افسانے میں یہ خوبی موجود ہے کہ اس سے ہر پڑھنے والے پر وہی جذبات اور کیفیات طاری ہوں جو مصنف پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک کامیاب افسانہ کہے جانے کا مستحق ہے ۔ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر لکھتی ہیں ”افسانہ کی ابتدا تو زندگی کے صرف ایک واقعہ یا حادثہ سے شروع ہوتی ہے اس لیے اس میں

---

[1] شوکت تھانوی : ”بر دکھوا“ ماخوذ از دنیائے تبسم ، ص ۱۲۳ ، حالی پبلشنگ ہاؤس ، کتاب گھر ، دہلی ۔

اتحاد اثر کی پابندی نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ واقعہ یا جذبہ کے بیان، کردار نگاری، فضا اور اسلوب بیان غرض ہر چیز سے افسانہ میں اتحاد اثر لانا چاہیے۔ جو تاثر مختصر افسانہ لکھنے کے وقت مصنف کے دل پر مسلط ہے اس کو ہر ترکیب سے قاری پر طاری کر دینا اس کا فرض ہے''۔[1]

پروفیسر سید وقار عظیم افسانہ میں وحدت تاثر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''افسانہ میں اتحاد اثر پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگار کو جس چیز کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں وہ ہمیشہ صرف ایک مقصد پر زور دے۔ ایک افسانہ میں ایک سے زیادہ مقاصد کی طرف متوجہ ہو جانے سے بہت سی فنی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں''۔[2]

شوکت تھانوی نے اپنے افسانوں میں مقصد اور انداز بیان کو ایک دوسرے سے اتنا ہم آہنگ کر دیا ہے کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہے۔ وہ چاہے سماجی اور معاشرتی اصلاح کے پیش نظر افسانے لکھیں یا صرف مزاح پیدا کرنے کے لیے، دونوں حالتوں میں قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے شوکت تھانوی نے شاعرانہ استدلال، تخیل، تشبیہات اور تراکیب کے استعمال سے کام لیا ہے۔ وہ ہر چیز میں مزاح کا پہلو تلاش کر سکتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں مزاحیہ انداز بیان اختیار کر کے وحدت تاثر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ''لاحول ولا قوۃ''، ''خواہ مخواہ''، ''قدم فوجدار''، ''احمق اداکار''، ''اختلاج''، ''خودکشی''، اور ''ایوفی'' ایسے افسانے ہیں جن میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

شوکت تھانوی کے افسانوں میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں ایک تو ایسے ہیں جو واقعات کی ترقی، ان کے مخصوص اثرات اور نتائج کے ساتھ نفسیاتی قوتوں کے اثر سے مجبور ہو کر بدلتے رہتے ہیں یا کسی خاص موقع پر یک دم بدل جاتے ہیں اور اپنی اصلی فطرت کو دوامی قدرت کے قسموں پر نثار کر کے ایک نئی اور زندہ بہتر یا بدتر زندگی

۱۔ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر: ''مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ'' ص ۵۰، ۵۱، طبع اول ۱۹۷۵ء، مطبوعہ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔

۲۔ سید وقار عظیم: ''فن افسانہ نگاری'' ص ۶۶، طبع اول، اکتوبر ۱۹۴۹ء ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی۔

قدم میں رکھ لیتے ہیں۔ دوسری قسم کے کردار وہ ہیں جن میں شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ وہ جیسے شروع میں تھے ویسے ہی آخر تک رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''افیونی''، ''خواہ مخواہ'' اور ''پرائیویٹ سیکرٹری'' کے کرداروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی نے اپنے افسانوں میں دوسری قسم کے کردار زیادہ پیش کیے ہیں۔

شوکت تھانوی نے کرداروں کی صورت و سیرت پیش کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اسی لیے وہ ہمیں ایسے مانوس اور جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے ان اشخاص سے ہم شب و روز دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ان کرداروں میں وہ اگر کچھ خصوصیت ایسی بھی بیان کر دیتے ہیں جن کی طرف ہماری توجہ اس سے پیشتر مبذول نہیں ہوئی تھی تو پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو تنقیدی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنے افسانے ''جلوس'' میں شوکت تھانوی نے ایک زمیندار کی شکل و صورت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''زمیندار صاحب شکل و صورت میں بھوندو استاد کے خاندان سے نظر آتے تھے۔ وہی پختہ رنگ وہی بے قابو توند۔ کچھ دانت ٹوٹے ہوئے، باقی میں سے کچھ اصلی اور کچھ نقلی۔ کھچڑی بال جو اس سیاہ رنگ پر اور بھی نمایاں تھے۔ ہاں اس بدتمیزی سے کھا رہے تھے کہ دہان مبارک سے ہر خوش مذاق کو اگالدان کا تخیل مل سکتا تھا۔ سر کے بالوں میں پڑا ہوا چنبیلی کا تیل کنپٹیوں سے بہہ رہا تھا۔''[۱]

شوکت تھانوی نے مکالمہ کے ذریعے سے واقعات کو بیان کرنے اور کردار نگاری کے جوہر دکھانے میں بڑی مدد لی ہے۔ وہ خیالی واقعات کے مکالموں کو بھی حقیقی اور فطری بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ جس مخصوص طبقہ کے فرد کی گفتگو قلم بند کر رہے ہیں وہ اس طبقہ سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ بقول ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر:

۱۔ شوکت تھانوی: ''جلوس'' ماخوذ از وغیرہ وغیرہ، ص ۲۶، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

> ''افسانہ نگار کو اپنی تحقیق میں کسی خاص طبقہ یا کسی خاص مقام کے حالات کو مکالموں کے ذریعے ظاہر کرنا مقصود ہو تو اس کا فرض ہے کہ اس طبقہ یا اس مقام کی ایک ایک چیز کا غور سے مطالعہ کرے اور قابل انتخاب باتوں کو دقت نظر سے دیکھے اور پھر ان کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بیان کے ذریعہ مکالموں میں ظاہر کرے چونکہ کرداروں کے جذبات کی بلندی و پستی، ان کے اضطرابات و انتشارات اور ان کی دماغی کیفیتوں کا اندازہ ہمیں ان کی آپس کی گفتگو سے ہوتا ہے۔''[1]

''نمک مرچ'' میں شوکت تھانوی نے دو ایسے کردار پیش کیے ہیں جنھوں نے کبھی یورپ کا منہ نہیں دیکھا لیکن عملی زندگی وہ اس طرح بسر کر رہے ہیں جیسے تمام عمر یورپ میں گذاری ہو۔ یہ دونوں کردار مرزا صاحب کی معرفت جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے دلچسپ مکالمہ سے قاری پر ان کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب نے کہا، مولوی صاحب! ہمارے اسلم میاں یوں تو خیر عجیب ہی سے انگریزی اٹھان اٹھائے گئے ہیں مگر ولایت نے تو ان کو بالکل ہی انگریز بنا دیا ہے۔''

مولوی صاحب نے خوشی سے سگار کا پورا کش لے کر کھانستے ہوئے کہا۔ ''اچھا اچھا تو آپ بھی میری طرح ولایت رہ چکے ہیں۔ کہاں رہتے ہوے آپ وہاں''؟ اسلم نے گڑبڑا کر کہا ''جی میں۔ وہاں تو وکٹوریہ ٹرمینس میں رہا ہوں''۔ مولوی صاحب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے بڑی خوبصورت جگہ ہے میں بھی شروع شروع میں وہیں رہا تھا، پھر، بھلا سا نام تھا اس کا گربی ریس ہاں ٹھیک تو ہے گربی ریس میں رہنے لگا۔''[2]

''جلوس'' شوکت تھانوی کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے اس میں رعایت لفظی، محاوروں کا استعمال اور [illegible] سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''خوہ مخواہ'' کا شمار بھی شوکت تھانوی کے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے اسی مضمون کو انہوں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ناول ''سسرال''

۱۔ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر: ''عصر افسانہ کا فنی تجزیہ'' ص ۱۹۵، مطبوعہ، اسرار کریمی پریس الہ آباد، طبع اول، ۱۹۷۵ء۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''نمک مرچ'' ص ۴۳، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں جا بجا ایسی مثالیں ہیں جہاں انہوں نے الفاظ کے ذریعے سے مزاح پیدا کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

> ''میں خود بھی فوراً نہانا چاہتا تھا اس لیے کہ لاہور سے کراچی آنے والے کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں گورکنوں نے بجائے مردے کے خود اسی کو دفن کر دیا تھا غلطی سے ، اور وہ اپنی اس تدفین کے بعد بمشکل تمام قبر سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا تھا چنانچہ آئینہ کے سامنے پہنچ کر خود اپنے ہی عکس پر عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار کا شبہ ہوا ، جو ٹھیکیداری کی مناسبت سے اس حلیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں خود اپنے ہی عکس کو سلام کرتا۔ گرد آلود عینک کو جو اتارا تو اپنے عکس کی اسی حرکت سے فوراً سمجھ میں آگیا کہ یہ کوئی اور نہیں ''خاکسار ہی ہے اور اگر سچ پوچھیے تو آج ہی ''خاکسار'' کے معنی بھی سمجھ میں آئے کہ بغیر لاہور سے کراچی آئے ہوئے شخص صحیح معنوں میں ''خاکسار'' بن ہی نہیں سکتا۔''

شوکت تھانوی افسانے کے آغاز سے ہی قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ افسانہ میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ بات کو طول دے کر بیان کیا جائے۔ وہ اپنی بات صاف ، دلچسپ اور تھوڑے سے لفظوں میں قاری کے ذہن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شوکت تھانوی تمہید میں دلچسپی پیدا کر کے قارئین کے دلوں پر قابو پانے کا فن خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں مثال کے طور پر ''خود کشی'' ، ''بیوی سلام کہتی ہیں'' ، ''پر دکھوا'' ، ''اختلاج'' اور ''احمق کردار'' کی تمہیدیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شوکت تھانوی نے ''خود کشی'' کی ابتدا اس طرح کی ہے :

> ''پیغامبر نے کہا۔ ''اس کی شادی ہو گئی''
> میں نے کہا۔ ''کیا بکتا ہے''
> اس نے پھر کہا ''اس نے شادی کر لی''

۱۔ ماخوذ از نقوش لاہور، شوکت نمبر ، ص ۲۰۵ ۔

> میں نے پھر کہا ''تو جھوٹا ہے''
> اس نے اپنی صداقت کے ثبوت میں ایک شادی کا چھپا ہوا دعوت نامہ دکھایا اور میں اف کہہ کر گر پڑا''[۱]

''بیوی سلام کہتی ہیں'' کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے :

> ''بیوی سلام کہتی ہیں'' ۔ یہ آٹھواں سلام تھا جو یہ لڑکی لے کر آئی تھی اور اب میری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ میں کیا جواب دوں ۔ جب سے اس مکان میں آیا ہوں میری حیثیت عجب ''وعلیکم السلام'' کی سی ہو کر رہ گئی ہے کہ صبح ہے تو ''بیوی سلام کہتی ہیں'' اور شام ہے تو ''بیوی سلام کہتی ہیں'' معلوم ہوتا ہے یہ سلام مجھ سے یہ گھر بھی چھڑوا کر ہی رہیں گے ۔''[۲]

تمہید کے ساتھ ساتھ اختتام یا انجام بھی افسانہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس پر بھی کہانی کا دار و مدار ہوتا ہے بقول ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر ''افسانہ کے انجام کو سلیقہ کے ساتھ پیش کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے ۔ اس مشکل سے صرف باشعور فنکار ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ۔ افسانہ کی اس آخری سیڑھی کو سلامتی کے ساتھ طے کرنا نہایت ہی نازک مرحلہ ہے انجام کو زیادہ سے زیادہ مختصر اور موثر ہونا لازمی ہے ۔''[۳]

شوکت تھانوی افسانہ کے خاتمہ کو ایجاز و اختصار سے کام لے کر زیادہ دلچسپ اور زیادہ موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ''سناؤں تمھیں بات اک رات کی'' کا اختتام اس طرح ہوا ہے :

> ''ہم نے ہانپتے ہوئے کہا ۔ ''ڈاکو چھت پر چڑھ بیٹھا تھا ۔'' بیگم نے کہا ۔ ''نہیں ڈاکو نہیں ، میں آپ کے پاس آئی تھی ۔ ڈاکو تو باورچی خانہ میں جا کر برتن سمیٹ رہا تھا''۔
> پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچی خانہ میں جا کر دیکھا تو

۱۔ شوکت تھانوی : ''خود کشی'' ماخوذ از موج تبسم ، ص ۲۵۶ ، صدیق بک ڈپو ، لکھنؤ ۔

۲۔ شوکت تھانوی : ''بیوی سلام کہتی ہیں'' ماخوذ از نمک مرچ ، ص ۵۲ ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

۳۔ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر : ''مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ'' ص ۲۰۳ ، طبع اول ۱۹۷۵ء مطبوعہ اسرار کریمی پریس ، الہ آباد ۔

معلوم ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا۔ "واہ، واہ، واہ"۔

بچے ہنس دیے۔

بیگم نے کہا "توبہ ہے اللہ"۔

میں نے کہا۔ "لاحول و لاقوۃ۔ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دونگا۔" اس کے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سو رہے تھے۔"[1]

شوکت تھانوی کے دوسرے افسانوں میں بھی اس طرح کے دلچسپ اختتام جس سے افسانے کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے، دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے "افیون کی جنت"، "عمدۃ الحکماء"، "نمک مرچ"، "جاسوس"، "احمق اداکار"، "بیگم کی جنت"، "لحاف اندر لحاف"، "سانچ کو آنچ" اور "دولت خانہ" قابل ذکر ہیں۔

شوکت تھانوی کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے یہ افسانہ زبردستی لکھا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود افسانہ نے افسانہ نگار کو مجبور کرکے اپنے تئیں اس سے لکھوایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں تاثر کی شدت انتہائی بلندی پر نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

> "شوکت تھانوی بے حد ہر دلعزیز تھے اور آج سے نہیں "سودیشی ریل" کے زمانے سے اب تک ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا آ رہا تھا۔ یہ مقبولیت انہیں دونوں ملکوں میں حاصل تھی۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں ان کی تصانیف کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی داں طبقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، اخبار کے کالم، ریڈیو فیچر، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ایک ایسے محکمے سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا اور لکھتے

۱۔ شوکت تھانوی: "سناؤں تمہیں بات اک رات کی" "ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے" ص ۹۸ - ۹۹، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

رہنا پڑتا ہے ، لکھنا ایک عادت ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے ۔ مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئیں تھیں ، اپنی شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں ۔''[۱]

شوکت تھانوی کے افسانوں بالخصوص سودیشی ریل کے بارے میں شاہد احمد دہلوی کی رائے ہے کہ :

''شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب ۲۵ سال ادھر کسی نے بتایا کہ ''نیرنگ خیال'' کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون ''سودیشی ریل'' پڑھنے کے لائق چھپا ہے ۔ رسالہ منگا کر پڑھا ، واقعی طبیعت پھڑک گئی ۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آجاتا ہے تو ہنسی آ جاتی ہے ۔ جب اس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتہ چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا ، یہ مضمون اس کا ترجمہ ہے ۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی ۔ اصل مضمون کا تراشہ حاصل کیا ۔ ترجمہ تو ترجمہ ان دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی ۔''[۲]

نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن نے شوکت تھانوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے :

''شوکت تھانوی ہر فن مولا تھے ۔ وہ جو کچھ چاہتے کر لیتے تھے ۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے لکھ لیتے تھے ۔ یہ خوبی آج اردو کے کتنے ادیبوں میں ہوگی جو جان محفل بھی ہو اور جان ادب بھی؟ ''[۳]

شوکت تھانوی کی پہلی برسی پریس کلب راولپنڈی میں منائی گئی ۔ جہاں آغا بابر نے ''شوکت تھانیدار'' کے موضوع پر ایک مضمون پڑھا جس میں وہ لکھتے ہیں :

''وہ کبھی کسی ایک راہ کا پابند نہ رہا ۔ جس راستے پر چلا بڑھتا ہی چلا گیا ۔ میں کبھی کبھی اسے ''شوکت تھانیدار'' کہا کرتا تھا کیونکہ وہ ادب کی ہر صنف پر ''تھانیداری'' کرتا تھا اس تھانیداری

۱۔ ماخوذ از نقوش لاہور ''شوکت نمبر'' ، ص ۳۴۵ ۔
شوکت تھانوی کے افسانوں بالخصوص سودیشی ریل کے بارے میں
۲۔ ماخوذ از نقوش لاہور ''شوکت نمبر'' ، ص ۳۵۸
۳۔ ایضاً ، ص ۴۰۵

کے لیے اسے محنت بھی کرنی پڑتی تھی، اسے بہت کچھ لکھنا ہوتا تھا۔ اتنا لکھنے کے لیے اسے رات کو جاگنا پڑتا تھا۔ صبح فلم والوں سے وعدے پورے ہو جاتے۔ ریڈیو والوں کی آبرو رکھ لی جاتی۔ رسالوں کا تنور شکم بھر دیا جاتا، پھر اسے ادھر ادھر سے چیک آتے رہتے۔ لباس اچھا پہنتا، اچھا کھاتا، اچھا رہتا۔ اچھے روابط پیدا کرتا یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے خود بھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر روابط پیدا ہوتے ہیں۔ شوکت کو راہ و رسم پیدا کرنے کا گر خوب آتا ہے۔ جو ہمارے دانشوروں میں اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔"[1]

شوکت تھانوی نے ایک ایسے دور میں جب افسانہ نگاری کے عہد شباب کا آغاز تھا اپنے لیے مزاحیہ افسانے کا راستہ منتخب کیا اور پورے خلوص کے ساتھ اسی راستہ پر چلنے کو اپنے فن کا منصب بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ کی تاریخ میں ان کے نام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ آغا بابر: "شوکت تھانیدار" ماخوذ از "ماہ نو" کراچی، اشاعت خاص، اکتوبر ۱۹۶۸ء، ص ۴۳، ۴۴۔

پانچواں باب

ناول نگاری

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں۔ ان کے کم و بیش سب ناول ان کے مخصوص مزاج اور مزاح کے حامل ہیں۔ انہوں نے انیس سو چونتیس عیسوی میں پہلا ناول لکھا۔ ترتیب اشاعت کے اعتبار سے ان کا آخری ناول انیس سو انسٹھ عیسوی کا ہے۔ ان کے پہلے اور آخری ناول کے درمیان پچیس برس کا فاصلہ ہے۔ انہوں نے پچیس سے زیادہ ناول لکھے۔ ان کی ناول نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کے اہم ادبی رجحانات کا جائزہ لے کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ بیسویں صدی کی ناول نگاری میں کون کون سے نئے رجحانات داخل ہوئے ہیں۔ ربع اول کے رجحانات میں جو رجحان سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے وہ ماضی پرستی کا رجحان ہے۔ گو یہ رجحان انیسویں صدی ہی میں تاریخی ناول نگاری کی صورت میں شروع ہو چکا تھا لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں اس رجحان نے ایک علیحدہ شکل اختیار کر لی تھی۔ ماضی پرستی کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کے تحفظ کا رجحان بھی اس دور میں ایک علیحدہ رجحان کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روایت پر تنقید کا رجحان بھی ناولوں میں نظر آتا ہے۔ روایت پر تنقید کے علاوہ نئی اور پرانی تہذیب کے امتزاج پر بھی زور دیا جانے لگا اور یہ بھی ایک رجحان کی صورت میں نمایاں ہوا۔

برصغیر میں بے اطمینانی کی کیفیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف انگریز اور ان کا تمدن تھا تو دوسری طرف برصغیر کے عوام اور ان کی تہذیب تھی۔ ایسے موقع پر ترک و اختیار کا مسئلہ اہم صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جان وین نے لکھا ہے کہ یورپ میں لازی ازم جب پھیل رہا تھا تو انگلستان کی ناول نگاری کا محرک یہی مسئلہ تھا کہ مختلف اور متضاد حالات میں کن چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے، کن کو چھوڑنا چاہیے، کون سی باتیں سماج کے لیے مفید ہو سکتی ہیں اور کون سی مضر[1]

---

1. John Wain . Essays on Literature and Ideas, p. 42, 1963, London

یہی مسئلہ برصغیر میں اس وقت موجود تھا ۔ اس عہد کی ناول نگاری میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ یہ تبدیلیاں دو تمدنوں اور تہذیبوں کے تضاد اور تصادم کی وجہ سے رونما ہوئی تھیں اس لیے اس عہد کی ناول نگاری میں متضاد اور متصادم قسم کے رجحانات ملتے ہیں کیونکہ نئے حالات کی وجہ سے نئی اور پرانی قدروں میں شدید کشمکش ہو رہی تھی ۔ اس دور کی ناول نگاری میں ہر ایک ناول نگار کے پاس قدروں کی یہ کشمکش اور تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ربع ثانی کے ابتدائی دس سال کی ناول نگاری میں ہم کو ایک نئے ذہن اور ایک نئے شعور کا احساس ہونے لگتا ہے جو ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد کی ناول نگاری میں ایک شدید صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ گویا ربع ثانی کے دس سال ترقی پسند تحریک کی ناول نگاری کا پیش خیمہ تھے ۔ اس دور میں روایات سے رشتہ توڑ کر نئے طریقوں کو اپنانے اور نئے تجربے کرنے کا رجحان ملتا ہے اب انسان کی نگاہیں ماضی کی بجائے مستقبل کی جانب رہنے لگی ہیں کیونکہ حال کی غیر یقینی کیفیت نے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔

بیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں ، نئی ایجادوں ، نئے نظریوں اور نئے خیالات نے سوچنے کے انداز کو بدل دیا تھا اس لیے ناول کی ہیئت میں کافی تنوع ہوا ۔ چونکہ اس عہد میں دروں بینی بڑھ گئی تھی ، اس لیے ناول کی ایسی ہیئت اختیار کی گئی جو زیادہ سے زیادہ اندرونی احساسات اور جذبات کی عکاسی کر سکے ۔ اس دور میں ہیئت کے تنوع کے ساتھ ناول کی قسموں میں بھی تنوع نظر آتا ہے ۔ یہ تنوع اس دور میں اس لیے نمایاں نظر آتا ہے کہ مختلف ناول نگاروں نے اختصاصی طور پر مختلف اقسام میں سے کسی ایک قسم کو اپنایا ۔ قاضی عبدالغفار نے عشق پیشہ عاشق و معشوق کو موضوع بنایا ۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے مزاحیہ ناول لکھے ۔ ظفر عمر نے جاسوسی ناول لکھے ۔ اس طرح کی مختلف قسموں میں سے کسی ایک رنگ کو اپنانے کا رواج بھی اس دور میں عام ہونے لگا ۔ مزاحیہ ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں :

> ''یوں تو سجاد حسین ایڈیٹر ''اودھ پنچ'' نے سب سے پہلے مکمل مزاحیہ ناول ''حاجی بغلول'' لکھا لیکن مزاحیہ ناول نگاری، کو بیسویں صدی میں ایک مستقل حیثیت اور صورت دینے میں عظیم بیگ چغتائی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ بعد میں شوکت تھانوی نے بھی یہی راستہ اختیار

کیا اور یوں اردو میں مزاحیہ ناول نگاری کا سلسلہ قائم رکھا ۔''[1]

مزاحیہ ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سید علی حیدر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

> ''اسی دور میں بعض مزاحیہ ناول بھی لکھے گئے ۔ اپنے اسلوب کی جاذبیت کی بنا پر بے حد مقبول ہوئے ۔ ان ناولوں میں نہ صرف تفریحات کے پہلو پیش کئے گئے بلکہ ان میں سماجی حقائق کو طنزیہ پیرائے میں تجزیہ کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے ۔ اسی طرح کے ناولوں کو قبول عام کا درجہ دلانے میں عظیم بیگ چغتائی کی جنت کا بھوت ، خانم ، چمکی اور شوکت تھانوی کی خدا نخواستہ ، معمہ خاتون اور بڑ بھس اہم ہیں ۔''[2]

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں ۔ اسی لیے انہوں نے مزاحیہ ناول لکھے ۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ اپنے قاری کو اس کشمکش غم و الم اور امید و بیم کی دنیا سے نکال کر گھڑی دو گھڑی کے لیے ہنسا کر ان کو خوشی و مسرت کا سامان فراہم کریں ۔ چنانچہ وہ ناول مزاح کی خاطر اور پڑھنے والے کی تفریح کی غرض سے لکھتے ہیں اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایسے وسائل سے کام لیتے ہیں جن پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے ۔

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں مزاح کے تمام حربوں سے کام لیا ہے ۔ کچھ ناولوں میں اسلوب بیان کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ میں موضوع کے اعتبار سے ۔ ''خدانخواستہ'' کا موضوع ہے کہ اگر عورتیں پردہ کے باہر آ جائیں اور مردوں کو پردہ نشین ہونا پڑے ، تو کیا ہو ؟ اس میں موازنہ اور صورت واقعہ کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ناول میں ایک جگہ تھانیدارنی کے لڑکے کی شادی کا ذکر ہوتا ہے تو نازکستان کے رواج کے مطابق لڑکی کے بجائے لڑکے کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے ۔

۱۔ ڈاکٹر یوسف سرمست : بیسویں صدی میں اردو ناول ، دسمبر ۱۹۷۳ء ، حیدر آباد ، آندھرا پردیش ، ص ۲۶۲ ۔

۲۔ ڈاکٹر سید علی حیدر : اردو ناول سمت و رفتار ، طبع دوم ۱۹۷۹ء ، الہ آباد ، ص ۲۱۲ ، ۲۱۳ ۔

جب رخصت کا وقت آیا تو تھانیدارنی صاحبہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی ہیں :

"ظفر میاں ! اب میری عزت تمہارے ہاتھ ہے، تم اب اپنے گھر جا رہے ہو مگر میں اسی وقت تک تم سے خوش ہوں جب تک کہ تم اپنی اہلیہ کے اطاعت گزار رہوگے ۔ آج سے ان کی خوشی تمہاری خوشی ہے اور ان ہی کو خوش رکھ کر تم اپنی دنیا اور عقبیٰ دونوں کو سنوار سکتے ہو"۔[۱]

موازنہ اور صورت واقعہ کے علاوہ شوکت تھانوی نے الفاظ کی مدد سے جا بجا مختلف طریقوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کہیں مکالموں کی شوخی اور بے تکلفی سے ، کہیں محاوروں کے بے ساختہ استعمال سے ، کہیں فقرے بازی سے ، کہیں روز مرہ کے استعمال سے اور کہیں الفاظ کے الٹ پھیر سے ۔ شوکت تھانوی نے ایک ناول "انشاء اللہ" میں الفاظ کا مزاح پیدا کیا ہے ۔ مولوی رجب علی سے جوانی میں تو اکثر لغزشیں ہوتی رہیں لیکن پنشن کے بعد سارا وقت یاد خدا میں گزرتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"پولیس کی نوکری ، بے چین دل ، رشوت کی آمدنی آخر انسان کیونکر اپنے قابو میں رہ سکتا ہے ۔ مگر وہ تمام حالات پنشن لے چکے تھے ۔ جوانی پنشن لے چکی ، دل کی ہر امنگ پنشن لے چکی ۔ حد یہ ہے کہ تمام پریاں بھی پچپن سالے میں آ چکی تھیں جو اس وقت غارت گر ایمان کہلاتی تھیں اور چونکہ اب کوئی ایمان کا غارت گر نہ رہا تھا ۔ لہٰذا ایمان ہی ایمان تھا"[۲]

شوکت تھانوی ذومعنی الفاظ استعمال کرکے مزاح پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں ۔ "کتیا" میں طلعت کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب ان کے رشتہ دار ہیں اور صرف ان سے ملنے کے لیے نینی تال آئے ہیں تو طلعت اور اختر کی بات چیت میں جو ذومعنی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ آپ بھی دیکھیے :

"طلعت نے پھر قصہ وہیں سے شروع کر دیا ۔

۱۔ شوکت تھانوی : "خدانخواستہ" ، ص ۹۷ ۔

۲۔ شوکت تھانوی : "انشاء اللہ" ، ص ۱۱ ۔

''ہاں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ میرے لیے کیوں آئے تھے'' ہم نے کہا۔ ''تم کو دیکھنے، دیکھ کر پسند کرنے اور پھر شادی کا پیغام بھجوانے''۔

طلعت نے جھینپ کر گردن جھکاتے ہوئے کہا ''اوں! اچھا تو اب میں جا رہی ہوں''

ہم نے گڑبڑا کر کہا ''یہ غلط ہے، چور سے اقبال جرم کرانے کے بعد عدالت کو چاہیے کہ فیصلہ بھی سنا کر اٹھے''۔
طلعت نے شوخی سے کہا ''چور گرفتار کیا جائے''
ہم نے کہا ''اور اسے حبس دوام کی سزا بھی دی جائے گی یا نہیں؟''
طلعت نے کہا ''یہ فیصلہ ہائی کورٹ کرے گی، میرا فیصلہ تو یہی ہے کہ چور گرفتار ہو کر جلد سے جلد غریب خانہ کی جیل میں آ جائے''۔ ۱

''بکواس'' میں نعیمہ اور جمال کی نوک جھونک بھی کافی دلچسپ ہے۔ یہ وہ موقعہ ہے جب شرف صاحب کی بے وقوفی کے بارے میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ جمال نے نہایت عبرت انگیز صورت بنا کر کہا، ''حالی نے سچ کہا ہے ع

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

نعیمہ نے ہنس کر کہا، ''مجھ کو اس مصرعہ پر ہمیشہ ہنسی آتی ہے۔ کتنا عجیب و غریب تصور ہے کہ عشق بیٹھا ہوا ہے دسترخوان پر اور اکثر قومیں بھنی ہوئی اس کے سامنے رکھی ہیں اور وہ کھا رہا ہے سب کو''۔

عرفان نے کہا، ''خیر قوموں کی تو نہیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع

اے عشق تو نے اکثر لوگوں کو کھا کے چھوڑا

مقبول نے بڑا ترس کھاتے ہوئے کہا ''Poor Fellow''۔ جمال نے کہا ''آج کل ہر طرف تو یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ''Grow More Food'' اور عرفان صاحب نے اپنا یہ مشن شروع کر رکھا ہے کہ ''Grow More Fools''۔

نعیمہ نے کہا ''غلہ غذائے معدہ ہے تو بیوقوف غذائے روح۔ جمال نے

۱۔ شوکت تھانوی : ''کتیا''، ص ۱۰۳-۱۰۵۔

ترکی بہ ترکی کہا "خصوصاً جب کوئی روحانی بیوقوف بنا ہو"۔ [۱]

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے کبھی کبھی لطیفہ گوئی سے بھی کام لیا ہے۔ "کتیا" میں ایک جگہ طلعت اپنے دوستوں کو بتاتی ہے کہ ان کے گھر ایک مہمان آئے ہوئے ہیں جو انتہائی فرسودہ لطیفے سنانے کے ماہر ہیں۔ انہوں نے آج ایک تو غالب کے آموں والا لطیفہ سنایا اور ایک یہ:

> "راستہ میں ایک مسافر سے اس کے بچے نے کہا کہ میری شادی کر دیجیے۔ مسافر نے کہا، اچھا بتاؤ کس کے ساتھ کروگے۔ اس بچے نے کہا "دادی اماں کے ساتھ" مسافر نے اس کو ڈانٹا کہ "تو میری ماں سے شادی کرے گا" اس پر میں نے کہا کہ حضرت آپ نے بھی تو اس کی ماں سے شادی کی ہے"۔ [۲]

"کارٹون" میں کہکشاں کی شکل و صورت کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں ان سے عبارت میں ایک حسن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تشبیہات آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

> "وہ تو خود واقعی اس قدر حسین تھی کہ اگر اس نے ہماری اس قدر توہین نہ کی ہوتی تو شاید ہم خود اس کو دیکھنے کے بعد مارے شرم کے اگر ڈوب نہ مرتے تو کم سے کم امیدواری سے دست بردار ضرور ہو جاتے۔ سنجیدہ بن کر بیٹھے تو معلوم ہوا کہ وینس کا مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ بات کرے تو معلوم ہو کہ جمنا کی لہروں میں تاج محل کا عکس متحرک ہے، مسکرائے تو محسوس ہو کہ چاندنی پھیل رہی ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑے تو ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آ جائے گویا جنت میں قوس قزح کا رقص ہو رہا ہے۔ لہرا در روکھے سنہرے بال لہراتی ہوئی چلی آتی تھی۔ خدا کا کوئی منکر اگر ہم کو مل جاتا تو ہم کہکشاں کو دکھا کر اس سے پوچھتے کہ اگر خدا نہیں ہے تو اس کی قدرت کا یہ نمونہ کہاں سے آیا"۔ [۳]

۱۔ شوکت تھانوی: "بکواس"، ص ۹۰، ۹۱۔

۲۔ شوکت تھانوی: "کتیا"، ص ۶۳۔

۳۔ شوکت تھانوی: "کارٹون"، ص ۳۳۔

اس عبارت میں تشبیہات کے استعمال کے ساتھ ساتھ کہکشاں کے حسن کی ایک بھرپور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ شوکت تھانوی نے بیشتر ناولوں میں اس قسم کی تصویر کشی کی ہے جس سے کسی شخصیت کے تمام نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں۔

"غزالہ" میں بھی الفاظ کی مدد سے جا بجا مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لفظی رعایتیں پیدا کرکے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ایک مثال:

> "آنند نے جلدی سے کہا: "وہی مطلب ہے میرا۔ مجھے ان کی وفا شعاری پر شبہ تھوڑی تھا۔ قاصد ہی لنگڑا ہو تو وہ بے چاری کیا کریں۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ ڈاک کا عذر لنگ پیش کریں گے"۔[1]

یہاں شوکت تھانوی نے لنگڑا قاصد اور ڈاک کا عذر لنگ میں لفظی رعایت پیدا کی ہے۔

ہر بڑے ادیب کی طرح شوکت تھانوی نے بھی زندگی کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے ظاہر و باطن پر غور و فکر کیا ہے اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا موضوع چونکہ انسانی زندگی کے تہ در تہ حقائق اور اس کے گوناگوں مسائل ہوتے ہیں اس لیے شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں ان مسائل کو کہیں مربوط اور واضح اور کہیں غیر مربوط اور مبہم صورت میں پیش کیا ہے۔ شوکت تھانوی معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اپنے معاشرے سے ہر اس رسم کو ختم کر دینا چاہتے تھے جو فضول خرچی کو تقویت پہنچاتی ہو۔ بہت سے گھرانوں میں سالگرہ کی رسم کو بہت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ شوکت تھانوی "مولانا" میں لکھتے ہیں:

> "بھلا سالگرہ بھی کوئی تقریب ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ زندگی کا ایک سال کم ہونے کی لوگ خوشی کیوں مناتے ہیں"۔[2]

شوکت تھانوی چھوٹی عمر کی شادیوں کو معیوب سمجھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں شادی کا فیصلہ اس وقت کیا جائے

۱۔ شوکت تھانوی: "غزالہ"، ص ۳۲، بار سوم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: "مولانا"، ص ۸۲۔

جب بچے باشعور ہو جائیں۔ ''سپنے'' میں مس قریشی کے عزیزوں نے بچپن میں ان کے چچا زاد بھائی سے منگنی کر دی تھی۔ لیکن جب یہ دونوں جوان ہوئے تو ان کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا، اس لیے مس ساجدہ قریشی اپنے منگیتر کے بارے میں فرماتی ہیں:

> ''میرے اعزاء میں سے چند ایسے ہیں جن کا مجھ سے مختلف حیثیتوں سے دل دکھ چکا ہے۔ مثلاً ایک میرے چچا زاد بھائی ہیں جو بیچارے اپنے بچپن سے اس غلط فہمی کا شکار بنائے گئے تھے کہ گویا میری شادی ان کے ساتھ ہو جائے گی اور اس مبارک تجویز کی ریڑھ کی ہڈی یہی تصور تھا کہ خاندانی جائیداد خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔ مگر میں آپ سے کیا عرض کروں کہ یہ ذات شریف کیا چیز واقع ہوئے ہیں۔ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے''۔[1]

شوکت تھانوی نے اپنے بیشتر ناولوں میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ''حاتم خان'' اور ''مولانا'' میں خاص طور سے اس مسئلہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ''مولانا'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''نزہت کو ابھی اس گھر میں شادی کے قابل ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ لاکھ جوان سہی، اس کی عمر بھی یقیناً شادی کے قابل تھی، مگر جج صاحب ان اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے نہ تھے جو اس کے قائل ہوا کرتے تھے کہ جوان لڑکی گھر میں ہو تو ماں باپ کی نیند حرام ہو جاتی ہے''۔[2]

شوکت تھانوی نے خواتین کے میک اپ کو اپنے ناولوں میں موضوع بنایا ہے۔ وہ خواتین کے لیے میک اپ کو ضروری سمجھتے ہیں بشرطیکہ یہ میک اپ سلیقہ سے کیا جائے، لیکن ایسا میک اپ جو خواتین کو خوبصورت بنانے کے بجائے بدصورت بنا دے اور جس سے عورت کا پھوہڑ پن ظاہر ہو، اسے شوکت تھانوی پسند نہیں کرتے۔ ''چار سو بیس'' میں وہ لکھتے ہیں:

---

[1] شوکت تھانوی: ''سپنے''، بار سوم، ص ١٦٧، استقلال پریس، لاہور۔
[2] شوکت تھانوی: ''مولانا''، ص ٢٢٧۔

> "ہم نے تو آرائشوں کے ایسے نمونے بھی دیکھے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سیاہ رنگ ہے، موٹا نقشہ ہے اور اس پر تھپا ہوا پوڈر اس طرح گویا آٹے کی بوری میں منہ ڈال کر ابھی نکالا ہے یا باورچی خانہ کی دیوار پر چونے کا ہلکا سا کوٹ ہوا ہے یا سیاہ گاجر کے حلوے پر پھپھوندی لگ گئی ہے، پھر لبوں پر وہ پھیلی پھیلی سی گہری سرخی جیسے بلاٹنگ پیپر پر لال روشنائی الٹ جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو آرائش جمال کہا جائے یا حسن دم الکال"۔[۱]

شوکت تھانوی عورت کی عظمت کے دل سے قائل تھے۔ اس لیے ان کے تمام ناولوں میں بالعموم اور "سپنے"، "چار سو بیس"، "سوتیا چاہ" اور "جوڑ توڑ" میں بالخصوص اس بات کا پر زور اظہار کیا گیا ہے:

> "عورت بنی ہے معبود بننے کے لیے اور مرد کا منصب ہے صرف پرستاری اور عبودیت۔ مرد کی سجاوٹ ہے اس کی بہادری، اس کی قوت، اس کی صداقت اور اس کی ان تمام طاقتوں کے بعد کمزور عورت کے سامنے سجدہ ہونے کی صلاحیت"۔[۲]

شوکت تھانوی شادی کے لیے ہم خیالی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ "ہکلی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> "مجھ کو دراصل تلاش تھی اپنے ایک ہم خیال کی اور چونکہ میرے خیالات نہایت الجھے ہوئے اور دنیا سے کچھ نرالے ہیں۔ لہذا مجھ کو اپنی اس جستجو میں کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ جانے کتنی خاک چھاننے کے بعد یہ حضرت مجھ کو ایسے ملے جن کو میں نے ہو بہو ویسا ہی پایا اور اتنا ہی ہم خیال دیکھا جتنا اور جیسا میں چاہتی تھی اور وہ بھی میری طرف اس لیے متوجہ ہو گئے کہ دنیا کی ہر کشش سے زیادہ ہم خیالی کی کشش ہوتی ہے"۔[۳]

۱۔ شوکت تھانوی: "چار سو بیس"، ص ۱۶۳، ۱۶۵، طبع چہارم، ۱۹۶۱ء، کتب خانہ علم و ادب، کراچی۔

۲۔ شوکت تھانوی: "سپنے"، ص ۹۳، استقلال پریس، لاہور، بار سوم، اپریل، ۱۹۵۲ء۔

۳۔ شوکت تھانوی: "ہکلی"، ص ۶۲، ۶۳، لارک پبلشرز، جہانگیر روڈ، کراچی۔

شوکت تھانوی کے بیشتر ناولوں میں جہیز کو ایک لعنت قرار دیا گیا ہے۔ وہ دھوم دھام سے شادی کرنے اور جہیز کو ایک معاشرتی برائی تصور کرتے ہیں۔ "بیگم صاحبہ" میں ریاض کی والدہ مسعود سے کہتی ہیں کہ:

> "میں ریاض کی شادی جہیز کے ساتھ نہیں کر رہی ہوں، مجھ کو تو نازلی اور صرف نازلی چاہیے"۔ [1]

اسی ناول میں ایک اور جگہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ:

> "مسعود میاں کی شرط ہی تو یہی تھی کہ ان کی شادی کو تماشہ نہ بنایا جائے، جس میں دولہا سرکس کا جانور معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ محفل چاہتے ہیں، نہ دھوم دھام۔ نہ دعوت نہ کچھ اور"۔ [2]

قیام پاکستان نے اردو ادب کو ایک نیا موضوع عطا کیا۔ بھارت سے پاکستان آنے والے مسلمان بھیانک حالات سے دوچار تھے۔ راستے میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور انسان انسان کے خون کا پیاسا معلوم ہوتا تھا اس ہلچل میں متعدد نظریات و روایات کے مفاہیم بدلنے لگے۔ ادب نے بھی ان بدلے ہوئے حالات کی ترجمانی کی۔ ناول نگاروں نے ان انسانیت سوز واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ شوکت تھانوی نے ۱۹۴۷ء کے بعد لکھے گئے بہت سے ناولوں میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ناول "چار سو بیس" اگست، انیس سو سنتالیس عیسوی کے واقعات سے شروع ہوتا ہے۔ اس ناول کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے کہ:

> "اگست انیس سو سنتالیس عیسوی میں عجیب عجیب انقلاب آئے کسی کو ہندوستان ملا، کسی کو پاکستان ملا اور ہمارے گھر میں بھائی جان کو بھابی جان ملیں"۔ [3]

اسی ناول میں شوکت تھانوی نے بھارت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا حال بیان کیا ہے کہ راستے میں سکھ انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہے تھے۔ بہت سے مسلمان اس حادثہ میں شہید ہوئے اور کچھ زخمی حالت میں لاہور پہنچتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ شوکت تھانوی: "بیگم صاحبہ"، ص ۱۱۳، دوسرا ایڈیشن، شمع بک ڈپو، لاہور۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۳۔ شوکت تھانوی: "چار سو بیس"، ص ۵، طبع چہارم، کتب خانہ علم و ادب، کراچی۔

"جالندھر سے لاہور تک عجیب خوفناک سفر تھا۔ بعض مقامات پر تو باقاعدہ جنگ کی نوبت آ گئی اور گولیوں کی بوچھاڑ سے ہم کو گزرنا پڑا۔ ہمارے قافلے کے ساتھ ان فوجی جوانوں کی بھی خاصی تعداد تھی جو اب پاکستان کے سپاہی تھے۔ ان کے پاس ان کے اسلحہ تو تھے ہی مگر ان فوجی اسلحہ کے علاوہ ایک آدھ ریوالور اور تین چار رائفلیں ہم غیر فوجیوں کے پاس بھی تھیں . . . . ہمارا قافلہ امرت سر سے نکلا ہی تھا اور ہماری ٹرکیں لاشوں سے اٹے ہوئے راستے سے گزر رہی تھیں کہ یکا یک "ست سری اکال" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے خون کے پیاسے بلوائیوں کے غیر منظم لشکر نے ہمارا راستہ روک کر ہم کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ دونوں طرف سے گولیوں کی دھواں دھار بارش ہو گئی اور مجھ کو صرف اس قدر یاد ہے کہ ایک گولی میرے بازو پر لگی تھی جس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔[1]

پاکستان کا قیام بہت سی قربانیوں کے بعد رو بہ عمل آیا۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ "سپنے" میں طلعت کا کردار ایسا ہے جسے اپنی عصمت کی قربانی دینا پڑی۔ ظفر نے اس کے بارے میں یہ بتایا کہ "وہ میری منگیتر تھی ہم دونوں کی شادی ہونے ہی والی تھی کہ یہ طوفان امنڈ آیا اور اسی طوفان کی زد میں اس معصوم کی دوشیزگی بھی آ گئی"۔[2]

سر سید احمد خاں کی اصلاحی اور ادبی تحریک نے ہندوستان کے عام معاشرے کو بالعموم اور اردو شعر و ادب کو بالخصوص انیسویں صدی میں کافی متاثر کیا لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں اس تحریک کے رد عمل کے طور مغرب پرستی کی بجائے مشرق پرستی کی تحریک شروع ہوئی۔ شوکت تھانوی نے بھی اس تحریک کے زیر اثر مغربی تہذیب و تمدن پر بھرپور طنز کیا ہے اور مشرقی اقدار کی تعریف کی ہے:

"چار سو بیس" میں شوکت تھانوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "عذرا نے برا مان کر کہا:

"شمس صاحب یہ آپ غلط کہہ رہے ہیں سوائے مشرق کے اور کچھ

---

[1] شوکت تھانوی: "چار سو بیس" ص ۶، ۷، طبع چہارم، کتب خانہ علم و ادب، کراچی۔

[2] شوکت تھانوی: "سپنے" ص ۱۹۵، بار سوم، استقلال پریس، لاہور۔

ہونا اپنی توہین سمجھتی ہوں"۔[1]

بہت عرصہ تک ہندوستان کی لڑکیاں ولایت پاٹ لڑکوں سے شادی کرنا باعث فخر سمجھتی تھیں لیکن "سوتیلی چاہ" کی تارا اب ولایت پاٹ لوگوں کو اپنی جوتی کی نوک پر مارتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "سوتیلی چاہ" سے ایک اقتباس دیکھیے۔ "ابھی سنو تو میں آپ کی صفات حمیدہ کہ آپ ایسی جورو چاہتے ہیں جو بالکل میم کی نخی ہو یعنی بے پردہ، بال کٹی ہوئی، پیانو بجانے کی ماہر، گانا بھی عمدہ جانتی ہو، انگریزی گانا جاننے والی کو ترجیح دی جائے گی۔ موٹر چلانا بھی جانتی ہو۔ مختصر یہ کہ ان کو سودیشی میم بلکہ ولایتی بیوی درکار ہے۔

نگار نے کہا "تو اس میں کون سی دقت ہے تو ان تمام باتوں کی تعلیم دو ہی مہینے میں حاصل کر سکتی ہے اور بال میں آج ہی کاٹ دوں" تارا نے اپنے حسین چہرے پر سینکڑوں شکنیں پیدا کرتے ہوئے کہا میں کیوں بال کٹواؤں۔ میں ایسے انگریز کے بچے کو اپنی جوتی کی نوک پر مارتی ہوں۔ ابو جان نے تو اس موئے خبطی کا خط دیکھتے ہی اس کو لکھ دیا کہ آپ نے غلطی کی ولایت سے میم نہیں لائے"۔[2]

شوکت تھانوی کا زمانہ اصلاح معاشرت و مذہب کا زمانہ تھا اور اس کے زیر اثر مسلمانوں میں ایک نئی روح اور بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ قومی اتحاد اور قومی تعمیر کا ایک نیا تصور پیدا ہو چکا تھا۔ شوکت تھانوی نے اپنے عہد کے حالات کا بغور مشاہدہ کیا اور ان تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے تیار کیا۔ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ وہ بنیادی طور پر ایک صحافی تھے اور اخبارات کی دنیا سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے ستائیس ناول لکھے۔ ان میں کچھ ناول ایسے ہیں جو پہلے افسانہ یا مضمون کے طور پر لکھے گئے پھر ان کی مقبولیت کے پیش نظر انھیں ناول بنا دیا گیا مثال کے طور پر "سودیشی ریل" افسانہ کے طور پر لکھا گیا اور انیس سو اٹھائیس عیسوی کے "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ انیس سو چھتیس عیسوی میں اسی افسانہ کو ناولٹ کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک اور ناول

۱۔ شوکت تھانوی: "چار سو بیس" ص ۶۲، طبع چہارم، کتب خانہ علم و ادب، کراچی۔

۲۔ شوکت تھانوی: "سوتیلی چاہ" ص ۳۳، ۳۴۔

''خدانخواستہ'' ان کے ایک ریڈیو ڈرامہ کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۹۳۹ء میں ''کایا پلٹ'' کے نام سے لکھا گیا جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر عورتیں پردہ کے باہر آ جائیں اور مرد پردہ نشین ہو جائیں تو کیا ہو؟ اس ڈرامہ کو شوکت تھانوی نے یہ کہہ کر کہ ریڈیو ڈراموں کو لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں اور اس کا مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اسے ناول کی شکل دینا پڑی۔ اس ناول کے شروع میں شوکت تھانوی نے ''ایک رات'' کے تحت لکھا کہ ''زیر نظر کتاب دراصل میرے اس تخیل کی کتابی صورت ہے جس نے انیس سو انتالیس عیسوی میں ریڈیو کے ذریعے فضاؤں میں پرواز کی تھی۔ اور اب محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغ اردو نے اس پرندہ کو کتابی قفس میں محبوس کیا ہے''۔[1]

ناول نگاری میں شوکت تھانوی کو ایک رات میں ناول مکمل کرنے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔ انیس سو پینتالیس عیسوی میں شوکت تھانوی نے محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو کو لاہور سے لکھنؤ بلایا کہ آم بھی کھا جاؤ اور ناول بھی لے جاؤ۔ مرزا غالب کی طرح آم محمد طفیل صاحب کی بھی کمزوری ہیں چنانچہ فوراً لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ناول کا مطالبہ کیا تو شوکت تھانوی کہنے لگے کہ جب لاہور واپس جاؤ گے تو لے لینا۔ ایک دن بقول محمد طفیل صاحب:

> ''شام کا کھانا کھانے کے بعد انھوں نے قلم، دوات اور کاغذ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ لکھو ناول، تو میں سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ آخر میں کہاں تک لکھتا۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لائے اور ان سے لکھنے کو کہا۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے جب وہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہو گئے تو پھر میری باری آئی چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحے کا ناول ختم تھا۔

۱۔ شوکت تھانوی: ''خدانخواستہ'' ص ۵، بار سوم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

اس ناول کا نام "بیوی" ہے"۔[۱]

ایک رات کی مدت میں لکھے جانے والے ناول کا تذکرہ عشرت رحمانی صاحب نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "کہ ان کے ایک مقبول ترین ناول "بیوی" کی تصنیفی مدت صرف ایک رات ہے . . . . لکھنے والے تھک گئے مگر شوکت کی روانی اور واقعات کے جوڑ توڑ میں کہیں تذبذب پیدا نہ ہونے پایا"۔[۲]

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں زندگی کے واقعات و تجربات ایسے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شوکت تھانوی میں یہ قوت خداداد تھی کہ وہ قصے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قصے میں دلچسپی جتنا زیادہ ہوگی، قاری کے لیے وہ اتنا ہی پرکشش ہوگا۔

ناول کے پلاٹ کی تشکیل و تعمیر کے لیے تکنیکی ہنر مندی کی ضرورت ہے ایک اچھے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناول کے پلاٹ کے مختلف اجزاء کو خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے۔ شوکت تھانوی کے تمام ناولوں میں ربط اور تسلسل نظر آتا ہے، اس لیے ان کے ناولوں کو مربوط پلاٹ کے ناول کہا جا سکتا ہے۔ ان کے پلاٹ کے بالعموم پانچ مراحل ہوتے ہیں پہلے حصے میں ناول کے کرداروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور ناول کے واقعات کی پیش کش کے لیے وہ ابتدائی فضا تیار کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں واقعات میں پیچیدگی پیدا ہونے لگتی ہے تیسرے حصے میں یہ پیچیدگیاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ چوتھے حصے میں واقعات اور کرداروں کی الجھنیں کم ہونے لگتی ہیں۔ پلاٹ کا پانچواں حصہ اختتامی ہوتا ہے اس حصے میں کرداروں کی عملی سرگرمیاں مکمل ہو جاتی ہیں اور تمام واقعات فطری انجام پر پہنچتے ہیں۔ ان تمام مرحلوں میں گہرا ارتباط اور مضبوط جوڑ ہوتا ہے اس لیے سلسلۂ واقعات کہیں ٹوٹنے نہیں پایا۔

شوکت تھانوی کے بیشتر ناولوں میں سیدھے سادے پلاٹ کی کہانیاں پیش کی گئی ہیں لیکن کہیں کہیں ضمنی واقعات کی وضاحت اور مناظر کے

۱۔ محمد طفیل: "صاحب" ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ، شوکت تھانوی نمبر، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۔

۲۔ عشرت رحمانی: نقوش شوکت نمبر، ص ۵۲۲۔

تفصیلی بیان کی وجہ سے پلاٹ کے واقعات کی ارتقائی فضا میں گہرا تعلق برقرار نہیں رہا ہے اور پڑھنے والا ایسے مرحلوں پر یا ضمنی واقعوں میں الجھ گیا یا مناظر کی خوبصورتی میں کھو کر مرکزی واقعہ سے دور چلا گیا ہے پھر بھی اس کی وجہ سے واقعات کی عضویاتی تنظیم میں کوئی رخنہ پڑتا نظر نہیں آتا۔ واقعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں البتہ مناظر کی دلکشی ان کے فطری بہاؤ کی تاثیر کو کہیں کہیں دھیما کر دیتی ہے۔ اس قسم کے پلاٹ ''کارٹون''، ''بہروپیا'' اور ''بقراط'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے کچھ ناولوں میں پلاٹ کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ''نیلوفر'' اور ''غزالہ'' کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ناولوں کے پلاٹ میں کافی حد تک یکسانیت ہے۔ ''غزالہ'' میں نسیم نے نواب فلک رفعت کی بیٹی غزالہ کو آگ سے بچایا۔ اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے نواب صاحب نسیم کو اپنے گھر لے آئے۔ ''نیلوفر'' میں شہاب نے ''نیلوفر'' کو ڈاکوؤں سے جو اسے اغوا کرکے لے جا رہے تھے، بچایا اور شہاب صاحب کو ڈاکٹر لطیفی اپنے گھر لے آئے۔ دوسری بات یہ کہ ''غزالہ'' میں نواب فلک رفعت کے بھتیجے سلیمان قدر صرف جائیداد حاصل کرنے کے لیے غزالہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں اسی طرح ''نیلوفر'' میں ڈاکٹر لطیفی کے بھتیجے افضل صاحب بھی ''نیلوفر'' سے شادی صرف جائیداد حاصل کرنے کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ اسی مسئلہ پر ''غزالہ'' میں سلیمان قدر سے اور ''نیلوفر'' میں افضل سے مقدمہ بازی ہوئی۔ تیسری بات یہ کہ ''غزالہ'' میں صابر ڈی۔ ایس۔ پی اور وسیم ڈی۔ ایس۔ پی اور فاروقی ڈی۔ ایس۔ پی شہاب کے دوست ہیں اور ان کے مقدمات میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ ''غزالہ'' میں سب لوگ غار میں قید ہوتے ہیں تو وہاں ان کے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک ہوتا ہے۔ اسی طرح ''نیلوفر'' میں نیلوفر کو اغوا کرکے جب چٹاگانگ بھیج دیا جاتا ہے تو رشید صاحب اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ پانچویں بات یہ ہے کہ دونوں کا انجام ایک ہی طرح کا ہے۔ ''غزالہ'' میں غار دریافت ہو جاتی ہے اور ''نیلوفر'' میں دفینہ مل جاتا ہے اس خوشی کے موقع پر ہیرو کی ہیروئین سے اور ہیرو کے دوستوں کی ہیروئین کی سہیلیوں سے شادی ہو جاتی ہے۔

شوکت تھانوی نے بعض ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل میں نہایت دانش مندانہ فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں

''حام حال'' اور ''بہکی'' کو خاص طور سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان ناولوں میں شروع سے آخر تک شگفتہ انداز تحریر کو برقرار رکھ کر پلاٹ میں تنوع اور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ناول زندگی کے وسیع تجربات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اختتام پر شوکت تھانوی نے ان ناولوں کے تمام واقعات کو فنکارانہ احتیاط اور تخلیقی ذہانت کے ساتھ سمیٹا ہے۔ مجموعی طور پر ان ناولوں کے پلاٹ میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔

ناول کا قصہ چھوٹے بڑے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ واقعات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تجربات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ شوکت تھانوی اپنے گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ کرکے اپنے ناولوں کے لیے موضوع کی مناسبت سے چند خاص واقعات کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں ان کی ضروری جزئیات کے ساتھ ایک فطری ترتیب دے کر قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ واقعہ نگاری میں ابتداء، نقطہ عروج اور انجام بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے شوکت تھانوی بھی ان تینوں مرحلوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ ابتدائی مرحلہ میں واقعات اور کرداروں کا تعارف کرواتے ہیں اور آئندہ واقعات کے لیے فضا بندی کرتے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں واقعات بتدریج آگے بڑھتے ہیں اور الجھنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے جیسے جیسے پیچیدگیاں بڑھتی ہیں تجسس کی لہر تیز تر ہوتی جاتی ہے اور یہی ان کے ناول کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں واقعات اپنے فطری انجام پر پہنچ جاتے ہیں۔ شوکت تھانوی کے ناول ''بڑبھس'' اور ''خدا نخواستہ'' واقعہ نگاری کے اعتبار سے شاہکار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ''بڑبھس'' میں مصنف نے ایک ایسے بڑے میاں کے شب و روز بیان کیے ہیں۔ جو بوڑھے ہونے کے باوجود ذہنی طور پر جوان ہیں بلکہ نوجوان ہیں ان کے تمام مشاغل نوجوانوں کے سے ہیں۔ یہ بڑے میاں میر صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے گھر میں رنگین مزاج لوگوں کا آنا جانا ہے اور ان کا گھر طوائفوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ میر صاحب ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی پر عاشق ہو کر اس سے شادی رچانے کی فکر میں ہیں لیکن لڑکی کے والد شیخ عنایت اللہ اس کے باوجود کہ میر صاحب سے عقیدت رکھتے تھے، ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کو تیار نہیں۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے مزاحیہ انداز اختیار کرکے واقعات کو پہلے عروج تک پہنچایا اور پھر آہستہ آہستہ الجھن سلجھانے میں اتنی مہارت کا ثبوت دیا

ہے کہ اس کا انجام بھی فطری بنا دیا ہے۔ انجام کار شیخ عنایت اللہ کی بیٹی کی شادی میر صاحب سے ہونے کے بجائے ان کے بیٹے ارشاد احمد رضوی سے ہو جاتی ہے اور میر صاحب اپنی بوالہوسی پر نادم ہوتے ہیں۔

ناول ''خدا نخواستہ'' میں ایک ایسی مملکت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس میں عورتوں کی حکومت ہے اور مردوں کو پردہ میں بٹھایا جاتا ہے گھر کی صفائی ستھرائی اور روٹی ہنڈیا کے کام بھی ان کے فرائض میں شامل ہیں۔ اس خیال کو اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ابتداء، عروج اور انجام کے مرحلوں سے گذرتے ہوئے ان کی فنکارانہ چابک دستی کا اظہار ہوتا ہے۔

ناول نگار اپنے قصے میں واقعات کا جو تانا بانا بنتا ہے اور ان واقعات سے ماحول کو پیش کرتا ہے، اس کے کردار بھی اسی ماحول کے پروردہ اور نمائندہ ہونے چاہئیں۔ ہماری معاشرتی زندگی مختلف طبقاتی پیمانوں میں منقسم ہے۔ رہن سہن، بول چال اور مذہب و مسلک میں بھی تنوعات ہیں اور اقتصادی اعتبار سے بھی تضادات موجود ہیں۔ ناول نگار جس طبقے کو اپنا موضوع بناتا ہے کردار کو اسی طبقے کا ترجمان ہونا چاہیے۔ شوکت تھانوی نے اپنے بیشتر ناولوں کے موضوعات متوسط طبقے سے حاصل کیے ہیں اس لیے ان کے کردار بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''سوتے'' کے کردار شکیل، سعید، اور اکرام ''سسرال'' کے کردار ملک محمود احمد، شعیب، ''بھابی'' کے ریاض صاحب، ''چار سو بیس'' کے مسعود صاحب وغیرہ یہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شوکت تھانوی کی کردار نگاری کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ کردار اور قصہ ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں کوشش کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ناول کے کرداروں کو واقعات کے نشیب و فراز میں ایک فطری تسلسل کے ساتھ سامنے لاتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں پر کرداروں اور واقعات کے ربط و ضبط کا سحرکارانہ اثر تا دیر برقرار رہے۔ اس قسم کا ربط و ضبط ان کے ناولوں ''پگلی''، ''خانم جان''، ''بیگم صاحبہ''، ''داماد''، ''کتیا''، ''جوڑ توڑ'' اور ''بھابی'' میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ان ناولوں کے کرداروں میں باہمی ربط بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ ان کرداروں کے افکار و اعمال سے ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کی بھی آئینہ داری ہوتی ہے۔

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں کم از کم ایک مزاحیہ کردار کو ضرور شامل کیا ہے جو سنجیدہ ماحول میں تفریحی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو درست اور حق بجانب سمجھتا ہے۔ ''بڑبھس'' میں میر صاحب، ''بیگم صاحبہ'' میں اجمل، ''سپنے'' میں نظام اور ''مولانا'' میں شفقت کے کردار مزاح پیدا کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ سب کردار اپنی بات کو اٹل سمجھتے ہیں اور کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ دوسرے کرداروں سے یہ اس لیے ناراض رہتے ہیں کہ وہ سب ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ شوکت تھانوی نے اپنے مزاحیہ کرداروں کو مضحک بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ کردار عشق میں مبتلا ہو کر مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں اور ان سے دوسرے کردار لطف لیتے ہیں۔ شوکت تھانوی بنیادی طور پر مزاح نگار تھے اور اس قسم کے کرداروں کو پیش کرتے وقت وہ اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں اس لیے یہ شوکت تھانوی کے شاہکار کردار ہیں۔

ناول کے تمام واقعات اور کرداروں کی پیشکش کا وسیلہ ''زبان و بیان'' ہے۔ زبان دراصل وہ بنیادی قوت ہے جس پر واقعہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا پورا دار و مدار ہوتا ہے۔ مکالمہ ناول کے فن کا ایک نہایت اہم عنصر ہے اور یہ مکالمے لفظوں اور جملوں سے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ کرداروں کی گفتگو بھی مکالموں کے ذریعہ ہی سامنے آتی ہے اور ان کے طرز احساس اور انداز فکر کی آئینہ داری بھی مکالموں ہی سے ہوتی ہے۔ ایک ناول میں تمام دوسرے اوصاف موجود ہوں، صرف مکالمے مصنوعی اور بے جان ہوں تو اس ایک کمزوری کی وجہ سے ناول کا تمام ادبی حسن ماند پڑ جاتا ہے۔

شوکت تھانوی نے لکھنؤ کے علم پرور ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ مصنوعی اور مغلق زبان لکھنے کی بجائے صاف، سادہ اور عام فہم زبان لکھنے کے عادی ہیں۔ شوکت تھانوی خود شاعر تھے اس لیے ان کے ناولوں کے اکثر کردار بے محل مصرعے اور شعر پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض مواقع پر کردار نثر کی بجائے شاعری میں بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول ''کنیا'' میں ایک جگہ مختلف کرداروں سے مصرعوں میں باتیں کرواتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''احسن نے تماشا دیکھتے ہوئے کہا ، اختر دیکھ رہے ہو ع

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

زیدی نے کہا :

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

نجم نے کہا :

جہاں پر آپ جو سن لیں وہی ہے داستاں میری''۱

ناول ''سپنے'' میں کرداروں کی گفتگو مصرعوں کی بجائے اشعار میں ملاحظہ کیجیے :

''مس قریشی کے خانساماں نے ناشتہ لگا کر ہم لوگوں کو اطلاع دی اور ہم سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے ۔ مس قریشی نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔ نوش فرمائیے جو کچھ بھی موجود ہے اور پڑھیے یہ شعر کہ :

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے بہرصورت
دانہ نہ سہی خرمن ، خرمن نہ سہی دانہ

اکرام نے کہا :

''یہاں تو یہ شعر برمحل ہو جائے گا ۔ پھر بھی یہاں تو اس قسم کا شعر پڑھنا چاہیے کہ :

اگر دل میں خیال شکوۂ بیداد آتا ہے
تو اس کے ساتھ پیمان وفا بھی یاد آتا ہے''۲

شوکت تھانوی کے ناولوں میں استعمال ہونے والے اشعار اور مصرعوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں موقع و محل کی مناسبت سے یا مزاح پیدا کرنے کے لیے اشعار بہ کثرت اور خوب سوجھتے تھے ۔ کہیں کہیں انہوں نے اشعار لکھنے کے بجائے انہیں نثر میں ڈھال کر اپنے مقصد کی بات بیان کر دی ہے ۔ شوکت تھانوی اس فن میں ماہر تھے ۔ پڑھنے والا ان کی ذہانت کی داد دیتا ہے ۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں :

۱۔ شوکت تھانوی : ''کتیا'' ، ص ۳۷ ، بار اول ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

۲۔ شوکت تھانوی : ''سپنے'' ، ص ۹۹ ، بار سوم ، مطبوعہ استقلال پریس ، لاہور ۔

''اب سوال یہ ہے کہ آپ جو تصنیف فرما رہے ہیں وہ انسانی شکل و صورت میں یا ع

کاغذی ہے پیرہن اس پیکر تصویر کا

شریف نے کہا ''اولنے کیوں نہیں ۔ اب'' نقش فریادی بن کر رہ گئے اس شوخی تقریر کے بعد ۔''[1]

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں :

''تم کوشش کرکے دن بھر ناہید سے نہ ملو ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ بہت ہی مشکل کام ہے مگر صبر کرو اس لیے کہ کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ عاشقی صبر طلب ہوتی ہے اور ہرچند کہ جتنا بیتاب ہو مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ :

دل کا کیا حال کروں خون جگر ہوے تک

لہذا تم بھی خون جگر ہونے تک دل کا کچھ بھی نہ کرو ۔''[2]

شوکت تھانوی اپنی نثر میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے جا بجا اشعار اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں ۔ وہ اشعار کا انتخاب ناول کے مزاج کے مطابق کرتے ہیں ۔ ایک ناول ''چار سو بیس'' میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے اشعار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام اشعار کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے ۔ مثلاً

ان کی مرضی میری قسمت ہوگئی
بات اتنی سی قیامت ہوگئی[3]

اب محبت سے بھی اکتانے لگے
کیوں اچاٹ اپنی طبیعت ہوگئی[4]

---

[1] شوکت تھانوی : ''چار سو بیس'' ص ، ۱۰۳ ، طبع چہارم ، کتب خانہ علم و ادب ، کراچی ۔

[2] ایضاً ، ص ۱۱۲

[3] ایضاً ، ص ۱۸

[4] ایضاً ، ص ۲۰ ۔

محبت میں پہلے پرستاریاں تھیں
محبت سے اب اور بیزاریاں ہیں[1]

ادھر سے بھی زیادہ ہے ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی[2]

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا دیا
اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے[3]

شوکت تھانوی نے زبان و بیان کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بحیثیت مجموعی شوکت تھانوی کی مکالمہ نگاری کی خوبی و کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے کرداروں کی باہمی گفتگو، ہماری عام زندگی کی گفتگو سے ملتی جلتی ہے۔ ان کے مکالموں میں روانی، چستی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے ان کے مکالمے ناول کے واقعات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور یہ مکالمے ناول کے پس منظر اور پیش منظر سے پوری طرح وابستہ ہوتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے عہد میں اچھے اور برے سینکڑوں ناول لکھے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت برصغیر میں علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ اس عہد کے ناولوں میں سے زیادہ تعداد ایسے ناولوں کی تھی جن کو معیاری ناول نہیں کہا جا سکتا۔ شوکت تھانوی کے عہد میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر جو ناول نگار ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان میں سے اکثر ناول نگاروں نے واقعات کے بجائے کرداروں کو اہمیت دی ہے اور ان کی ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی الجھنوں کو ابھار کر پیش کیا ہے، جس میں ناول نگار کے مزاج نے انفرادی رنگ بھر دیے ہیں۔ یہ انتشار پذیر دور تھا جب جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی اور عالمی جنگ کے بادل دنیا پر منڈلا رہے تھے۔ جس کی عکاسی کرتے ہوئے ناول نگار کو یہ فیصلہ

۱۔ شوکت تھانوی: ”چار سو بیس“ ص ۲۰، طبع چہارم کتب خانہ علم و ادب، کراچی۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ کون سی راہ اختیار کرے ، اس لیے وہ فرار کی راہ اختیار کرتے کرتے رومانیت کی آغوش میں پناہ لے لیتے ہیں ۔

شوکت تھانوی اپنے عہد کے عوام کا مزاج جانتے تھے ۔ وہ ریڈیو، ڈراموں اور اخبارات میں فکاہی کالموں کی وجہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے ۔ اس لیے انھوں نے جب ناول لکھنے کا فیصلہ کیا تو کسی مخصوص گروہ کے لیے ناول لکھنے کے بجائے عوام کے لیے ناول لکھنے شروع کیے ، لیکن انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اپنے عوام کو زندگی کے ایسے گوشوں سے بھی روشناس کروایا جائے جو بالعموم عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں ۔ اس طرح انھوں نے اپنے قاری کی ذہنی صلاحیتوں کو بلند کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ شوکت تھانوی کی ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں :

> ''انھوں نے اپنے ہر ناول میں ایک ہی قسم کے کردار ، واقعات اور ماحول کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے کوئی ندرت یا تنوع پیدا ہونے کے بجائے بندھا ٹکا انداز سامنے آتا ہے جو قاری پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کرتا ۔ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ قاری شوکت تھانوی کے چند مزاحیہ جملوں پر صرف زیر لب مسکرا کر رہ جاتا ہے یا کبھی کبھی بے ساختہ قہقہہ لگا دیتا ہے جب کہ ادبی ناول نگار ہمیشہ کوئی نئی چیز یا کسی نئے پہلو کو کسی نہ کسی اچھوتی تکنیک سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری چونک اٹھتا ہے''۔[1]

ڈاکٹر ہارون ایوب کی اس رائے میں جہاں تک پلاٹ اور کردار کی یکسانیت کی بات ہے تو اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے ۔ ان کا یہ کہنا کہ شوکت تھانوی کے یہاں تنوع نہیں ہے ، پوری طرح قابل قبول نہیں ۔ شوکت تھانوی کے کچھ ناول بالکل نئے موضوعات پر لکھے گئے ہیں ۔ مثال کے طور پر ''خدانخواستہ'' ، ''بڑ بھس'' ، ''کتیا'' اور ''بکواس'' ۔ یہ اس قسم کے موضوعات ہیں جو اس سے پہلے ناول کا موضوع نہیں بنے ۔ اس طرح شوکت تھانوی نے اردو ناول کو کچھ نئے موضوعات بھی عطا کیے ہیں جس کی وجہ

---

[1] ڈاکٹر ہارون ایوب : ''اردو ناول پریم چند کے بعد'' ، ص ۲۳۱ ، جون ۱۹۷۸ء ، اردو پبلشرز نمبر ۸ ، تلک مارگ ، لکھنؤ ۔

سے ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ شوکت تھانوی صرف ادبی ناول لکھ کر اپنے قارئین کا دائرہ محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک عوامی ادیب تھے اس لیے انھوں نے ناول کے عناصر ترکیبی کا خیال رکھتے ہوئے عوام کے ذہنی ذوق کی تسکین کے لیے عوامی موضوعات پر ناول لکھے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون ایوب نے ایک جگہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مقبول ناول نگاروں کی صف میں شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مقبول ناول نگاروں میں رشید اختر ندوی، اے۔ آر خاتون، عادل رشید، ایم۔ اسلم، قیسی رامپوری، رئیس احمد جعفری، اسیم حجازی، خان محبوب طرزی، شوکت تھانوی، دت بھارتی اور عارف مارہروی وغیرہ بہت مشہور ہیں اور ان کے ناولوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے"۔ ۱

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں کبھی کسی فرد کی شخصیت کو ابھار کر پیش کیا ہے اور کبھی پورے معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں فرد اور معاشرہ کے اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مزاحیہ ناول نگاری میں عظیم بیگ چغتائی کے بعد شوکت تھانوی کو سب سے بڑا ناول نگار کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر ہارون ایوب: "اردو ناول پریم چند کے بعد"، ص ۳۲۴، جون، ۱۹۷۸ء، اردو پبلشرز نمبر ۸، تلک مارگ، لکھنؤ۔

چھٹا باب

ڈراما نگاری

شوکت تھانوی کے ڈرامے یک بابی ڈراموں کی ذیل میں آتے ہیں۔ یک بابی ڈرامے کے بارے میں پرسیول وائلڈ لکھتے ہیں :

> "یک بابی ڈرامہ اپنے دلفریب حسن اتحاد اور حسن تنظیم کی بناء پر مرکز توجہ بنتا ہے جسے ایک محدود و مقررہ میعاد وقت میں پیش کیا جا سکتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت پنہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنا مجموعی تأثر ناظرین کے قلب و نظر اور فہم و ادراک میں سرایت کر دے"۔[۱]

پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے یک بابی ڈرامے پر تحقیقی کام کیا ہے۔ انہوں نے یک بابی ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

> "یک بابی ڈرامے میں وحدت تأثر، امکانات تصادم اور وحدت مکان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ان تینوں عناصر میں سے کسی ایک کا فقدان اسے یک بابی ڈرامے کی تعریف سے خارج کر دیتا ہے"۔[۲]

یک بابی ڈرامے کی متعدد صورتیں ہیں لیکن ایک خوبی ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ان کا "اسٹیج پر انداز پیش کش" بالفاظ دیگر عملی پیش کش کی خاطر ان سب کو ایک جیسے ہی میکانکی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اور نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، یک بابی ڈراما ایک واحد متأثر کن ڈرامائی موقع سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ تأثرآفرینی بھی ان تمام نوعیتوں میں ایک حسن مشترک سمجھی جا سکتی ہے۔

شوکت تھانوی کے ڈراموں کا تعلق نثری یک بابی ڈرامے سے ہے۔

۱- "دی ون ایکٹ پلے ٹو ڈے"، مرتبہ ولیم کوزینکو، بحوالہ اردو کا یک بابی ڈراما سیریز (۱)، ص ۱۰۳ -

۲- پروفیسر فصیح احمد صدیقی: اردو کا پہلا یک بابی ڈراما سیریز (۱)، مطبوعہ رحیمی پریس، بمبئی، جولائی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۶ -

ریڈیو کی ایجاد سے یک بابی ڈرامے کے لیے ایک وسیع و عریض میدان کھل گیا۔ اسٹیج کے یک بابی ڈرامے کی تکنیک ریڈیائی ڈرامے پر منطبق نہیں کی جا سکتی۔ مقصد یقیناً دونوں کا ایک ہوتا ہے۔ لیکن ریڈیو میں اس مقصد کے حصول کے وسائل مختلف ہوتے ہیں۔ نشری ڈرامے کے کردار سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے، ان کی آواز ضرور آتی ہے۔ لیکن جنبش لب نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈرامے کا اسلوب ایسا ہو کہ سامع کی قوت متخیلہ ان کرداروں کو جسمانی طور پر اس کے پہلو میں بٹھا دے اور جہاں یہ کیفیت پیدا ہو جائے وہیں حقیقی تأثر کے قیام و استحکام کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے کے کردار حقیقتاً مکالمہ سے زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے افعال و اعمال سامنے نظر نہیں آتے لیکن مکالمہ ان کا ایک ہیولی تیار کر دیتا ہے۔ اگر یہ ہیولی اس قدر متعین اور واضح ہے کہ سامع اس کی شناخت کر سکے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ڈراما نگار اپنا مقصد سامع تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نشری ڈراما نگار کا امتحان اس میں بھی ہے کہ اس نے ان لوگوں کو جو ڈراما دیکھنے کے عادی ہیں ڈراما سننے پر کیسے راغب کیا۔ شوکت تھانوی نے اس زمانے میں ڈراما نگاری شروع کی جب ملک میں تھیٹریکل کمپنیاں اپنے عروج پر تھیں اور لوگ ان تھیٹروں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو شوکت تھانوی نے تھیٹر کے انداز میں ڈراموں کا ایک سلسلہ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام شروع کیا۔ لکھنؤ کے ماحول کی وجہ سے بہت سے مکالمے اس میں شاعرانہ ہوتے تھے۔ شوکت تھانوی ''ما بدولت'' میں لکھتے ہیں:

> ''دسمبر انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ہم سے ڈراموں کا ایک سلسلہ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کے نام سے لکھوایا۔ یہ ڈراموں کا سلسلہ گویا اسٹیج ڈراموں پر ایک طنز تھا کہ اسٹیج ڈراموں میں کس طرح قافیہ پیمائی ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مکالمہ یاد آ رہا ہے: ''وزیر اعظم اس کو چھوڑ دو، اس کا منہ دربار کی طرف موڑ دو۔ میرے پہلے حکم کو میرے دوسرے حکم کے پتھر سے توڑ دو''۔[۱]

۱۔ شوکت تھانوی: ''ما بدولت''، نقوش پریس، لاہور، بار چہارم، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

شوکت تھانوی کے یہ ڈرامے اتنے مشہور ہوئے کہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں ریڈیو پر باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائے۔ "مابدولت" میں شوکت تھانوی نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

"ایک دن جگل کشور صاحب مہرا نے ہم سے کہا کہ تم ریڈیو میں آخر باقاعدہ طور پر کیوں نہیں آ جاتے۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ لہذا ہم نے صرف یہی جواب دیا کہ آخر آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں چاہے بھیج دیجیے اور جو چاہے کیجیے۔ اس گفتگو کے چند ہی دن بعد ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو ریڈیو سٹیشن۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ روز ہی وہ اس طرح گرفتار کر لیا کرتے تھے اور ان کا موٹر اس کثرت سے ہمارے یہاں نظر آتا تھا کہ بچے تک اس موٹر کو ہمارا موٹر کہنے لگے تھے۔ مگر آج جگل صاحب نے کہا یوں نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر چلو۔ ہم نے پوچھا خیریت؟ جواب ملا کہ ریڈیو میں ملازمت کا حکم آ گیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گزرتا تھا اور اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو یہیں سے خیر باد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتداء گا بجا کر شروع کر دی"۱

امین سلونوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں جب آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی تو شوکت تھانوی مرحوم مستقل طور پر آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو گئے۔ اس زمانہ میں جو لوگ ریڈیو کے عملے اور اسٹاف میں تھے سبھی ادیب، سبھی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک لوگ تھے۔ انہوں نے اس اسٹیشن سے مزاح اور طنز کو کافی ترقی دی۔ کبھی کبھی میرے اور شوکت کے درمیان آل انڈیا ریڈیو سے وقتی مزاحیہ مکالمے بھی نشر ہوتے تھے اور ہم دونوں مختلف نوع کی تخلیقات برابر پیش کرتے رہتے تھے۔"۲

۱۔ شوکت تھانوی: مابدولت، مطبوعہ نقوش پریس لاہور، بار چہارم، ص ۲۳۹، ۲۴۰۔

۲۔ امین سلونوی: "آہ شوکت تھانوی"؛ نقوش "شوکت نمبر" لاہور، ص ۳۸۶۔

لکھنؤ ریڈیو سٹیشن کے ماحول کے بارے میں عشرت رحمانی اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''لکھنؤ، رنگ و بو کا شہر، شعر و ادب کا گہوارہ، آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن وہاں قائم ہوا، فن و ادب کے رسیا اس اسٹیشن کے کارکن مقرر ہوئے۔ لکھنؤ ریڈیو اچھا خاصا اہل ادب کا مرکز بن گیا۔ ملک حسیب احمد پروگرام ڈائریکٹر تھے اور غلام قادر فرید، سید انصار ناصری، میاں لطیف الرحمان، فیروز نظامی، کرشن چندر اور یہ خاکسار پروگراموں کے مختلف شعبہ جات کے ناظم یعنی پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ شوکت تھانوی مصنف اور صداکار مقرر ہوئے۔ ہمہ وقت محفل فکر و فن آراستہ رہتی۔ نئی نئی تجویزیں، نئے پروگرام، رات دن سب کو فکر تھی تو یہی کہ کوئی ایسی جدت پیش کی جائے جو سامعین کو حیرت میں ڈال دے اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کا تو ہر ایک کو احساس تھا ہی لیکن اس سے زیادہ ہر ایک کو اپنے ذوق کے مطابق ایک ہی دھن تھی جس میں مگن نظر آتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کیا تھا ایک خاندان تھا اور یہ سب اراکین ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔''[١]

اسی مضمون میں آگے چل کر عشرت رحمانی نے مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے :

''ایک قابل ذکر سلسلہ ''مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام'' کا تھا۔ اس پروگرام میں قدیم تھیٹر کی گونج ''پیروڈی'' کے انداز میں پیش کی جاتی تھی۔ جس کے مصنف شوکت تھے۔ ہر ہفتہ ایک ڈرامہ نشر ہوتا جس میں کچھ اس طرح سے اعلان ہوتا : ''معزز شائقین! مون شائن کمپنی اف کاٹھ گودام اج شب آپ کی خدمت میں اپنا مشہور و معروف کھیل ''لال کوا'' عرف سفید کبوتر پیش کر رہی ہے جس میں کمپنی کے نامی گرامی ایکٹر اور ایکٹریسیں اپنے زرق برق لباس میں آپ کے سامنے آئیں گی اور اپنی اپنی حیرت انگیز اداکاری کے جوہر دکھائیں گی'' اور اس کے بعد قدیم طرز

١۔ عشرت رحمانی : شوکت تھانوی (چند یادیں) نقوش ''شوکت نمبر'' ص ٥١٦ ۔

کے حاضرین کی تالیوں، سیٹیوں اور قہقہوں کی گونج اور پٹاخہ کی آواز کے بعد سہیلیوں کا کورس شروع ہوتا اور دقیانوسی قسم کے شاہی پلاٹ پر لکھا ہوا ڈراما مقفیٰ و مسجع مکالموں اور شمس بار نغموں کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہ پروگرام لکھنؤ اسٹیشن کی خصوصیت خاصہ اور مدتوں ملک گیر شہرت و قبولیت عامہ کا ضامن بنا رہا جو شوکت کی تخلیقی ظرافت اور ذہانت کا ادنیٰ نمونہ تھا"۔[1]

مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کے تحت پیش کیے جانے والے ڈراموں میں سے ایک ڈرامے جس کا نام "دمشق کی بیٹی عرف زہر شبنم" ہے کا اقتباس شوکت تھانوی نے اپنی کتاب "مابدولت" کے صفحہ ۲۳۲ سے صفحہ ۲۳۸ تک درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"اس طنز میں قافیہ پیمائی کی زبردستیاں تو مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جائیں گی مگر اداکاری کی بوالعجبیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ عورتوں کا پارٹ کس طرح مرد کرتے تھے اور پارٹ کرنے والوں کو پرامپٹر کس طرح یاد دلاتا تھا۔ ایکٹر اس کے باوجود کس طرح بھولتے تھے وغیرہ یہ خاکہ ان ریڈیو ڈراموں میں پیش کیا گیا تھا اور یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس پہلے سلسلے کے چھ ڈراموں کے بعد ہم کو دوسرا اور پھر تیسرا سلسلہ بھی لکھنا پڑا۔ ہمارا نام منشی جھومک لال ڈرامہ نگار تھا اور اس تمثیل کے نامی گرامی ایکٹروں میں ملک حبیب احمد، مسٹر غلام قادر، مسٹر ہنسراج لوتھرا اور میاں لطیف الرحمان یہ سب ہی شامل تھے۔ اس سلسلے میں خود اسٹیشن ڈائریکٹر یعنی جگل کشور صاحب مہرا ایسی گہری دلچسپی لے رہے تھے گویا آپ ہی "مالک کمپنی ہذا" ہیں۔"[2]

شوکت تھانوی نے اپنی کتاب میں اس بات کا اظہار کیا کہ ان کا ریڈیو کے لیے لکھا جانے والا سب سے پہلا ڈرامہ "خدا حافظ" ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو کے لیے ہم نے لکھا۔ اس کا نام

۱۔ عشرت رحمانی: شوکت تھانوی (چند یادیں) نقوش "شوکت نمبر" ص ۵۱۷۔

۲۔ شوکت تھانوی: مابدولت۔ ادارۂ فروغ "اردو" لاہور، بار چہارم، ص ۲۳۸۔

"خدا حافظ" تھا۔ اس ڈرامہ میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی کیا تھا اور اس کے بعد تو اس قدر ڈرامے لکھے کہ اتنی گنتی آتی ہوتی تو اس وقت ریاضی کے بہت بڑے ماہر ہوتے[1]۔"

"خدا حافظ" شوکت تھانوی کی کتاب "سنی سنائی" میں شامل ہے یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ریڈیو پر نشر ہونے والے ابتدائی ڈرامے اس کتاب میں شامل ہیں۔ منشی جی سیریز کے گیارہ ڈرامے ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکے تھے اس لیے ہم پہلے "منشی جی" کا تذکرہ کرتے ہیں۔ "منشی جی" کے بارے میں خود شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> "منشی جی کا سلسلہ کب، کیونکر اور کیوں شروع ہوا اس کی تاریخ بیان کرنے میں ایک مزاح نگار کے مورخ ہو جانے کا شدید خطرہ ہے البتہ اتنا کہے بغیر تو رہا بھی نہیں جا سکتا کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام ڈائریکٹر ملک حبیب احمد صاحب کو عرصہ سے کسی ایسے کیریکٹر کی جستجو تھی جو ہمارے ممدوح "منشی جی" کی قسم کا ہو۔ منشی جی ملے تو کہاں؟ خیر یہ بات راز کی ہے۔ منشی جی سے عہد ہے کہ ان کی دریافت پر روشنی نہ ڈالی جائے گی مگر یہ بتانے میں عہد شکنی نہیں ہوتی اس خاکسار ہی نے منشی جی کو دریافت کیا اور منشی جی کو بے نقاب کرنے کے بعد خود اپنے چہرہ پر "مکوفی" کا پردہ ڈال کر ریڈیو سننے والوں اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے سامنے ان کو اس طرح پیش کیا کہ ہر ایک نے ان کو کانوں سے دیکھا بھی اس بے پردگی کے بعد بھی منشی جی کا پردہ برقرار ہی رہا۔"[2]

"منشی جی" کی گیارہ تمثیلیں بقول سید انصار ناصری ۱۹۳۹ء میں ریڈیو لکھنؤ سے نشر کی گئیں جبکہ امتیاز علی تاج نے ۱۹۳۰ء میں "چچا چھکن" کا کردار تخلیق کیا تھا اور چچا چھکن کے سلسلہ کے کئی مضامین تحریر کر چکے تھے مثلاً چچا چھکن کی عینک، چچا چھکن نے تصویر ٹانگی۔ چچا چھکن اونچندی دیکھنے گئے، چچا چھکن نے دھوبی کو کپڑے دیے،

۱۔ شوکت تھانوی: ما بدولت۔ ادارۂ فروغ اردو، لاہور، بار چہارم، ص ۲۳۱۔

۲۔ شوکت تھانوی: منشی جی۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، ص ۵۔

چچا چھکن نے ایک بات سنی ، چچا چھکن نے تیمارداری کی ، چچا چھکن نے ایک خط لکھا ، چچا چھکن نے جھگڑا چکایا ، چچا چھکن نے کیلے خریدے ، چچا چھکن نے ردی نکالی وغیرہ ۔ امتیاز علی تاج نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کردار انھوں نے جیروم ۔ کے ۔ جیروم کی کتاب Three Man in a Boat سے لیا ہے وہاں انکل پوجر کا کردار اس قسم کی مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے ۔ شوکت تھانوی ، امتیاز علی تاج کے چچا چھکن سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ جس طرح چچا چھکن مضحکہ خیز حرکت کرکے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ''منشی جی'' بھی مضحکہ خیز حرکتوں سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سید انصار ناصری نے راقم الحروف کو ایک ملاقات میں بتایا کہ منشی جی کا کردار رونق علی کرتے تھے ۔ کبھی کبھی رونق علی نہیں آئے تو شوکت تھانوی ایک خاص طریقہ سے منہ میں پان رکھ کر زبان کے میں دبا کر آواز نکالتے تھے ۔ منشائن یا منشی جی کی بیوی کردار اصغر بنتی تھی اور کچھ عرصے تک عرش منیر بھی یہ کردار ادا کرتی رہیں ۔ عام طور پر عرش منیر منشی جی کی بیوی کی سہیلی بنا کرتی تھیں ۔ اس زمانے میں ریڈیو کے باقاعدہ ملازمین اپنے اصلی ناموں کے بجائے ہندوانی ناموں سے پروگرام کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جیسا کہ آج کل ہندوستان میں مسلمان اداکار اپنا ہندوانی نام رکھتے ہیں تا کہ وہ اقلیت کی بجائے اکثریت میں مقبول ہوں ۔ شوکت تھانوی کا نام تھا ''سکوتی''، ملک حسیب احمد ''نندی''، چچا لطیف الرحمان کا نام تھا ''ساگر چن''، جے ۔ کے ۔ فریدہ کا نام ''ہمایوں فر''، سید انصار ناصری ''مدھوکر'' کے نام سے پروگرام پیش کرتے تھے ۔

خواجہ حسن نظامی نے ''منشی جی'' کا مقدمہ ، ''پیر جی نے بسم اللہ پڑھائی'' کے نام سے تحریر کیا ہے ۔ وہ اپنے اس مقدمہ میں لکھتے ہیں :

> ''بہنو! اور بھائیو! ہم مولانا شوکت تھانوی صاحب کو جانتے ہیں اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ انہوں نے لکھنؤ ریڈیو میں گیارہ رات تک ''مکوتی'' کے نام سے جو باتیں اپنی بیوی سے کی تھیں وہ ہم نے اور سب بھارت ماتا کے سپوتوں نے اپنے اپنے گھروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں سنی تھیں اور وہ باتیں ہم کو بحیثیت گھر سدھار کا کام کرنے کے گھر سدھار کے لیے بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھیں ۔ ہم کو ان کے سننے سے ہنسی بھی آتی تھی اور ہمارا سب آل اولاد و

اجداد کے جی خوش بھی ہوا تھا اور ہم نے ان سے سبق بھی لیا تھا۔”[1]

خواجہ حسن نظامی نے اس مقدمہ میں گورنروں، وزیروں اور اساتذہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اگر گھر کا ماحول بہتر رکھنا چاہتے ہوں تو انھیں شوکت تھانوی کی تمثیلیں جو اب کتابی شکل میں ”منشی جی“ کے نام سے شائع ہو رہی ہیں، ضرور پڑھیں۔ اس سے انھیں معلوم ہوگا کہ اپنے بچوں اور بیوی کو کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں گیارہ تمثیلیں ہیں (۱) منشی جی نے دوا پی۔ (۲) منشی جی نے صفائی کی۔ (۳) منشی جی نے کہانی کہی۔ (۴) منشی نے چاے بنائی۔ (۵) منشی جی نے خط لکھا۔ (۶) منشی جی نے تصویر کھنچوائی۔ (۷) منشی جی سودا لائے۔ (۸) منشی جی نے سبق پڑھا۔ (۹) منشی جی نے سفر کیا۔ (۱۰) منشی جی نوکر ہو گئے۔ (۱۱) منشی جی نے مکان بدلا۔ ان گیارہ تمثیلوں میں شوکت تھانوی نے ہر تمثیل میں منشی جی کے کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان ڈراموں کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منشی جی کا کردار تخلیق کرکے شوکت تھانوی نے عام لوگوں کے لیے ہنسی مذاق کا سامان فراہم کیا ہے۔ منشی جی مخبوط الحواس قسم کے انسان ہیں وہ جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں بھول جانے کی وجہ سے نہیں کر سکتے اور اپنے بھولنے کی ذمہ داری اپنی بیوی یا کسی اور شخصیت پر ڈال دیتے ہیں اس طرح وہ اپنی خامی کو بہت آسانی سے کسی دوسرے شخص کی خامی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کا طنز کسی کا دل دکھانے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے وہ طنز کرتے ہیں۔ ان کے ناٹکوں میں طنز کہیں کہیں نظر آتا ہے لیکن زیادہ تر مزاح ملتا ہے اس لیے یہ کردار قارئین کو بہت دیر تک یاد رہتا ہے۔ سید انصار ناصری اور عشرت رحمانی کا کہنا ہے کہ جب یہ ڈرامے پیش کیے جاتے تھے تو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں ان کی بازگشت سنائی دیتی تھی اور ہر عمر کے لوگوں میں یہ ڈرامے مقبول تھے۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب ہی ان سے لطف اندوز ہوتے تھے اور کچھ لوگوں کی زبان پر اس کے مکالمے ہوتے تھے۔ شوکت تھانوی کی

۱۔ شوکت تھانوی: منشی جی۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۔

پرورش لکھنؤ کے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے زبان و بیان پر قدرت ہونا ایک فطری امر تھا۔ لکھنوی بیگمات کی زبان اور لکھنؤ کا روزمرہ اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری یا سامع ان سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور بہت سے مکالموں پر بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کو اتنے شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہر بات قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ ڈرامے کرداری مزاح کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ مصنف کے تیز مشاہدے کی بدولت منشی جی کا کردار ہمیں اپنے ارد گرد چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ عام زندگی میں سے منتخب کیے گئے اس کے کارنامے ہر شخص کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں ان سب ڈراموں میں پلاٹ، کردار اور مکالمہ کے علاوہ کشمکش، عروج اور اختتام پر بھی شوکت تھانوی خاص طور سے توجہ دیتے ہیں۔ ہر ڈرامے کا اختتام ایسے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے کہ سامع بہت دیر تک منشی جی کے کارناموں پر ہنستا رہتا ہے۔

شوکت تھانوی کی ایک دوسری کتاب ”منی منافی“ بارہ ریڈیائی تمثیلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی سن اشاعت کا تعین شوکت تھانوی کے دیباچہ سے ہوتا ہے۔ جس پر ۲۱ دسمبر ۱۹۵۳ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ دیباچہ عذر گناہ کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کو لاہور میں مرتب کیا گیا اور پریم چند اگروال پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ لاہور سے شائع کیا۔ شوکت تھانوی نے ”عذر گناہ“ کے تحت ریڈیو ڈرامے کی فنی حیثیت کے بارے میں دو ٹوک اظہار خیال کیا ہے جس سے ریڈیو ڈرامے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ”ڈرامے کے اصناف میں شاید ریڈیو ڈرامے سے زیادہ مشکل اور کوئی صنف نہیں ہے اسٹیج یا اسکرین پر آپ کے کان سنتے ہیں اور آنکھیں دیکھتی ہیں۔ کان آنکھوں کی اور آنکھیں کانوں کی مدد کر کے آپ کو کچھ سمجھاتے ہیں۔ مناظر آپ کے سامنے ہوتے ہیں۔ ماحول آپ تلاش نہیں کرتے نہ آپ کو ٹٹولنا پڑتا ہے بلکہ یہ سب کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے مگر ریڈیو میں سوائے آواز کے ڈرامے کی نمائندگی کسی اور صورت سے نہیں ہو سکتی۔ اسی آواز کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ترتیب، دور اور نزدیک کی آوازوں کی ترکیب

> سے آپ کا ذہن ایک اسٹیج تیار کرتا ہے اور اس پر آپ کی سماعت آپ کو وہ کھیل دکھاتی ہے جو آپ کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہی آوازیں کردار پیش کرتی ہیں اور اسی ''اداکاری'' سے آپ کو ''اداکاری'' کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈراموں کی اس بے سنیکی کے باوجود روز افزوں کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا ڈرامائی ذوق تسکین حاصل کر رہا ہے اور ڈرامے کی یہ غیر مرئی صورت بھی ہو تمثیل کو تشکیل سے بے نیاز بنانے ہونے پر کامیاب ہے۔''[1]

''سنی سنائی'' میں بارہ تمثیلیں شامل ہیں۔ ۱۔ ہم ہیں مگر ہاں، ۲۔ برلن کا اسپتال، ۳۔ لاٹری کا ٹکٹ، ۴۔ صبح، ۵۔ لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا، ۶۔ زندگی بنام زندہ دلی، ۷۔ خدا حافظ، ۸۔ جھوٹا خواب، ۹۔ پارٹی کے بعد، ۱۰۔ ملازمہ کی تلاش، ۱۱۔ انتیس کا چاند، ۱۲۔ سالگرہ۔ خود شوکت تھانوی کے بقول:

> ''یہ بارہ اڑنے والے طیور اس کتاب کے قفس میں بند ہیں پہلے یہ چہچہا چکے ہیں مگر اب فردوس گوش تو خیر نہ بن سکیں گے البتہ خدا کرے جہنم نظر ثابت نہ ہوں۔ میں نے ریڈیو کے لیے جس قدر بھی تمثیلیں لکھی ہیں ان سب میں اپنے مزاج کا رنگ غالب رکھنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے اعتراف ہے کہ کہیں ڈرامائی ضرورتوں نے مجھے بہکا دیا ہے اور کہیں ریڈیو کے حدود نے مجھ کو کھل کھیلنے سے باز رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ مزاح تو خیر آپ کو ضرور ملے گا مگر کہیں کہیں بے ساختگی کو آپ محتاط پائیں گے۔ اس کے باوجود اگر ان تمثیلوں میں آپ کو میں زندہ نظر آؤں تو داد دیجیے گا۔''[2]

شوکت تھانوی کے ڈراموں کی ایک کتاب کا نام ہے ''غالب کے ڈرامے'' اس کے ٹائیٹل پر لکھا ہوا ہے ''غالب کے ڈرامے جنہیں شوکت تھانوی نے لکھا''۔ اس کتاب کو محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کو ریڈیو پاکستان کی اجازت سے چھاپا گیا۔ کیونکہ اس کتاب میں شامل تمام ڈرامے ریڈیو

---

[1] شوکت تھانوی: ''سنی سنائی''، مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور، ص ۸، ۹۔

[2] ایضاً، ص ۹، ۱۰۔

پاکستان لاہور سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے۔ شوکت تھانوی نے اپنی تمثیلوں کے لیے مرزا غالب کے اشعار کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کا جواب وہ اس کتاب کے "عذر گناہ" میں اس طرح دیتے ہیں:

> "میں نے مرزا کے اشعار سے مختلف تمثیلی موضوع نچوڑنے کی ایک کوشش کی ہے جو اس مجموعے کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرزا کے زیر بحث اشعار کا صحیح نچوڑ وہی ہے جو میرے ہاتھ آیا ہے مگر اسی بہانے چند تمثیلوں کا مل جانا ہی کیا کم ہے اور ان تمثیلچوں کی طرف اگر غالب کے نام کی آڑ لے کر میں لوگوں کو چونکا کر متوجہ کر سکوں تو آخر اس بہانہ سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ غالب کے بے شمار اشعار میں اس قسم کے موضوع موجود ہیں بلکہ غالب ہی پر کیا منحصر ہے ہر شاعر کا ہر شعر کوئی نہ کوئی پلاٹ تو رکھتا ہی ہے مگر بے چارے غالب کو جہاں اور لوگوں نے تختۂ مشق بنایا ہے وہاں ایک میں بھی سہی۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ قیامت کے دن ان کا ہاتھ اور میرا گریبان ہوگا اور میں کہوں گا کہ مرزا صاحب آپ کے شارحین سے زیادہ تو میرا جرم نہیں اور غالباً اسی ایک بات پر مرزا صاحب معاف فرما دیں گے۔"[۱]

شوکت تھانوی کی یہ کتاب دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں چودہ ڈرامے شامل کیے گئے ہیں یہ ڈرامے غالب کے جن اشعار پر مبنی ہیں، وہ یہ ہیں:

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

۱۔ شوکت تھانوی: غالب کے ڈرامے۔ مطبوعہ سویرا آرٹ پریس لاہور، بار اول، ص ۳۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیان ہوگئیں

شوکت تھانوی نے غالب کے اشعار کے حوالے سے ان ڈراموں کا پلاٹ تیار کیا ہے۔ پہلے ڈرامے میں طلعت اپنی تعلیم کے سلسلہ میں اپنے چچا کے یہاں قیام پذیر ہے جن کا بیٹا شکیل زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت بے تکی باتیں کرتا رہتا ہے طلعت کو اس کی یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔ ایک روز تنگ آ کر وہ اپنی خالہ زاد بہن نجمہ کے یہاں اس ارادے سے چلی جاتی ہے کہ اب کبھی اس گھر میں واپس نہیں آئے گی۔ شکیل کی سالگرہ کے دن طلعت کے والد صاحب تشریف لاتے ہیں اور اسے مجبوراً اپنے چچا کے گھر جانا پڑتا ہے جس پر شکیل، طلعت کے پاس آ کر چپکے سے یہ شعر پڑھتا ہے:

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ایک اور ڈرامے میں نزہت کے شوہر شفقت تعلیم حاصل کرنے ولایت جاتے ہیں تو نزہت نے نہ صرف انگریزی پڑھنا بلکہ اپنے آپ کو انگریز بنانے کی کوشش بھی شروع کر دی تاکہ شوہر جب ولایت سے واپس آئے تو اس میں یہ تبدیلیاں دیکھ کر خوش ہو۔ شفقت ولایت سے واپس آئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نزہت نے اپنے لمبے اور گھنیرے بال کٹوا کر گھونگروالے بال بنوا لیے ہیں۔ شفقت نے نزہت کی اس حرکت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ نزہت نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ چند دن کے بعد یہ بال خود بخود بڑے ہو جائیں گے جس پر شفقت نے کہا کہ وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ بڑھ جائیں گے مگر

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یہ اس کتاب کا پانچواں ڈرامہ ہے۔ تمام ڈراموں میں اشعار کے مفاہیم کے اعتبار سے ایک کہانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے ایک کامیاب کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔

"پاکستان ہمارا" ایک مقبول ریڈیائی پروگرام تھا، جس سے شوکت تھانوی کی وابستگی کسی قدر تفصیل چاہتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فوراً بعد مغربی پنجاب میں اخلاق و معاشرتی حالات بہت المناک صورت اختیار

کر چکے تھے ۔ مسلمانوں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ۔ دہشت کے مختلف حربے استعمال کرکے انہیں مشرقی پنجاب سے نکالا جا رہا تھا ۔ ہر روز ان کے قافلوں پر سفاکانہ حملے کیے جاتے تھے ۔ ریل گاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں زخمی یہاں پہنچتے تھے جس کی وجہ سے افراتفری کا دور دورہ معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا تھا ۔ ان حالات کے پیش نظر ضرورت اس امر کی تھی کہ ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمانوں کی حالت زار پر ہمدردی سے غور کیا جائے اور ان کا "مورال" بلند کرنے کی کوشش کی جائے ۔

ظفرالاحسن نے جو اس زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے، سید امتیاز علی تاج سے فرمایا کہ :

> "مہاجر طرح طرح کی مصیبتیں سہ کرکے برے حالوں پاکستان پہنچ رہے ہیں اور ان کا مورال مجھے کچھ اونچا نظر نہیں آتا ۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روزانہ اخباروں کے پہلے صفحے پر کچھ جگہ اس غرض کے لیے مخصوص کرانے کی کوشش کروں کہ اس میں لوگوں کا مورال اونچا کرنے کے لیے آپ روزانہ مناسب مضامین لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں"۔ ۱

سید امتیاز علی تاج نے ظفرالاحسن کی اس بات پر کچھ روز غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ کئی اخباروں کے لیے مضامین لکھنا نہ صرف محنت طلب کام ہے بلکہ اس سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے ۔ اس لیے انہوں نے ظفرالاحسن کو بتایا کہ یہ خدمت ریڈیو پاکستان کے ذریعے انجام دینے کی کوشش کی جائے ۔ ظفرالاحسن نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا، چنانچہ سید امتیاز علی تاج نے لاہور سے نشر کرنے کے لیے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کیا، ریڈیو کے افسروں سے تفصیلی بحث ہوئی ۔ انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا ۔ پروگرام کا نام "پاکستان ہمارا" تجویز ہوا ۔ ریڈیو پاکستان کے افسروں نے سید امتیاز علی تاج کی معاونت کے لیے شوکت تھانوی کو مقرر کیا ۔ سید امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں یہ بتایا ہے کہ وہ یہ پروگرام کس طرح تیار کرتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

۱۔ سید امتیاز علی تاج : نقوش، لاہور، شوکت نمبر، ستمبر، ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۴ ۔

"ہم دونوں ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ کام کرنے کا طریق یہ تھا کہ صبح کو دفتر پہنچتے ہی طے کرتے کہ اس دن کے پروگرام کا موضوع کیا ہوگا۔ موضوع کے انتخاب میں اخباروں کی خبریں اور رپورٹروں کی رپورٹیں ہماری رہنمائی کرتیں۔ ان دونوں ذریعوں سے امداد نہ ملتی تو عام حالات کا خیال کرکے ایک دوسرے کے مشورے سے کوئی مناسب موضوع خود طے کر لیتے۔ جو موضوع بھی طے ہوتا اس پر کلام پاک، حدیث اور تاریخ میں سے ایسی چیزیں نکالتے جن سے اسلامی نقطۂ نظر واضح ہوتا۔ اس کے بعد ہنگامی حالات پر توجہ کی جاتی۔ کیمپوں کے واقعات پر مکالمے، اسکٹ، نظمیں وغیرہ لکھنا تجویز ہوتا۔ یوں بہت سی اہم اور مفید مطلب چیزوں کی ایک فہرست دوپہر سے پہلے تیار ہو جاتی۔ اس کے بعد ہم کام تقسیم کرتے کہ فہرست کی کون کون سی چیزیں شوکت لکھیں گے اور کون کون سی میں۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں لکھنے میں مصروف ہو جاتے اور سہ پہر تک اپنے اپنے حصے کی تحریریں تیار کر لیتے اور ایک دوسرے کو سناتے دونوں ایک دوسرے کی چیزوں پر بے تکلفی سے اظہار رائے کرتے اور جو قائل ہو جاتا وہ اپنی چیز دوبارہ لکھتا یا اس میں ترمیم کر دیتا۔ نقلیں تیار ہونے کے لیے مسودہ کئی لوگوں کو دے دیا جاتا۔ نقلیں تیار ہو کر آتیں تو جلدی جلدی ہم انہیں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ پھر مختلف حصے مختلف آوازوں کے سپرد کرکے ان کی ریہرسل کراتے۔ اتنے میں براڈکاسٹ کا وقت ہو جاتا۔ اس میں حسب ضرورت حصہ لیتے۔ راوی کے جملے میں بولتا۔ شوکت عموماً کسی اسکٹ میں حصہ لیا کرتے تھے"[1]۔

"پاکستان ہمارا" کے سلسلہ کے یہ پروگرام حیرت انگیز حد تک پسند کیے گئے۔ ریڈیو کی تاریخ میں اس پروگرام کی غیر معمولی مقبولیت ایک بے مثال واقعہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا ایک واقعہ سید امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

---

[1] سید امتیاز علی تاج: شوکت نمبر، نقوش، ستمبر، ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۵، ۵۰۳۔

''مجھے یاد ہے کہ ایک روز صبح صبح ہمیں اطلاع ملی کہ کئی مہاجر جو ٹھکانہ میسر نہ آنے کے باعث کہیں ریلوے لائن کے قریب سردیوں کے آسمان تلے پڑے رہے تھے، رات میں ٹھٹھر کر جاں بحق ہو گئے۔ یہ اطلاع پا کر سبھی بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس روز کا پروگرام ہم نے شدید احساس درد کے ساتھ لکھا۔ اس پروگرام کے لیے شوکت نے ایک نظم ''بعد از وقت'' کہی، جس کا مضمون یہ تھا کہ کوئی سوشل ورکر کسی مہاجر عورت کی بچی کے لیے کمبل لے کر پہنچتا ہے تو بچی سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکی ہے۔ نظم مؤثر تھی اور بہت خوبی سے پڑھی گئی۔ سارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ سننے والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ چنانچہ اگلے روز بیت المال سے اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے نام فون آیا کہ پچھلی شام کا پروگرام سن کر لوگ گرم کپڑے اور لحاف اور توشکیں لے لے اتنی زیادہ تعداد میں بیت المال پہنچ رہے ہیں کہ ان سب کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنا ہمارے سٹاف کے لیے ناممکن ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات سے پیدا ہو رہی ہے کہ عورتیں اپنی طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بالیاں لے لے کر آ رہی ہیں۔ ان زیوروں کو وصول کرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زیوروں کو تولنے یا ان کی صحیح قیمت جانچنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں۔ . . . براہ کرم ریڈیو کے ذریعے خواتین کو ہدایت دیجیے کہ وہ بیت المال کو اپنے زیور فی الحال نہ دیں''۔[1]

''پاکستان ہمارا'' کے نام سے یہ پروگرام ہر روز شام کو آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوتا تھا۔ اس پروگرام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایک مزاحیہ کردار تخلیق کیا گیا۔ جس کا نام شوکت تھانوی نے ''قاضی جی'' تجویز کیا۔

مزاحیہ کردار ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں کسی ایک معاشرے کے تمام انسانوں کی خامیوں اور ناہمواریوں کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ کسی ایک فرد کا چربہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک مخصوص معاشرے کے تمام افراد کی مجموعی خامیوں اور کمزوریوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ مزاحیہ کردار کا یہی پہلو اس کا

---

[1] سید امتیاز علی تاج: نقوش، شوکت نمبر، ستمبر، ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۹۔

جواز بھی ہے اور اس کے قبول عام کی ضمانت بھی ۔ کیونکہ اس میں جو عکس نظر آتے ہیں انہیں دیکھنے والا دوسروں کی خامیاں سمجھتا ہے ، اپنی نہیں ۔ حالانکہ اس کا عمل اور فکر غیرارادی اور غیرشعوری طور پر اس سے متاثر ضرور ہوتی ہے ۔ مزاحیہ کردار کے پرتو میں ہم دوسروں کی خامیوں پر ہنستے ہیں ، قہقہے لگاتے ہیں اور خود کو ان خامیوں اور کمزوریوں سے بلند تصور کرتے ہیں ۔

مزاحیہ کردار کی یہ تمام خصوصیات ہمیں ''قاضی جی'' میں نظر آتی ہیں ۔ اسی لیے اردو ادب کا ہر ناقد ''قاضی جی'' کو اردو کے مزاحیہ کرداروں کی مختصر فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتا ہے ۔ ''قاضی جی'' کی تین جلدیں ادارۂ فروغ اردو'' لاہور نے نقوش پریس سے چھپوا کر شائع کیں ۔ سید امتیاز علی تاج نے ''قاضی جی'' حصہ اول کے دیباچہ میں ''قاضی جی'' کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

> ''ایک برخود غلط قسم کے بزرگ ، لکیر کے فقیر ، پاکستان سے اس لیے نالاں کہ اس نے آپ کو بعض اذلی آسائشوں سے محروم کر دیا ہے ۔ لیکن ان تمام جائز و ناجائز مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کمربستہ جو پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پیدا ہو گئے ہیں ۔ غرض پرستی اور تن آسانی کے گئے گذرے عہد کی یادگار ۔ ان تمام صفات سے کورے جو قومی و اخلاقی استحکام کی جان سمجھی جا سکتی ہیں ۔ دخل در معقولات میں انتخاب ۔ کج بحثی میں لاجواب ۔ غرض چھوٹی بڑی کمزوریوں کی ایک طرفہ معجون ۔ بحیثیت مجموعی ایک ایسی شخصیت جس کے کھوکھلے پن کو بازار کا ایک عام شخص بھی پورے طور سے محسوس کرکے اپنی برتری کی لذت سے بہرہ اندوز ہو سکے ۔ ان بزرگوار کو ''قاضی صاحب'' کے نام سے یاد کرنے میں غالباً ''شہر کے اندیشے'' نے شوکت صاحب کی رہنمائی کی ہوگی ۔''[1]

سید امتیاز علی تاج نے شوکت تھانوی کے ''قاضی جی'' کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے ۔ ''قاضی جی'' کی تینوں جلدیں پڑھنے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کردار متعدد مقامات پر ابھرتا اور ڈوبتا ہے ۔ یہ ایک

۱۔ سید امتیاز علی تاج : دیباچہ ، قاضی جی ، حصہ اول ، مطبوعہ نقوش پریس ، لاہور ، ص ۴ ، ۵ ۔

مکمل مزاحیہ کردار کی شکل وہاں اختیار کرتے ہیں جہاں ان کے بندھے ٹکے نظریات اور خیالات، معاشرہ کے حالات اور بحران سے متصادم ہوتے ہیں ۔ یہ تصادم ان کے ذہن میں ایک عجب قسم کی کشمکش کو جگہ دیتا ہے اور ہر شخص کو اپنے نظریات اور عمل سے غیر متفق پا کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں چونکہ ان کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل یقین ہے اس لیے اپنی خامیاں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور وہ دوسروں کو تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں ۔

شوکت تھانوی نے ۱۹۴۷ عیسوی میں یہ پروگرام لکھنا شروع کیا اور ۱۹۶۳ عیسوی تک لکھتے رہے ۔ یہ پروگرام لاہور، کراچی اور راولپنڈی ریڈیو اسٹیشنوں سے پیش کیا جاتا رہا ۔ اس پروگرام میں بیگم خورشید حفیظ جالندھری بھی حصہ لیا کرتی تھیں ۔ وہ ایک مضمون میں ''قاضی جی'' کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرتی ہیں ۔ وہ لکھتی ہیں :

> ''شوکت بھائی نے ایک فیچر پروگرام خود لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا ۔ جس کا عنوان تھا ''قاضی جی''۔ عوام نے شوکت بھائی کے قاضی جی کو بہت پسند کیا ۔ گھر گھر قاضی جی کی شہرت کا چرچا تھا غرض قاضی جی بہت مقبول ہوا ۔ شوکت بھائی قاضی جی کا رول خود کرتے تھے اور ان کی لاڈلی اکلوتی زبیدہ بہن کا کردار میں ادا کرتی ۔ ان کی بیوی موہنی داس بنی اور بیوی کے بھائی کا پارٹ مقبول احمد ادا کرتے ۔ لاہور سے قاضی جی سات سال تک برابر ہر پیر کی شام سوا آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک نشر ہوتا رہا ۔''[۱]

بیگم خورشید حفیظ جالندھری کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قاضی جی ہفتہ میں صرف ایک بار یعنی سوموار کو نشر ہوا کرتا تھا جبکہ ''پاکستان ہمارا'' روزانہ نشر ہوتا تھا ۔

''قاضی جی'' حصہ اول میں چوبیس (۲۴) حصہ دوم میں بیس (۲۰) اور حصہ سوم میں انیس (۱۹) ڈرامے شامل کیے گئے ہیں ۔ اس طرح ان ڈراموں کی کل تعداد تریسٹھ بنتی ہے ۔ جبکہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے ڈراموں کی تعداد سید امتیاز ناصری کے بقول کم از کم چھ سو ہے ۔

---

[۱] بیگم خورشید حفیظ جالندھری : مضمون ''میں اور شوکت بھائی'' نقوش، شوکت نمبر ص ۵۶۲ -

یہ ڈرامے پہلے لاہور سے پھر کراچی سے اور پھر راولپنڈی سے نشر ہوتے رہے۔ سید انصار ناصری کی اس بات کی تائید سید امتیاز علی تاج کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”کوئی ایک سو پروگرام لکھنے اور پیش کرنے کے بعد تھک کر میں نے ریڈیو پاکستان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ شوکت کا تعلق چونکہ اس محکمہ سے مستقل تھا، وہ اس کام میں برابر مصروف رہے۔ تین چار مہینے کی اس یکجائی سے میرے اور شوکت کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔“[1]

اختر جہاں نومبر ۱۹۶۱ء میں ”قاضی جی“ کے فنکاروں میں شامل ہوئیں۔ انہیں نسوانی کردار کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہ لکھتی ہیں:

> ”پہلے پروگرام میں، میں گھبرا گئی۔ مارے رعب کے زبان لڑکھڑائے جاتی تھی۔ دوسرے ہفتے مسودہ کی ریڈنگ کے بعد شوکت صاحب نے خود ہی کہا ”پہلی مرتبہ آپ کی آواز میں تکلف تھا۔ گھبرائیے بالکل نہیں اگر غلطی ہو گئی تو میں سنبھال لوں گا بالکل نڈر ہو کر بولیے“ شوکت صاحب کا یہ فقرہ مجھے اس طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی جیسے میں اپنے کانوں سے ان کی آواز سن رہی ہوں۔ دوسرا پروگرام پہلے سے بہتر ہوا۔ شوکت صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میری جھجک اور ڈر رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا۔“[2]

اختر جہاں کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت تھانوی اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اختر جہاں سے راقم الحروف نے ۲۹، اگست ۱۹۷۸ء کو ان کے گھر ۸۔ م۔ ڈی۔ سٹیلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی میں ملاقات کی اور شوکت تھانوی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران اپنی گفتگو میں بھی اور اپنے ایک مضمون میں بھی یہ بتایا کہ شوکت تھانوی نے ”قاضی جی“ کا آخری پروگرام ۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو ریکارڈ کروایا۔ کئی پروگرام اکٹھے ریکارڈ کروا لیے گئے تھے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ”سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہفتے ہوتے ہیں۔ ہفتوں کا یہ خیالی الم

۱۔ سید امتیاز علی تاج: نقوش، شوکت نمبر ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۶، ۵۰۷۔

۲۔ اختر جہاں: نقوش، شوکت نمبر ”شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوئے“ ص ۵۶۶، ۵۶۷۔

> جس میں شوکت صاحب کی ہنستی، چہکتی، مسکراتی تصویریں ہیں۔ زندگی سے بھرپور، زندگی کی تلخیوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی، اس البم کی آخری تصویر ۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء کی ہے۔ اس روز شوکت صاحب مضمحل اور خاموش سے تھے۔ میں نے مزاج پرسی کی، بہت مختصر سا جواب دیا۔ میں ڈر گئی۔ کبھی کبھی شوکت صاحب کراہ کر پہلو بدلتے تھے اور بار بار کھانستے تھے لیکن پیشانی پر کوئی ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ پروگرام اکٹھے ریکارڈ کیے گئے۔ ۱۶ مارچ کو ریڈیو اسٹیشن سے شوکت صاحب کے آخری قدم گئے۔ اس کے بعد میں شوکت صاحب کو نہ دیکھ سکی۔''[1]

اختر جہاں کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شوکت تھانوی نے قاضی جی کے سلسلہ کا آخری پروگرام ۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو ریکارڈ کروایا۔ اس طرح نومبر ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۶۳ء تک شوکت تھانوی کا تعلق ریڈیو پاکستان سے رہا۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے نہ صرف ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامے تحریر کیے بلکہ بچوں کا پروگرام اور عورتوں کے پروگرام کے لیے بھی بہت کچھ لکھتے رہے۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری اپنے ایک مضمون میں عورتوں کے پروگرام کے بارے میں تحریر کرتی ہیں:

> ''ان ہی دنوں شوکت بھائی نے عورتوں کے پروگرام میں ''خالہ جان'' کے نام سے ایک فیچر پروگرام لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا جس میں فلم ایکٹرس بیبو خالہ جان بنتی تھیں اور ان کی بھابی کا کردار میں کرتی اور خود شوکت بھائی ایک بیکار نااہل امیدوار لڑکے کا رول کرتے تھے جو خالہ جان کی چہیتی بھانجی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ لڑکا جب بر دکھاوے کے لیے پیش کیا گیا تو اس کی ماں نے اس کی ہزاروں خوبیاں بیان کیں مگر برعکس اس کے لڑکا توتلا اور ہکلا تھا۔ کانوں سے اونچا سنتا تھا۔ ان پڑھ تھا اور بہت سی ایسی ہی قسم کی خوبیوں کے باوجود اشاروں میں بات کرنے کا ماہر تھا۔ لڑکی کو اس کی شکل سے ہی سخت چڑ تھی، شادی کیا خاک ہوتی۔ یہ پروگرام

۱۔ اختر جہاں: نقوش، شوکت نمبر ''شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوئے''، ص ۵۸۶۔

بھی بہت ہی دلچسپ تھا ۔''[۱]

شوکت تھانوی جس زمانے میں لکھنؤ ریڈیو سے منسلک رہے اس زمانے میں ہر ریڈیو اسٹیشن کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی تھی ۔ مثلاً لاہور ریڈیو اسٹیشن ڈراموں کے لیے مشہور تھا ۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن تقاریر کے لیے مخصوص تھا ۔ بمبئی میں کلاسیکی موسیقی کے اعلیٰ فن کار اور موسیقار جمع تھے اس لیے وہاں موسیقی کے پروگرام نمایاں حیثیت رکھتے تھے ۔ لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں فنکاروں ، ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر چند اہل ذوق موجود تھے اور یہ سب فن کے میدان میں مجاہدانہ زندگی بسر رہے تھے ۔

شوکت تھانوی کی ریڈیو سے وابستگی کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ان کے سال وفات ۱۹۶۳ء تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے ۔ اس عرصہ میں شوکت تھانوی نے نہ صرف بہت سے پروگرام تحریر کیے بلکہ صداکار کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا ۔ ''قاضی جی'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ سید انصار ناصری نے راقم الحروف کو ایک ملاقات میں بتایا کہ جب لکھنؤ ریڈیو سے ''منشی جی'' پیش کیا جاتا تھا تو اس وقت شوکت تھانوی کی آواز کو ''منشی جی'' کے لیے مناسب نہیں سمجھا گیا ور رونق علی کا انتخاب ''منشی جی'' کے لیے کیا گیا ۔ جب کبھی رونق علی اپنی مصروفیات کی وجہ سے دستیاب نہ ہوتے تو شوکت تھانوی اپنے گلے میں پان دبا کر اسی طرح کی آواز نکالنے کی کوشش کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اس فن میں ماہر ہوتے چلے گئے ۔ پاکستان بننے کے بعد جب قاضی جی کا سلسلہ ریڈیو پاکستان لاہور سے شروع کیا گیا تو شوکت تھانوی نے ''منشی جی'' کے انداز میں ''قاضی جی'' کا کردار ادا کرنا شروع کیا ۔ شاہد احمد دہلوی اپنے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی اداکاری اور نقالی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے ۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا ، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے ، لکھنے میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا ، قلم برداشتہ لکھتے تھے ، اچھا لکھتے تھے

۱۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری : نقوش ، شوکت نمبر ''میں اور شوکت بھائی'' ص ۵۶۲ ۔ ۵۶۳ ۔

اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انہوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر ''منشی جی'' شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو ''منشی جی'' نے ''قاضی جی'' کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا۔ پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روح رواں ''قاضی جی'' تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں تک اکثر سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کرتا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنت میں رہتے تھے۔ مگر ہر معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ ان کے پوپلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں بھولی بھولی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقال پیدا ہو گئے تھے اور محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے، وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے تھے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سینکڑوں مسودے لکھے اور میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈ کاسٹ سنے۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا، سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی''۔[1]

شاہد احمد دہلوی کے اس اقتباس سے قاضی جی کی مقبولیت واضح ہوتی ہے۔ اس کی مقبولیت کی اصل وجہ یہی تھی کہ انھوں نے شروع سے آخر تک اس کا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی اور جو شگفتگی ان کے اولین پروگراموں میں پائی جاتی تھی وہی شگفتگی اور تازگی آخر

۱۔ شاہد احمد دہلوی: (شوکت تھانوی) نقوش شوکت نمبر ص ۳۶۲، ۳۶۳۔

تک برقرار رہی اس لیے یہ پروگرام عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول رہا ۔

سید انصار ناصری صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ لکھنؤ ریڈیو کے آغاز سے ہی شوکت تھانوی نے بچوں کا پروگرام شروع کیا تھا جس میں وہ "چاچا" بنتے تھے وہ اسی طرح بولتے تھے جس طرح قاضی جی بولتے ہیں اس پروگرام میں ہمایوں قر "بدھو میاں" بنتے تھے جو ایک توتلا سا لڑکا ہوتا تھا ۔ جب تک شوکت تھانوی لکھنؤ رہے یہ پروگرام باقاعدگی سے لکھتے بھی رہے اور کرتے بھی رہے ۔ اس کی مدت ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک بنتی ہے ۔ اس کے علاوہ خطوط کے جوابات بھی لکھا کرتے تھے ۔ مشاعرے کے اعلان کیا کرتے تھے ، اسٹیج سیکرٹری کے فرائض شوکت تھانوی سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا ۔ منظوم اعلان کیا کرتے تھے مثلاً جس مصرعِ طرح میں مشاعرہ ہو رہا ہے اسی زمین اور اسی بحر میں وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ابھی فلاں صاحب اپنے شعر سنا رہے تھے ان کا حاصل غزل شعر یہ تھا اور اب فلاں صاحب تشریف لا رہے ہیں ۔ یہ سب باتیں وہ منظوم کرتے تھے ۔

عورتوں کا پروگرام لکھتے وقت وہ عورتوں کی زبان اور بیگماتی محاورے لکھنے کے ماہر تصور کیے جاتے تھے ۔ اس لیے زیادہ تر پروگرام وہ ہی لکھا کرتے تھے ۔ ضرورت پڑنے پر وہ نسوانی آواز بھی بنا لیا کرتے تھے ۔ شوکت تھانوی کے تمام ہم عصر عام طور پر اور سید انصار ناصری ، عشرت رحمانی ، سید امتیاز علی تاج خاص طور پر متعدد مضامین میں ان کی صداکاری کی تعریف کر چکے ہیں ۔ راقم سے انٹرویو کے دوران سید انصار ناصری اور عشرت رحمانی نے شوکت تھانوی کی ان صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے ہر کام میں کوئی نہ کوئی خوبی پیدا کر دیا کرتے تھے ۔

۱۹۳۹ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو شوکت تھانوی نے وہاں ملازمت اختیار کر لی ۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے ایک تو سیکڑوں ڈرامے فیچر تحریر کیے دوسرے انھوں نے اداکاری اور صداکاری کے جوہر بھی دکھائے ۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا اور لاہور ریڈیو اسٹیشن سے "قاضی جی" پیش کر کے اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا لوہا منوایا ۔

ریڈیو کے علاوہ شوکت تھانوی فلم سے بھی وابستہ رہے۔ سب سے پہلے وہ ۱۹۴۳ء میں لاہور کی پنچولی آرٹ پکچرز میں بحیثیت مصنف شامل ہوئے لیکن جلد ہی یہاں کے ماحول سے گھبرا کر ملازمت ترک کر دی اور مالک بیاسی آرگنائزیشن میں ملازمت اختیار کر کے یو۔ پی چلے گئے۔ لیکن جب یہ محکمہ ختم ہو گیا تو ۱۹۴۶ء میں پھر پنچولی آرٹ پکچرز میں آ گئے۔ دل سکھ ایم پنچولی اس کے مالک تھے۔ مسلم ٹاؤن میں ان کا سٹوڈیو تھا، جہاں آج کل پاسپورٹ آفس بنا ہوا ہے۔ ایک اسٹوڈیو نہر کے پل پر تھا جسے ماڈل اسٹوڈیو کہا جاتا تھا۔ ریڈیو کی طرح فلم میں بھی سید امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ سید امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ:

> "ایک فلم کمپنی نے مجھ سے اسکرین پلے لکھنے اور ڈائریکٹ کرنے کی فرمائش کی تو اس کی مکالمہ نویسی میں نے شوکت کے سپرد کر دی"۔[۱]

فلم میں شوکت بحیثیت مصنف ہی شامل نہ رہے بلکہ ایک فلم میں اداکاری کر کے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ "گلنار" فلم میں انہوں نے "نواب دلشاد" کا پارٹ ادا کیا۔ اس پارٹ کے ذریعے شوکت اسکرین پر پہلی بار آئے۔ پرانے ایکٹر جب انہیں مکالمہ بولتے ہوئے سنتے تو ان کے لہجہ کی تازگی اور اچھوتے پن کو دیکھ کر جلتے تھے اور انہیں یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کرتے تھے کہ کمرے میں بیٹھ کر مکالمے بولنا اور بات ہے اور اسٹوڈیو کی چکا چوند روشنی اور کیمرے کے سامنے مکالمے بولنا دوسری بات ہے، وہاں سب جملے اور تمکنتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ شوکت تھانوی خاموشی سے ان سب کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ سید امتیاز علی تاج نے شوکت کے اسکرین پر آنے کی تصویر بہت اچھے الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کی ہے:

> "سیٹ پر شوکت کا پہلا شاٹ مجھے بخوبی یاد ہے۔ نہ جانے کہاں سے وہ کسی لکھنوی نواب کی تصویر لے آئے تھے۔ مجھے دکھا کر

۱۔ سید امتیاز علی تاج: نقوش شوکت نمبر، ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۷۔

اپنا میک اپ اس کے مطابق کرایا۔ مناسب کپڑے کا انگرکھا اپنی نگرانی میں سلوایا۔ اس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور دہلی کی جوتی پہن کر اور سر پر دوپلی ٹوپی رکھ کر سیٹ پر آئے تو جس نے دیکھا یہی کہا کہ عین مین لکھنؤ کے نواب معلوم ہوتے ہیں۔ سین یہ تھا کہ نواب دلشاد صولت کے ہاں اپنے مصاحبوں سمیت مشاعرے میں آئے ہیں۔ ڈیوڑھی میں صولت ان کا استقبال کرتا ہے اور اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے جاتا ہے جہاں محفل مشاعرہ کا اہتمام ہے۔ شوکت بڑے اعتماد سے سیٹ پر آئے۔ روشنیاں ٹھیک جما لی گئیں۔ ایک دو ریہرسلیں بھی خاطر خواہ ہو گئیں اور اس کے بعد ''ٹیک'' کا مرحلہ آیا۔ ریہرسل میں شوکت کی خود اعتمادی دیکھ کر ایک پرانے ایکٹر نے ان کا پہلا شاٹ خراب کرنے کے لیے ایک نامناسب حرکت کی۔ شاٹ لینے کے لیے جب میں بلند آواز سے ''خاموش رہیے'' کہہ چکا تھا اور شوکت شاٹ دینے کے لیے موڈ میں تیار کھڑے تھے تو وہ صاحب لپک کر ان کے قریب پہنچے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے ان کے انگرکھے کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے ''خوب کپڑا ہے، کے روپے گز کا ہے؟'' لیکن ان حضرت کی اس کوشش کے باوجود شوکت نے اپنے پہلے شاٹ میں ایسی ساختہ بے ساختگی سے کام لیا اور تمام تفاصیل کو ایسے مکمل طور پر صحیح ادا کیا کہ شاٹ ختم ہونے پر ''کٹ'' کی آواز کے ساتھ ہر طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے شوکت سے مصافحہ کیا۔ شوکت اپنی کامیابی سے بے حد خوش ہوئے۔ پھر تو انہوں نے ایسے بے دھڑک طریقے سے شاٹ دیے گویا انہیں احساس ہی نہ تھا کہ سیٹ پر کیمرہ بھی کام کر رہا ہے''۔[1]

بہت سے پرانے لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ شوکت تھانوی نے نواب دلشاد کا کردار ایسے کمال سے پیش کیا کہ لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، حرکات و سکنات ہر اعتبار سے وہ لکھنوی نواب لگتے تھے۔ شوکت تھانوی نے اس فلم کے مکالمے بھی تحریر کیے تھے

---

[1] سید امتیاز علی تاج: نقوش شوکت نمبر، ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۸۔

شوکت تھانوی کے ڈراموں کا فنی تجزیہ

عمرانیات کا مسلمہ اصول ہے کہ نظام کہنہ، نظام نو کے لیے ہر حالت میں جگہ خالی کرتا ہے۔ بعض پرانے معاشرتی و تمدنی قوانین اپنی افادیت کی بنا پر اس فطری تغیر و تبدل میں بھی زندہ رہتے ہیں۔ لیکن اکثر قوانین اس انقلاب نو کے مطالبات کے پیش نظر اپنی مقصدیت زائل کر دیتے ہیں اور وقت انہیں طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔ عہد قدیم سے ایسا ہوتا آ رہا ہے اور جب تک معاشرے کا تصور زندہ ہے ایسا ہوتا رہے گا۔ اس تاریخی ''تقدیر'' سے زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی قدر مبرا نہیں۔ کوئی فن، کوئی تحریک، کوئی رجحان اور کوئی صنعت ایسی نہیں جو متاثر نہ ہوتی ہو۔ نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ادب کو نئے نئے تجربات کرنے پڑتے ہیں۔ اصناف سخن بھی اس تمدنی عمل کی بناء پر مروج یا متروک ہوتی ہیں۔ اردو کے معروف ڈراما نگاروں، امانت لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری نے اپنے پیش رو ڈراما نگاروں کے نقش پا کو نشان منزل نہ سمجھا اور نہ ان کی کورانہ تقلید کی، اسی لیے آج ہم بھی ان کی روایات کو توڑنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ روایات دیرینہ کی شکستگی لاکھ سہل و لازمی سہی مگر ان کے آثار پر ہی عمارت نو استوار کی جاتی ہے۔

جدید دور کے یک بابی ڈرامے نے بھی قدیم روایات کے زیر اثر اپنی مخصوص شکل اختیار کی ہے۔ اور آج تقریباً درجن بھر صورتوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔ شوکت تھانوی کا تعلق نشری یک بابی ڈرامے سے رہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں ریڈیو سے بحیثیت مصنف اپنا رشتہ قائم کیا تھا اور ۱۹۶۳ء تک کسی نہ کسی صورت میں یہ رشتہ قائم رکھا۔ اس لیے شوکت تھانوی کی ڈراما نگاری کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ریڈیو ڈراما لکھنے والے کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور شوکت تھانوی ان باتوں یا اصولوں کا خیال رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ ریڈیو ڈراما، اسٹیج ڈراما، ٹیلی ویژن ڈراما اور فلمی ڈراما سے کافی حد تک مختلف ہے۔ ان سب کا مقصد یقیناً ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن ریڈیو میں اس مقصد کے حصول کے لیے وسائل قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ریڈیو ڈراما در حقیقت کانوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ

ڈراما نگار کی فنی مشاقی، ژرف نگاہی، پرواز تخیل کی بلندی اور میکانکی وسائل کے استعمال پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ ''غائب متکلم'' کو ''حاضر متکلم'' بنا دیتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے کردار سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے، ان کی صرف آواز ہم تک پہنچتی ہے اور جنبش لب نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈرامے کا اسلوب ہی ایسا ہو کہ سامع کی قوت متخیلہ ان کرداروں کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا محسوس کرے اور جہاں یہ کیفیت پیدا ہو جاتے ہیں وہیں حقیقی تاثر کے قیام و استحکام کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈراما نگار کا امتحان بس یہی ہے کہ اس نے لوگوں کو کہ جو ڈراما دیکھنے کے عادی ہیں، ڈراما سننے پر کیسے راغب کیا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب رہا۔

شوکت تھانوی کو بحیثیت مصنف ایک کامیاب ڈراما نگار قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ انہوں نے ایسے دور میں ڈراما نگاری شروع کی جب تھیٹریکل کمپنیوں کا رواج تھا۔ اس رواج کی وجہ سے انہوں نے ریڈیو پر اسی تھیٹریکل کمپنیوں کا انداز اختیار کیا۔ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کے سلسلہ کے ڈرامے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے ڈراموں کی وجہ سے لوگوں نے ریڈیو کے پروگراموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور آہستہ آہستہ ریڈیو ڈرامے عوام میں مقبول ہونے لگے۔ ''منشی جی'' اور ''قاضی جی'' کے سلسلہ کے جو ڈرامے شوکت تھانوی نے لکھے ہیں ان کی مقبولیت تو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شوکت تھانوی کے تمام ہم عصر ان کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مکالمہ ریڈیو ڈرامے کا سب سے اہم جزو ہے۔ حسن گفتار اور قوت ناطقہ انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی کا انحصار اس رابطۂ تکلم سے ہے جو وہ اپنے دوسرے ہم جنسوں سے استوار کرتا ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مکالمہ باتیں بنانے کا نام نہیں ہے بلکہ بات میں سے بات پیدا کرنا در اصل مکالمہ نگاری ہے جس طرح شعر کہنا ایک آسان کام ہے لیکن ایک عمدہ شعر کہنا کہیں مشکل ہے بعینہ مکالمہ گھسیٹنا بہت آسان کام ہے مگر اچھا مکالمہ لکھنا کہیں

زیادہ مشکل۔ ڈراما نگاری کی اہم ترین منزل مکالمہ نویسی ہے جہاں ڈرامہ نگار کو اپنی قوت متخیلہ کے ساتھ اپنی معلومات اور اکتسابی قابلیت کا مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ شوکت تھانوی نے مکالمہ نگاری کرتے وقت مختلف کرداروں میں ہمیشہ حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے۔ ان کے ہر کردار کی زبان اس کے معاشرتی رتبے کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی ذہنی سطح کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

شوکت تھانوی کی مکالمہ نویسی میں دو کرداروں کے مابین مکالمے کا تسلسل بہت عمدگی سے نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے وہ ایک کردار کے مکالمہ کے آخری الفاظ دوسرے کردار کے مکالمہ کے ابتدائی الفاظ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں انتقال خیال اچانک اور ناگہانی نہیں ہوتا بلکہ وہ تدریجاً نئے خیال کی طرف رجوع کرتے ہیں ــــ

شوکت تھانوی شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں اس لیے وہ جب مکالمہ لکھتے ہیں تو کہیں کہیں اشعار بھی چسپاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اشعار کو ایسی مناسب جگہ پر استعمال کرتے ہیں کہ ان کا ایک شعر یا ایک مصرع طویل سے طویل تر مکالمے پر بھاری ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ ان اشعار سے اختصار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات بات شروع کرنے کے لیے وہ اشعار کا سہارا لیتے ہیں۔ جیسے ”ملازمہ کی تلاش“ میں وہ شعر سے آغاز کرتے ہیں۔ موقع یہ ہے کہ باورچی خانہ میں کچھ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چولھا پھونکنے کی مسلسل آوازیں آ رہی ہیں کہ ریاض دور سے گنگناتا ہوا آتا ہے۔

ریاض: (آتے ہوئے):

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

بیوی: اچھا آپ کی بلا سے، چلیے یہی سہی کہ میں نے ہی سب ماماؤں کو نکالا ہے۔ واہ آپ نے تو جیسے میری چڑھ مقرر کرلی ہے۔ ایک تو میں اپنا منہ جھلس رہی ہوں یہاں۔

ریاض: (بات کاٹ کر) دوسرے یہ کہ آپ ہمدردی سے باز نہیں آتے یہی مطلب ہے نا۔

بیوی : اے میں خوب سمجھتی ہوں آپ کی ہمدردی کو۔ اللہ نہ کرے
کسی کا ایسا ہمدرد ہو، جیسے آپ میرے ہیں۔ میری یہ مصیبت
دیکھ کر مارے ہمدردی کے گانا آپ گا لیتے ہیں۔ اس وقت میرا ہاتھ
جل گیا تھا مارے ہمدردی کے ہنسی میں لوٹے جا رہے تھے۔
نوکرانی کا ذکر آیا اور مارے ہمدردی کے طعن طنز شروع کر دیے''۔۹

شوکت تھانوی کے ڈراموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کردار بہت محدود ہوتے ہیں۔ وہ کم سے کم کرداروں کے ذریعے اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے کردار مخصوص صفات کے حامل ہوتے ہیں، مثال کے طور پر منشی جی اور قاضی جی کے کردار یا پھر قاضی جی میں قاضی جی کی بیوی کا کردار—ان مخصوص صفات کی بناء پر سامع ان میں دلچسپی لیتا ہے۔ کرداروں میں نوک جھونک اور اختلافات کی بناء پر تصادم پیدا ہوتا ہے اور اسی تصادم کی وجہ سے ڈراما ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ ''قاضی جی'' میں میاں بیوی کی نوک جھونک اس لیے قابل ستائش ہے کہ یہ ہمارے معاشرے کی ایک سچی تصویر ہوتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنے کرداروں کی آوازوں میں بھی نمایاں فرق پیدا کرتے ہیں تا کہ آوازوں کے تنوع سے انھیں شناخت کرنے میں سہولت ہو۔ وہ اپنے ڈراموں میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرد کی آواز کے ساتھ ساتھ نسوانی آواز کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ ان کے ڈراموں کو دیکھنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ جتنے مرد کردار اپنے ڈرامے میں شامل کرتے ہیں اتنے ہی کردار عورتوں کے بھی ہوتے ہیں اور شاید یہ اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کی آوازوں میں تنوع پیدا ہو اور انھیں آسانی سے شناخت کیا جا سکے۔ قاضی جی اور منشی جی کے سلسلہ کے تمام ڈراموں میں زیادہ سے زیادہ چار کردار پیش کیے جاتے ہیں اور ان چاروں کرداروں کی مخصوص صفات ہیں۔

ریڈیو کے لیے بالعموم مختصر ڈرامے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے شوکت تھانوی ہمیشہ اختصار پسندی سے کام لیتے ہیں۔ مقررہ وقت میں تمام واقعات کو سمیٹنا اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ ڈراما نگار کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ڈرامے کو ہر قسم کے لوگ اور ہر ذوی معیار کے آدمی پسند

۹۔ شوکت تھانوی : ''منی سنائی'' (ملازمہ کی تلاش)، مطبوعہ مرکنٹائل پریس، لاہور ص ۱۶۷، ۱۶۹۔

کریں ۔ اس لیے وہ نہ صرف اسے دلچسپ بلکہ ہر آدمی کے لیے دلچسپ بنانے کی کوشش سے کبھی غافل نہیں ہوتے ۔ شوکت تھانوی کے ڈرامے ہر مکتبۂ فکر اور ہر عمر کے لوگوں میں مقبول ہیں ۔ شوکت تھانوی کے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے تیس منٹ یعنی آدھ گھنٹے کے ہوتے ہیں ۔ اس آدھ گھنٹے میں ہر شخص کے لیے خوشی کا سامان فراہم کرنا اور اسے زندگی سے قریب تر بنا کر زندگی کے مسائل بیان کرنے میں شوکت تھانوی نے گویا مہارت حاصل کرلی تھی ۔

شوکت تھانوی کے بیشتر ڈرامے کسی ایک بنیادی خیال کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کا یہ خیال چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس کی گہرائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی ڈرامائی پیش کش کے لیے سیکڑوں ممکنہ واقعات کو اپنے حلقے میں سمیٹ سکتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے ڈراموں کی کامیابی کا راز اس کے بنیادی خیال کی نفاست ، رفعت ، جامعیت اور کشش میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔ اس خیال کو تحریک مشاہدے سے بھی ملتی ہے اور مطالعے سے بھی ۔ کوئی حیرت افزا منظر ، کوئی دل خوش کن جذبہ ، کوئی ہیبت ناک حادثہ ، کوئی تلخ تجربہ ، کوئی خیال افروز رجحان ، کوئی پرکشش روایت ، غرض ہر وہ ذہنی کیفیت جو سوچنے ، سمجھنے اور محسوس کرنے پر انسان کو مجبور کرے ، ڈرامائی مواد سے لبریز ہوتی ہے ۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو ایک حساس ڈراما نگار کو قدم قدم پر ایسی ترغیبات ملتی ہیں جنہیں ڈرامے کا قالب دیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ شوکت تھانوی کے بیشتر ڈرامے زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ۔

بنیادی خیال متعین کرنے کے بعد ڈراما نگار اس کی فنی صراحت کے لیے ایک کہانی تراشتا ہے ۔ مختلف کرداروں کی آمد و شد سے اس میں حرکت پیدا کرتا ہے ۔ کہانی کو متحرک کرنے کے لیے مفروضی امکانات پر غور کرتا ہے اور ایک مبصر کی نظر انتخاب سے زیادہ منطقی ، نفسیاتی اور ممکنہ امکانات کو ایک دوسرے سے اس خوبی سے منسلک کرتا ہے کہ کہانی کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے ۔ شوکت تھانوی صراحت خیال اور مفروضی امکانات کے لیے اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر بات میں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور واقعات میں سے واقعات نکال کر تسلسل برقرار رکھتے ہیں ۔ ان کے یہاں واقعات کچھ اس مناسبت سے سلسلہ وار سامنے آتے ہیں کہ ڈراما خود بخود تدریجاً تعمیر ہوتا جاتا ہے ۔ شوکت تھانوی وقت کے عنصر کو

مناسب اہمیت دیتے ہوئے واقعات کی روانی پر خاص توجہ دیتے ہیں ان کے یہاں تسلسل واقعات غیر معمولی طور پر "وحدت مکان" کی پابند ہے۔ بقول پروفیسر فصیح احمد صدیقی "اس صراحت خیال یا ڈرامے کے عمل تعمیر کو" پلاٹ کہا جاتا ہے۔[1]

شوکت تھانوی کے بیشتر ڈراموں میں مزاحیہ انداز نظر آتا ہے۔ وہ سنجیدہ مسائل کو بھی ایسے شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سامع بہت دیر تک ان کے جملوں کو دہراتا رہتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے دو کردار "منشی جی" اور "قاضی جی" تخلیق کیے ہیں جو صرف ہنسی پیدا کرنے کے لیے ایک خاص انداز اختیار کرتے ہیں۔ "منشی جی" لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے زیادہ دیر تک نشر نہیں ہو سکا۔ کیونکہ شوکت تھانوی لکھنؤ چھوڑ کر لاہور آگئے تھے، لیکن "قاضی جی" کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک کبھی لاہور ریڈیو اسٹیشن سے، کبھی کراچی سے کبھی راولپنڈی سے متواتر نشر ہوتا رہا۔ یہ کردار دوسروں کی ہنسی اور مذاق اڑا کر مزاح پیدا نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ظرافت کا نشانہ بنتا ہے۔ مضحکہ خیز حرکتوں اور اپنی بات کی تردید کرکے لوگوں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شوکت تھانوی نے اپنے ڈراموں میں فرسودہ روایات، ہوس پرستی، بے دردی و بے رحمی اور نادانی و جہالت پر موقع و محل کی مناسبت سے طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا طنز اتنا ثقیل اور گراں بار نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی اخلاق قدر باقی نہ رہے بلکہ وہ اتنے شگفتہ انداز میں طنز کرتے ہیں کہ سننے والا مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کا طنز کسی ایک شخص پر نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے اور تہذیب کو وہ اپنے طنز کا شکار بناتے ہیں اور اس طنز سے اس تہذیب یا معاشرے کی تکذیب کرنا مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ "برلن کا اسپتال" میں وہ بظاہر ڈاکٹروں پر طنز کر رہے ہیں لیکن باطن میں وہ وہاں کے حکمرانوں اور حکمران پارٹی کے افراد پر طنز کر رہے ہیں کہ وہ کس طرح لوگوں کے ذہن بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جس شخص کا ذہن ان کی سوچ کو قبول نہیں کرتا اسے کس قسم کی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں:

۱۔ پروفیسر فصیح احمد صدیقی: اردو یک بابی ڈراما سیریز، ۵۰ مطبوعہ پریس، بمبئی، ص ۱۷۔

ڈاکٹر : اس کو کیا ہوا ہے ؟

بوائے : حضور اس کی آنکھیں خراب ہیں ۔

دوسرا مریض : میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں ۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ اسپتال ہے ۔ یہ گھڑی لگی ہے ۔ اس میں آٹھ بج کر تین منٹ ہوئے ہیں ۔ یہ ڈاکٹر ہیں ۔ ان کا یہ چشمہ ہے ۔

ڈاکٹر : پھر تمھاری آنکھ میں اور کیا خرابی ہے ؟

دوسرا مریض : کوئی خرابی نہیں میری آنکھوں میں اچھی خاصی روشنی ہے ۔ مجھے کبھی چشمہ تک کی ضرورت نہیں ہوئی ۔ میں فاصلے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہوں اور نزدیک کی بھی ۔ مہین سے مہین چھاپے کی عبارت پڑھ سکتا ہوں ۔

ڈاکٹر : یہ تو سب ٹھیک ہے مگر پھر کیا بات ہے ؟

بوائے : حضور رپورٹ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صورت سے شریف اور راہ راست پر معلوم ہوتا ہے اور ہمارے کمانڈر کی تصویر دیکھ کر کہا صورت سے ظلم برستا ہے ۔

ڈاکٹر : او ہو ۔ یہ تو بہت بڑی آنکھوں کی بیماری ہے ۔ آنکھوں کی پتلیوں نے غلط چیزیں دیکھنا شروع کر دی ہیں اور یہ اندھے ہو جانے کی علامت ہے ۔ تمھاری آنکھیں کبھی دکھنے آئی تھیں ؟

دوسرا مریض : بچپن کے علاوہ کبھی نہیں ۔

ڈاکٹر : کسی غیر ملکی کوئلہ کی کان کا کوئلہ ربل وغیرہ میں تمھاری آنکھ کے اندر کبھی پڑا ؟

دوسرا مریض : کبھی نہیں—اور اگر کبھی پڑا ہو تو یاد نہیں ۔

ڈاکٹر : تمھارے سر میں بھی درد ہوتا ہے ؟

دوسرا مریض : عام طور پر نہیں ۔

ڈاکٹر : اچھا اپنی زبان دکھاؤ ۔ اور ۔ اور ۔ ٹھیک ہے ۔ کیا تم نے اپنے افسر کی تصویر دیکھ کر ظالم سمجھا ؟

دوسرا مریض : میں اس کو ظالم سمجھتا ہوں ۔ وہ قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والوں میں سے ایک ہے ۔ وہ امن و امان کے دشمنوں

کا ساتھی ہے اس کی تصویر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر : اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیل کی رپورٹ غلط ہے ۔ تمہاری صرف آنکھیں ہی نہیں دل و دماغ بھی خراب ہے ۔ آنکھوں کا صرف ایکسس Axis بدل گیا ہے ۔ مگر دماغ الٹی بات سمجھتا ہے اور دل بھی کمزور ہے ۔ (نرس دوڑی ہوئی آتی ہے) ۔

نرس : وہ مریض جو ابھی پولیس لائی تھی ، لیٹنے سے انکار کرتا ہے اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو لیکچر دے کر اپنے جراثیم پھیلا رہا ہے ۔

ڈاکٹر : لیکچر دیتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پر بھی زہر پھیل گیا ہے اس کو آپریشن تھیٹر میں لے چلو ۔ میں اس مریض کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں ۔

دوسرا مریض : کیا اس کی زبان کاٹی جائے گی ؟

ڈاکٹر : اس کی جان بچانے کے لیے جسم کے بیکار اور زہریلے حصہ کو کاٹ ہی ڈالنا پڑے گا ۔

دوسرا مریض : بیچارے کی زبان ۔ اس کی زبان میں کیا خرابی ہے ؟

ڈاکٹر : نازی پارٹی کے خلاف لیکچر دیتا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا خرابی ہوگی اگر اس کی زبان فوراً نہ کاٹی گئی تو نہ صرف وہ تباہ ہو جائے گا بلکہ اس کی چھوت بہت سے تندرستوں کی صحت خراب کر دے گی ۔ اگر کسی مریض کا ہاتھ سڑ جائے تو باقی جسم کو بچانے کے لیے ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہیے اسی طرح اس کی زبان کاٹنا پڑے گی ۔

دوسرا مریض : تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ ظالمانہ چارہ گری سچ بولنے والوں کو سچائی سے ، انصاف پسندی کے حامیوں کو انصاف سے اور امن پسندی کے طرفداروں کو امن سے باز رکھ سکے گی ؟

ڈاکٹر : یہ سب بہت خطرناک بیماریاں ہیں ۔ ہم نے ان بیماریوں کی روک تھام کے لیے نئے نئے آپریشن اور عجیب و غریب

> انجکشن اور دوائیں ایجاد کر لی ہیں جن کا بہت جلد اور بہت اچھا اثر مریض پر ہوتا ہے ۔ سچ بولنے والے بہت سے مریض جھوٹ کے عادی ہو گئے ۔ ایک معمولی انجکشن نے بہت سے امیدواروں کو ایمانداری کا دشمن بنا دیا ۔ بہت سے انصاف پسندی کے مریض ہماری دوا کی دو تین خوراکوں کے بعد انصاف کے نام کو بھول گئے اور سب سے بڑا اور عام مرض انسانیت تو ہم نے اینٹی ہیومن ویکسی نیشن Antihuman Vacination یعنی انسانیت کش ٹیکہ سے ایسا کھویا ہے کہ ہماری لازمی فوج میں یہ مرض نام کو بھی نہیں''۔[1]

شوکت تھانوی اپنے ڈراموں میں معاشرتی مسائل زیر بحث لا کر ان مسائل کو ختم کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں ۔ لکھنؤ ریڈیو سے انھوں نے جتنے ڈرامے پیش کیے ان میں جہاں تہاں ان مسائل کی جھلک نظر آتی ہے اصل مقصد تفریح طبع تھا ، لیکن جب لاہور ریڈیو سے ''پاکستان ہمارا'' اور ''قاضی جی'' کے سلسلے کے ڈرامے پیش کیے تو ان کے مقاصد واضح تھے ۔ مہاجرین کا مورال بلند کیا جائے ، ان کی مدد کی جائے ، ان کی قربانیوں کا احساس کیا جائے اور اپنے نوزائیدہ ملک کی ترقی و ترویج کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے ۔ قاضی جی میں رفتہ رفتہ مسائل نے ایک پھیلاؤ اختیار کر لیا ۔ چور بازاری ، رشوت ، اقربا پروری اور سیاسی ، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے اہم مسائل کو بھی قابل توجہ سمجھا جانے لگا ۔

مختصر یہ کہ قیام پاکستان کے بعد ''قاضی جی'' کا جو سلسلہ ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں سے پیش کیا وہ ہر لحاظ سے ان کے فن کی پختگی کا مظہر ہے ۔ اس سلسلہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اس میں کئی سال تک پاکستان کے اہم مسائل پر بڑے واضح انداز میں اظہار خیال کیا گیا ۔ اس مسئلہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے آئے اور بالآخر غلبہ اچھے پہلوؤں کا ہوا ۔

ان ڈراموں کی ایک اور خصوصیت فقرے بازی بھی ہے اس فقرے بازی سے شوکت تھانوی نے بیک وقت اصلاح اور تفریح دونوں کے کام لیے ہیں ۔ انھوں نے ڈرامے اتنے زیادہ لکھے ہیں کہ بہت سے فقرے اتنے زیادہ دہرائے گئے

۱۔ شوکت تھانوی : ''سنی سنائی'' (برلن کا اسپتال) مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ، ص ۳۲ تا ۳۴ ۔

ہیں کہ یہ ان کا تکیۂ کلام معلوم ہونے لگتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے عہد میں اور بھی بہت سے لوگ ڈرامے لکھ رہے ہوے مثلاً عشرت رحمانی، انصار ناصری، سید امتیاز علی تاج، مرزا ادیب، اشفاق احمد وغیرہ۔ ان میں امتیاز علی تاج کی عظمت کے تو شوکت تھانوی خود بھی قائل تھے اس لیے بعض مواقع پر انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سید امتیاز علی تاج کے بعد شوکت تھانوی کا نمبر آتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں برسوں ان کی ہردلعزیزی قائم رہی اور ریڈیو ڈرامے کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ محفوظ اور تابندہ رہے گا۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

ساتواں باب

خاکہ نگاری، آپ بیتی

خاکہ انگریزی اصطلاح سکیچ (Sketch) کا متبادل ہے۔ لفظی مفہوم میں "خاکہ" کسی موضوع کے ابتدائی یا بنیادی نقوش کو کہتے ہیں جس کی مدد سے کسی شے کی مکمل تصویر کشی ممکن ہو لیکن ادب اور فن میں یہ اصطلاح مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ خاکہ کی اصطلاح مصوری میں بھی رائج ہے۔ مصور اگر کسی شخص کی مکمل اور بعینہ تصویر پیش کرے تو اسے پورٹریٹ کہتے ہیں اس کے برخلاف اگر چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس شخص کے خط و خال کی جھلک دکھا دے تو وہ اسکیچ کہلائے گا۔ ادب میں یہی فرق سوانح اور خاکہ میں پایا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر صابرہ سعید:

> "سوانح نگار کسی شخص کے حالات زندگی کے جزئیات تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے جب کہ خاکہ نگار کسی فرد کی زندگی اور کردار کی چند جھلکیاں پیش کر دیتا ہے۔ ادبی خاکے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی حقیقی شخصیت ہی کو اپنا موضوع بنائے۔ خیالی شخصیت بھی خاکے کا موضوع ہو سکتی ہے۔"[1]

شوکت تھانوی نے صرف شخصی خاکے ہی تحریر کیے ہیں اس لیے خیالی خاکے ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہیں۔ خاکے کی پہلی خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ اختصار سے مراد ایسی کفایت الفاظ ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل ہو۔ خاکہ نگاری کرتے وقت اس قدر اختصار کے ساتھ اور شخصیت اس قدر جامع پیش کرنی چاہیے کہ قاری کا ذہن اس کا بھرپور تاثر قبول کرے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو۔ نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر صابرہ سعید: اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص ۵۹ - ۶۰، دسمبر ۱۹۷۸ء، مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد۔

"کسی زندگی کا ایسا خاکہ با موقع پیش کرنا جو مختصر بھی ہو اور جامع بھی یعنی مختصر اتنا ہو کہ ہم اسے ایک نشست میں پڑھ ڈالیں اور جامع ایسا ہو کہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو نظر انداز بھی نہ ہونے پائے۔ اگر اس پر انداز بھی دلچسپ ہو تو یہ خاکہ نگاری بہت کامیاب ہو جاتی ہے۔"[۱]

خاکہ نگاری میں کردار نگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس شخصیت کو خاکہ نگاری کے لیے منتخب کیا جاتا ہے وہ انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس لیے خاکہ نگار کا اہم منصب ان خصوصیات کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کردار، خاکے کا ایسا بنیادی جزو ہوتا ہے جس کے بغیر خاکہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عمدہ کردار نگاری کے لیے خاکہ نگار کا نفسیات داں ہونا ضروری ہے تاکہ وہ شخصیت کی حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کو کوئی مفہوم دے سکے اور اپنے موضوع کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جو زندگی سے قریب تر ہو۔

خاکہ نگار کے لیے ایک اچھا واقعہ نگار ہونا ضروری ہے۔ خاکہ کی دلچسپی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ واقعات کو کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔ بیان ایسا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے۔

دیگر اصناف ادب کی طرح خاکہ نگار کے اظہار کا ذریعہ بھی زبان ہوتی ہے اور اس کے سہارے کے بغیر خاکہ نگاری ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ چونکہ یہ بیانیہ تحریر کا نمونہ ہے اس لیے اس میں بیان کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ بیان کی صناعی کے ذریعے ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کو اس کے معائب و محاسن کے ساتھ لفظوں میں ابھار سکتا ہے۔ شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری میں زبان و بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ حالات و واقعات اور کردار کو حقیقت سے قریب بلکہ عین حقیقت کے مماثل بنانے کے لیے زبان و بیان سے کام لیتے ہیں۔

شوکت تھانوی کی دو کتابیں "قاعدہ بے قاعدہ" اور "شیش محل" شخصیتوں کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ "شیش محل" کے خاکوں کے بارے میں

۱۔ بحوالہ اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص ۴۳-۴۴، ۱۹۷۹ء، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدر آباد۔

شوکت تھانوی کی اپنی رائے یہ ہے کہ

> "یہ تذکرہ کسی مؤرخ کے کام آنے والی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ادبی حالات سے زیادہ نجی حالات پیش کیے گئے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ ان کے غلط ہونے کا احتمال صحیح ہونے سے کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرا ذاتی مطالعہ ہے اور مجھ کو اعتراف ہے کہ میں نے اپنے مطالعہ کو ہمیشہ غیر مستند سمجھا ہے۔"[1]

شوکت تھانوی نے انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی مطالعہ کو غیر مستند قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی کو صحافت، ریڈیو اور شعر و شاعری کی وجہ سے تقریباً نصف صدی تک بھارت اور پاکستان کے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس بے تکلفی کی بنا پر شخصیت کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوئے۔ دراصل "شیش محل" اور "قاعدہ بے قاعدہ" کے تقریباً ڈیڑھ سو خاکے مراسم اور روابط کی مختلف شکلوں کے دلکش مرقعے ہیں۔ شوکت تھانوی نے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، ریڈیو آرٹسٹوں اور پبلشروں، غرض اپنے ہر طرح کے ملنے والے اشخاص کا خاکہ لکھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھنا پڑا کہ

> "یہ قلمی نگار خانہ، یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے، بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔"[2]

شوکت تھانوی کے حلقۂ احباب میں معروف اور غیر معروف ہر طرح کے لوگ شامل تھے اس لیے ان کے خاکوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے

---

[1] شوکت تھانوی: شیش محل، ص ۹، بار اول اردو بک سٹال، لوہاری دروازہ، لاہور۔

[2] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر، ص ۳۸۔

کہ ان کے خاکہ ایک طرف تو ادیبوں اور شاعروں کی نجی زندگی اور ادبی حیثیت کا تعارف ہیں اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی خود شوکت تھانوی کی پسند اور ناپسند کے معیاروں کے آئینے ہیں ۔ ان خاکوں اور مرقعوں میں جا بجا محبت ، شفقت اور ہمدردی کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ شوکت تھانوی کی محبت کے یہ رنگ ان کے خاکوں میں دیکھیے ۔ ایک خاکہ میں سید امتیاز علی تاج کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "امتیاز صاحب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں ۔ بڑی میٹھی زبان ہے اور بڑا دل آویز انداز گفتگو ۔ ہر چند کہ خالص تجارتی آدمی ہیں مگر صورت سے بالکل ساہوکار نظر نہیں آتے اور نہ ایک خرانٹ قسم کے سرمایہ دار بلکہ تجارت بھی تاجر بن کر نہیں ادیب ہی بن کر کرتے ہیں ۔ البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوش قسمت ادیبوں میں ہیں جو ادب کی گود میں پل کر ادبی فضاؤں میں پروان چڑھے ہیں اور ان کو ہوش کی انکھیں کھول کر اپنے لیے میدان عمل سجا سجایا ، بنا بنایا مل گیا تھا ۔ دوسرے ادیب خود کنواں کھود کر پانی پیتے تھے یہ پانی پی کر اگر دل چاہتا ہے تو کنواں کھود لیتے ہیں ورنہ ایسے پیاسے نہیں ہیں کہ کنواں ضرور ہی کھودیں ۔"[1]

علامہ اقبال کے خاکہ میں محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ

> "ان سے ملنے کے بعد ان کی وہ عظمت جو کتابوں سے حاصل ہوئی تھی میرے دل میں دوگنی ہو گئی ۔ لکھنؤ جا کر اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ کھرستان میں نے بھیجا ۔ اس کو پڑھ کر جو خط مجھے لکھا ہے اس سے اس عظیم المرتبت شخصیت کی رفعتوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ پھر کچھ دن خط و کتابت رہی ۔ مگر افسوس کہ ان کا وقت آ چکا تھا اور میں نے ملنے میں بہت دیر کی تھی ۔ پھر دوبارہ نہ مل سکا ۔"[2]

۱۔ شوکت تھانوی : شیش محل ، ص ۷۲ ، اردو بک سٹال لوہاری دروازہ لاہور ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۴۹ ۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کی بنیاد سر تا سر ذاتی تاثرات پر ہے ۔ اس لیے ان میں مختلف کیفیتوں اور ان کیفیتوں کے اتار چڑھاؤ کا گہرا اثر ہے ۔ وہ عنصر خاکہ لکھتے وقت شخصیت کی اہم اور نمایاں خصوصیات کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ خصوصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس سے شخصیت کا ایک واضح نقش پڑھنے والے کے سامنے آ جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر ''قاعدہ بے قاعدہ'' کے بیشتر خاکے دیکھے جا سکتے ہیں ۔ صوفی تبسم کے خاکہ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے :

''یہ کالج میں پروفیسر ہیں اور طالب علموں سے سر کھپانے کے بعد بھی اتنا دماغ اپنے لیے بچا لیتے ہیں کہ اکٹھی تین زبانوں کے شاعر ہیں ۔ اردو ، فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں میں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں اور تین زبانوں کا شاعر ہونے کے باوجود بہت اچھے آدمی ہیں ۔ زندگی بھر صرف ایک شوق رہا دوست بنانا اور پھر ان سے دوستی نبھانا ۔ اگر کوئی ان کا دشمن ہے تو اس کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا ۔''[1]

اسی طرح کا ایک اقتباس پطرس بخاری کے خاکے سے دیکھیے :

بخاری صاحب ان چند ذہینوں میں سے ایک ہیں جن کو ہر فن مولا کہا جا سکتا ہے ۔ ذہین آدمی کی ہر بات میں اپج ہوتی ہے اور بخاری اپنی ہر اپج سے مقدم اپنی انفرادیت کو سمجھتے ہیں ۔ وہ براڈ کاسٹر ہیں اور ایسے کہ مائیکروفون کو دیکھ کر ان کی حالت اس پہلوان سی ہو جاتی ہے جو اکھاڑے کی مٹی سے بھولنا شروع کرتا ہے ۔ وہ اداکار ہیں اور ایسے کہ ہمارا اسٹیج زندہ ہو سکتا ہے اگر اس قسم کے فن کار اسٹیج پر آ جائیں ۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن کی کیفیت رکھتے ہیں ۔ وہ ایک چلتی پھرتی دنیا ہیں ۔ ایک طوفانی دنیا ۔ سعی و عمل کا ایک نہ تھکنے والا حشر مجسم ۔''[2]

شوکت تھانوی کے تمام خاکے مزاحیہ انداز میں ہیں اس لیے ان کی ایک

۱۔ شوکت تھانوی : ''قاعدہ بے قاعدہ'' ، ص ۲۹ ۔ ۳۰ ، بار اول ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۵۳-۵۴ ۔

بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی شخصیت کا مجموعی تاثر قبول کرنے کے علاوہ بات کہنے کے انداز سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ بات شوکت تھانوی کے اکثر خاکوں میں جا بجا موجود ہے۔ بات عام طور سے بے تکلف مزاحیہ انداز میں بیان کی گئی ہے اور شگفتگی اور مزاح جو ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے ان خاکوں میں بھی کم نہیں ہوئی۔ یہ شگفتگی کبھی واقعات کے بیان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی اشخاص کے اوصاف کے ذکر میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور کبھی بے ساختہ کوئی دل کی کلی کو کھلا دینے والا فقرہ زبان پر آتا ہے۔ ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے کہ

> ''شوکت تھانوی کی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا اولین مقصد قارئین کو ہنسانا ہے وہ ہنسانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کے جتنے پیرائے ہو سکتے ہیں وہ سب شوکت تھانوی کے پاس مل جائیں گے۔''[1]

شوکت تھانوی نے مزاح پیدا کرنے کے لیے لفظی بازیگری، فقرے بازی اور پھبتی سے کام لیا ہے۔ ذیل کی عبارتوں میں شوکت تھانوی کے اسلوب کی یہ خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ سید امتیاز علی تاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص۔ مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسہ جانے کب شعر کہنا پڑ جائیں۔''[2]

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یعنی! چونکہ یہ تبسم ہیں لہذا کبھی قہقہہ نہیں لگاتے۔ زور کی ہنسی آ جائے تو ہاتھ کے جھٹکوں سے تھرما میٹر کا پارہ اتارنے کے انداز سے قہقہہ بلند نہیں کرتے بلکہ قہقہے کا مفہوم پورا کر دیتے ہیں یا قہقہے کو جھٹک دیتے ہیں کہ مجھ تبسم کے پاس

۱۔ ڈاکٹر صابرہ سعید: ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، ص ۲۳۷، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدر آباد۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''قاعدہ بے قاعدہ''، ص ۱۹، بار اول، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

کون آیا۔"[۱]

عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نام تو عظیم بیگ تھا مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ یہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا۔"[۲]

شوکت تھانوی بعض اوقات ایک ہی جملے میں اتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ بابائے اردو مولانا عبدالحق ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی ہیں مگر علاج صرف اردو کا کرتے ہیں۔"[۳]

الفاظ کے مزاج میں تخیل کی کارفرمائی اس وقت اور بھی لطف دیتی ہے جب بعض اوقات کئی بے تعلق چیزیں اس طرح یکجا کر لی جاتی ہیں جیسے وہ ہمیشہ اس طرح ساتھ رہنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ایسے چند اقتباسات آپ بھی دیکھیے۔

جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "جوش صاحب کا پٹھان ہوتا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں بھی لٹھ بازی، مردانگی، جنگجوئی، خونخواریت اور غیظ و غضب نظر آتا ہے جس کو انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش، جوش کی شاعری کی روح ہے۔"[۴]

فراق گورکھپوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "فراق گورکھپوری پروفیسر ہیں مگر مشاعروں میں جس انداز سے اپنا کلام سناتے ہیں، شبہ یہی ہوتا ہے کہ یہ کسی کالج کے پروفیسر ہیں

۱۔ شوکت تھانوی: "قاعدہ بے قاعدہ"، ص ۲۹۔ بار اول، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: "شیش محل"، ص ۱۹۰، بار اول، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ، لاہور۔

۳۔ شوکت تھانوی: "قاعدہ بے قاعدہ"، ص ۸۱، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۴۔ شوکت تھانوی: "شیش محل"، ص ۹۱، بار اول، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ، لاہور۔

بلکہ شعبدہ باز پروفیسر ہیں اور ابھی اپنے شعر کے دوسرے مصرعے سے کبوتر نکال کر اڑا دیں گے۔ گول گول آنکھیں اسی انداز سے گھما پھرا کر اپنے ہر مصرعے کے ہر لفظ کو باقاعدہ جمناسٹک کرا کے جس وقت وہ پڑھتے ہیں سننے والوں کو در پردہ ایک صدمہ سا ہوتا ہے کہ اتنا اچھا شعر ان پر کیوں نازل ہو گیا تھا۔“[۱]

شوکت تھانوی کے خاکوں کے بارے میں پروفیسر سید وقار عظیم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

”شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے یہ خاکے شوکت تھانوی کے اسلوب مزاح کی جملہ خصوصیتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور انبساط کے بے شمار سامان مہیا کرتے ہیں۔ تفریح اور انبساط کا سرمایہ ایک طرف تو سیدھی سادی با محاورہ سلیس اور صاف و شستہ نثر کی وجہ سے مہیا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ کی اس بازی گری سے جس میں شوکت کو حد درجے کی مہارت حاصل ہے۔“[۲]

شوکت تھانوی نے مزاح کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز بھی اختیار کیا ہے وہ کسی کی شخصیت بیان کرتے ہوئے شگفتگی کے پردے میں اصلاحی طنز یا زندہ رہنے والی تنقید کرتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے جملے ہر نقاد کے لیے قابل رشک ہیں۔ اصغر گونڈوی کے متعلق لکھتے ہیں۔

”جس شعر کے اعمال خداوند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں اس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ تمام نشاط روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔“[۳]

صفدر مرزا پوری کے متعلق لکھتے ہیں:

”مشاعروں میں اس طرح پڑھتے تھے کہ ہم نے کبھی ان کے کسی شعر کے مصرعہ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سنا۔ شعر کے آخر تک

۱۔ شوکت تھانوی: ”قاعدہ بے قاعدہ“، ص ۸۷ - ۸۸، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر، ص ۴۸۔

۳۔ شوکت تھانوی: ”شیش محل“ ص ۴۴، بار اول اردو بک سٹال، لوہاری دروازہ، لاہور۔

پہنچتے پہنچتے دونوں ہاتھ پھیلا کر داد مانگتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے اور اسی ہنسی میں شعر کی خوبی بھی گم ہو جاتی تھی''۱

شوکت تھانوی نے جہاں دوسروں کی خامیوں کی نشان دہی کی وہاں اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کیا۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''بچو! خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر جشن نجات مناؤ۔ یہ بہت بد آواز ہیں مگر گا کر شعر سنانے سے باز نہیں آتے۔ دعا کرو ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے''۔۲

محمد طفیل مدیر نقوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بچو! یہ وہی نازک اندام ایڈیٹر ہے جس کا رسالہ نقوش ہمیشہ موٹا تازہ تم نے دیکھا ہوگا۔ عام رسالے اپنا ایک آدھ خاص نمبر نکالا کرتے ہیں مگر طفیل کا نقوش خاص طور پر کبھی عام نمبر کی صورت سے نہیں نکلتا۔ اس کا ہر عام نمبر خاص ہوتا ہے اور یہی طفیل کی خاص ادا اور عام بیساختگی ہے''۔۳

شوکت تھانوی کے طنزیہ انداز کے بارے میں ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں کہ:

''ان کے خاکوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جس کردار کے بارے میں وہ لکھتے ہیں اس پر تھوڑا سا طنز بھی کر جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے خاکوں میں گو ہلکی سی دل شکنی ہوتی ہے لیکن یک قسم کی رائے ضرور دیتے ہیں''۴

۱۔ شوکت تھانوی: ''شیش محل''، ص ۱۶۹، بار اول، اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''قاعدہ بے قاعدہ''، ص ۶۵، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۳۔ شوکت تھانوی: ''قاعدہ بے قاعدہ''، ص ۷۳، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۴۔ ڈاکٹر صابرہ سعید: ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، ص ۲۳۴، دسمبر ۱۹۷۸ء، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدرآباد۔

الفاظ کو پرمعنی تبصرے اور تنقید کا ذریعہ بنانا شوکت تھانوی کی مزاح نگاری اور شخصیت نگاری کی مشترک خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت اس وقت اور بھی زیادہ مؤثر صورت اختیار کرتی ہے جب شوکت تھانوی کسی شاعر یا ادیب کے کسی عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتے ہیں جو عام خیال سے بالکل مختلف اور غیر متوقع ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کے لیے اس توجیہہ تاویل یا تعلیل میں غیر متوقع استعجاب کی بڑی سرور انگیز کیفیت ہوتی ہے۔ احسان دانش کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”احسان پہلے مزدور تھے اور اب شاعر ہیں۔ سوتے تو خیر اب تک زمین پر ہیں مگر اب لحاف ریشمی ہوتا ہے اور جیب میں کوڑی بھی نظر آتی ہے تاکہ تضیع اوقات کی گواہی دیتی رہے۔“[1]

کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”بچو! یہ کرشن چندر ہیں۔ تم ہنس کیوں رہے ہو، واقعی یہ کرشن چندر ہیں۔ تم کو ہنسی اس بات پر آتی ہوگی کہ جس کرشن چندر کا نام اتنا ہو، وہ بھلا صرف اتنا سا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے کرشن چندر کا تصور بہت بھاری بھرکم قائم کیا ہوگا، مگر وہ تو واجبی سے آدمی نکلے۔ وجہ یہ کہ لکھتے زیادہ ہیں، ورزش کم کرتے ہیں۔“[2]

حفیظ جالندھری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”کہنے لگے کہ دیکھتے نہیں ہو ولایت سے بیوی لایا ہوں۔ میں نے کہا، انگلستان بھر کی ایک غریب عورت اگر تمہارے نکاح میں آ کر چلی آئی ہے تو اس کو سند سمجھتے ہو۔ حالانکہ معلوم نہیں اس اجتماع کی کتنی خواتین یہ سوچ رہی ہوں گی کہ اس مرد سے شادی پہلے کی جائے یا طلاق پہلے حاصل کیا جائے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو کر اکڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ہنس رہے ہیں۔“[3]

۱۔ شوکت تھانوی: ”شیش محل“، ص ۳۰، بار اول، اردو بک اسٹال، لاہور۔

۲۔ شوکت تھانوی: ”قاعدہ بے قاعدہ“، ص ۹۵، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۳۔ شوکت تھانوی: ”شیش محل“، ص ۱۰۳، بار اول، اردو بک اسٹال، لاہور۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "عمر کافی ہے، مگر ابھی تک "کرارے" ہیں، ممکن ہے یہ خصوصیت "ہاپوڑ" کے ہونے کی وجہ سے ہو۔ بہرحال ہاپوڑ کی دو ہی چیزیں اب تک مشہور ہوئی ہیں۔ پاپڑ اور مولوی عبدالحق"۔[۱]

شوکت تھانوی کے خاکوں میں بعض کمزوریاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے شخصیت کے بیان کرنے میں اپنے ذاتی مراسم کو بہت دخل دیا ہے اور ایسے موقعوں پر مبالغہ آرائی کی وجہ سے تعریف کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ ملک حبیب احمد ریڈیو کے ایک افسر تھے، ان کے متعلق شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> "ان کو شاید اپنے ادیب ہونے کی خبر نہ ہو لیکن ہمارا مطالعہ یہی ہے کہ وہ اگر ریڈیو میں نہ ہوتے تو کسی رسالہ کے ایڈیٹر، کئی کتابوں کے مصنف، کسی پبلشنگ ہاؤس کے مالک یا مالک کے شریک یا کسی ایسی ہی قسم کے آدمی ہوتے۔ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت اور ڈرامہ کا پورا سلیقہ موجود ہے"۔[۲]

رفیع احمد خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں نے بہت سے ذہین آدمی دیکھے ہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے جاہلوں اور عالموں سے سابقہ رہا ہے۔ بڑے بڑے حاضر جوابوں کے کمالات دیکھ چکا ہوں مگر رفیع احمد خاں اپنا جواب خود ہیں۔ انگریزی میں ایک متبحر صاحب قلم، اردو میں ایک جادو بیان شاعر۔ جادو یہ ہے کہ کلام نظر نہیں آتا مگر خدا کی قسم بے پناہ کہتے ہیں"۔[۳]

بعض خاکوں میں شوکت تھانوی نے کمزوریوں کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ اس میں ایک طرح کی تلخی سی پیدا ہو گئی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے دل میں اس شخص کے لیے وہ گنجائش نہیں جو دوسروں

۱۔ شوکت تھانوی: "شیش محل"، ص ۱۷۷، بار اول، اردو بک اسٹال، لاہور۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۷-۲۲۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰-۱۳۱۔

کے لیے ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے خاکہ میں یہ بات بہت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے:

> ''نہایت ''المختصر'' قسم کے پورٹ ایبل انسان ہیں۔ مگر فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مشاقی کا جیتا جاگتا نمونہ۔ قد و قامت میں فتنہ مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت۔ ادیب، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، طالبعلم، معلم سب ہی کچھ تو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت افسانہ نگار کے حاصل ہوئی . . . مجنوں میں دوستوں کے لیے خلوص بھی ہے مگر بہت سپاٹ قسم کا۔ شروع شروع میں لوگ ان کو سنکی سمجھتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنکی تو نہیں البتہ تصنع سے بری ہو کر تہذیب کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو منافقانہ اخلاق اور دروغ بافانہ عام مجلس سکھاتا ہے''۔[1]

ملا رموزی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''حضرت ملا رموزی، مشہور مزاح نگار ہیں۔ گلابی اردو آپ کا خاص رنگ پیش کرتی رہی۔ اس کے بعد کچھ سیاسی مزاح نگاری شروع فرمائی اور آخرکار شاعری بھی فرمانے لگے۔ ذہین آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر سب باتیں کرنے کی نہیں ہوتیں''۔[2]

طویل خاکے کی نسبت مختصر خاکہ کو بہتر اور اچھا سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری اسے ایک ہی نشست میں ختم کر سکتا ہے۔ اور اس طرح اس کے مکمل تاثر کو پوری طرح جذب کر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مختصر خاکہ میں واقعات اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے شخصیت جامع نظر آتی ہے اور قاری اس کے تاثر سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ شوکت تھانوی کے بیشتر خاکے بہت مختصر ہیں۔ انہوں نے ان مختصر خاکوں کے ذریعے سے کسی اہم شخصیت کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ہم شوکت تھانوی کے خاکوں کو ''تعارفی خاکے'' کہہ سکتے ہیں۔ تعارفی خاکہ کی وضاحت ڈاکٹر صابرہ سعید نے اس طرح

---

[1] شوکت تھانوی: ''شیش محل''، ص ۲۱۳۔۲۱۵، بار اول، اردو بک اسٹال، لاہور۔

[2] ایضاً ص ۲۲۶۔

کی ہے:

> ''ایسی شخصیتیں جو زندگی کے کسی شعبے میں متعارف و مشہور ہوتی ہیں لیکن ان کی نجی زندگی اور سیرت سے لوگ واقف نہیں ہوتے ہیں خاکہ نگار اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر ان شخصیتوں کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ ساتھ ساتھ ان کے بارے میں ضروری سوانحی معلومات بھی پیش کر دیتا ہے۔ شوکت تھانوی کی ''شیش محل''۔۔۔۔کے بیشتر خاکے تعارفی ہیں''۔[۱]

شوکت تھانوی نے چھوٹے چھوٹے واقعات سے نہ صرف اپنے خاکوں کو سجایا ہے بلکہ معمولی سے معمولی واقعہ کو پراثر الفاظ میں خاص ترتیب سے اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مخصوص فرد کی شخصیت کا پرتو قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا خاکہ دیکھیے:

> ''مولانا تاجور نجیب آبادی ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ حکیم آشفتہ صاحب نے آپ کو دعوت دی تھی اور یہ خاکسار بھی اس دعوت میں شریک تھا اب تک وہی ایک ملاقات ہے جو مولانا سے ہوئی۔ نہایت بھاری بھرکم شاعر ہیں۔ کلام بھی ٹھوس اور خود بھی ٹھوس۔ تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ہانپنے جاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ سے ملنے گیا تو باہر ہی سے بھاگ آیا۔ کمرہ سے نہایت خوفناک آوازیں آ رہی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا سو رہے تھے اور یہ آوازیں خراٹوں کی تھیں''۔[۲]

شوکت تھانوی کے خاکوں کی ایک تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے۔ بقول پروفیسر سید وقار عظیم ''ان خاکوں سے بہ حیثیت مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے اور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں ایسی بہت سی اخلاق اور معاشرتی قدروں کا وجود نظر آتا ہے جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں''۔[۳]

۱۔ ڈاکٹر صابرہ سعید: اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص ۲۰۱، دسمبر ۱۹۷۸ء، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدر آباد۔

۲۔ شوکت تھانوی: ''شیش محل'' ص ۳۷، بار اول، اردو کی امثال، لاہور۔

۳۔ ماخوذ از نقوش لاہور، شوکت نمبر، ص ۸۳۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ’’شیش محل‘‘ کے خاکوں کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ’’مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت عموماً دوش بدوش ۔ ’’عموماً‘‘ کا لفظ خیال میں رہے ۔ ظرافت کی گلکاریاں ، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں ، مورخ کے کیمرے اور فوٹوگراف کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں ۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سب کے ہیں اور یہی فنکار کا کمال ہے‘‘[۱]

شوکت تھانوی کی شخصیت نگاری پر پروفیسر سید وقار عظیم کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :

> ’’میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا وہ خلوص اور دیانتداری ہے جس کی بناء پر انہیں ترتیب دیا گیا ہے ، اس لیے ان میں کہیں کہیں قصیدے اور ہجو کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا یہ امتزاج انہیں مافوق الفطرت ہونے سے بچا لیتا ہے‘‘۔[۲]

شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد اور معروف نقادوں کی رائے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہ حیثیت خاکہ نگار شوکت تھانوی نے اردو ادب کی روایتی ، تنقیدی یا جذباتی شخصیت نگاری کی عام روش سے ہٹ کر معیاری خاکے تحریر کیے ہیں ۔ ’’شیش محل‘‘ اور ’’قاعدہ بے قاعدہ‘‘ کے خاکوں نے خاکے کی صنف کو نئے آب و رنگ کی منفرد حیثیت عطا کی ہے ۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے خاکہ نگاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے ۔ انہوں نے شوکت تھانوی کو صف اول کا خاکہ نگار قرار دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ شوکت تھانوی نے اس صنف کو نکھارنے اور ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ وہ بجا لکھتی ہیں :

> ’’اس صنف میں اردو ادب کے صف اول کے ادیبوں اور مزاح نگاروں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ۔ محمد حسین آزاد ، مرزا

---

[۱] ماخوذ از نقوش لاہور ، شوکت نمبر ، ص ۳۸ ۔

[۲] ایضاً ، ص ۴۸ ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، محمد طفیل، اشرف صبوحی، شوکت تھانوی اور سعادت حسن منٹو جیسے انشا پردازوں نے اپنے زور قلم سے اس صنف کو اس درجہ نکھارا ہے کہ وہ موجودہ دور میں اردو ادب کی ایک دلکش اور مقبول عام صنف بن گئی ہے''۔[1]

آپ بیتی سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''آپ بیتی کے فن کے لیے ضروری نہیں کہ تعداد صفحات کی کوئی قید ہو یا کوئی خاص طریقہ کار ہو جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو۔ آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو یا سینکڑوں صفحات پر محیط ہو، بہرحال آپ بیتی ہوتی ہے۔ خود نوشت سوانح حیات جو معنوی اعتبار سے آپ بیتی کہلاتی ہے، عموماً ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ خاصا ہوتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر نثر میں اپنے حالات کا لکھنا ہے یعنی بنیادی طور پر مصنف کے خود لکھے ہوئے اپنے حالات جو کہ نثر میں ہوں خود نوشت سوانح حیات کہلاتے ہیں''۔[2]

آپ بیتی کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی کی رائے ہے کہ

''آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی کرنے بیٹھ جائے تو احتمال یہ ہے کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے''۔[3]

۱۔ ڈاکٹر صابرہ سعید: ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، ص ۳۳۶، دسمبر ۱۹۷۸ء، مکتبۂ شعر و حکمت، ۸۶۵-۶-۱۱، لکڑی کا پل، حیدر آباد۔

۲۔ ڈاکٹر صبیحہ انور: اردو میں خود نوشت سوانح حیات، ص ۱۹، اگست ۱۹۸۲ء، مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ۔

۳۔ مشتاق احمد یوسفی: زرگزشت، ص ۱۳، ۱۹۷۶ء، مکتبۂ دانیال، کراچی۔

خود نوشت سوانح حیات کی سب سے پہلی خصوصیت سچائی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تمام وہ خوبیاں اور خامیاں دکھائے جو ایک فرد کی واضح صورت بنانے کے لیے اور زندگی کو سامنے لانے کے لیے ضروری ہوں۔ ایک اچھی اور حقیقت افروز خود نوشت لکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہوتی ہے وہ فنکار کی انا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اعترافات کی بنا پر اس سے کم تر درجے کا ثابت ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اپنی شخصیت اور انا کا خیال رکھنے والے کبھی اچھی خود نوشت سوانح حیات نہیں لکھ سکتے۔ ایک کامیاب آپ بیتی میں حقیقت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے سر سید رضا علی لکھتے ہیں :

> ”میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر یہ آواز بلند پڑھ لیں تو پڑھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔“[۱]

دوسری اصناف سخن میں سچائی کی جو اہمیت ہے خود نوشت میں اس کی اہمیت کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس تحریر میں فن کا تانا بانا جس کے گرد بنا جاتا ہے اور جو بنتا ہے دونوں ایک ہی شخصیت ہوتی ہے اس لیے مصنف کی ذمہ داری کچھ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے دیوان سنگھ مفتون کی خود نوشت سوانح حیات ”ناقابل فراموش“ کا تعارف کراتے ہوئے برملا گوئی پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> ”ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کیے گئے ہیں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے وہ ہر واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے۔ یہ نہیں تو زیب داستاں کے لیے اس طرح رنگ آمیزی کی

۱۔ سر سید رضا علی : ”اعمال نامہ“ دیباچہ ص نمبر ج ، ۱۹۴۲ء رنگ محل پبلشر ، دہلی۔

جاتی ہے کہ واقعہ قصہ اور قصہ داستان بن جاتا ہے۔''

اردو ادب ہی میں نہیں بلکہ دنیائے ادب کی اہم آپ بیتیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف انہیں آپ بیتیوں کو قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہے جن میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہو۔

خود نوشت سوانح حیات کی دوسری اہم خصوصیت ''شخصیت'' ہے۔ آپ بیتی میں اپنی ذات اور شخصیت ہی وہ محور ہوتی ہے جس کے گرد مصنف چکر لگاتا ہے۔ ایک اچھی خود نوشت میں زندگی کے حالات بتدریج اس طرح بیان کیے جاتے ہیں جس طرح زندگی میں پیش آتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی ہنر مندی سے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اچھا مصنف ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی تصنیف نہ تو قارئین کے لیے بار ہو اور نہ ہی کوئی ضروری بات لکھنے سے رہ جائے کہ پڑھنے والے کو تشنگی محسوس ہو۔ آپ بیتی لکھنے والے اپنی شخصیت کو اپنی تصنیف میں پیش کرتے وقت ان باتوں کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں :

۱۔ اپنی شخصیت اور کردار کی اہمیت کا مرقع پیش کرنا۔

۲۔ اپنے حالات سے دوسروں کو روشناس کرانا۔

۳۔ اپنی ذات پر گذرنے والے حالات اور تجربات سے دوسروں کو روشناس کرانا اور کسی عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا۔

۴۔ اپنے حالات اگر ایسے ہیں جس میں محنت کرکے غیر معمولی ترقی حاصل کی گئی ہے تو دوسروں کو اس کی ترغیب دلانا۔

۵۔ اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، ادبی حالات کو اپنے زاویۂ نگاہ سے پیش کرنا اور اپنی زندگی کے اصولوں کی تبلیغ کرنا۔

۶۔ اپنے ہم عصروں سے اپنے تعلقات واضح کرنا اور ان کے اعمال اور افعال پر تنقید کرنا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور کا خیال ہے کہ

۱۔ دیوان سنگھ مفتون : ناقابل فراموش ص نمبر ۴، بار دوم، رحمت نیوز ایجنسی، دہلی۔

"کسی فرد کی شخصیت کی خود نوشت سوانح حیات سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ خود نوشت سوانح حیات دیانت داری اور خلوص نیت سے لکھی گئی ہو۔ لیکن کتنے افراد میں یہ ہمت اور حوصلہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اصلی رنگ روپ میں دیکھ سکیں چہ جائیکہ اپنے ڈھکے چھپے خد و خال کر سر بازار پیش کر سکیں۔ اسی لیے اپنی کہانی اپنی زبانی سنانے وقت اکثر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے جتنے پردے اس پر سے اٹھائے جا رہے ہیں اس سے زیادہ اس پر ڈالے جا رہے ہیں۔"[1]

خود نوشت سوانح حیات کی تیسری خصوصیت یہ مانی گئی ہے کہ خود نوشت کو یاد داشت کا مجموعہ ہونے کے بجائے فن کا حصہ ہونا چاہیے۔ فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہے۔ چونکہ خود نوشت سوانح حیات کا تعلق ہمارے شدید داخلی جذبات سے ہے اس لیے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ خود نوشت سوانح حیات کو ادبی کارنامہ بنانے کے لیے زبان و بیان کی ندرت ضروری ہے کیونکہ حقیقت کو خوبصورت الفاظ میں ملبوس کرکے جب قارئین کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ یقیناً اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور:

"آپ بیتی میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس کی غرض شخصیت کو پیش کرنا ہے اور لازمی یہ ہے کہ تصنیف، شخصیت کو واضح کر دے اور فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے۔"[2]

شوکت تھانوی کی آپ بیتی

شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح حیات "مابدولت" ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی جس میں پیدائش سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس آپ بیتی میں تعلیم، شاعری، مضمون نویسی، شادی، صحافت اور ریڈیو لکھنؤ کی ملازمت کا تذکرہ دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ اپنی

۱۔ ڈاکٹر صبیحہ انور: اردو میں خود نوشت سوانح حیات، ص ۳۶، اگست ۱۹۸۲ء، مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۔

تعلیمی زندگی کے آغاز کے بارے لکھتے ہیں "بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گذر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دے دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہیے۔"[1] تعلیم شروع ہو گئی۔ اساتذہ گھر پر انہیں تعلیم دینے کے لیے آتے تھے۔ یکے بعد دیگرے کئی اساتذہ کو تبدیل کرنا پڑا۔ باقاعدگی سے گھر پر پڑھائی نہ ہو سکی تو خالو مدن کے لال اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں داخل ہوئے۔ جہاں تعلیم کے بجائے غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اپنی اس حالت کی تصویر کشی انہوں نے ان الفاظ میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "کچھ دن تو اسکول میں بھیگی بلی بن کر رہے اس لیے کہ ایک مڈل اسکول سے آئے تھے اور یہاں کے لڑکے مڈل اسکول کے لڑکوں کو گودی سمجھا کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہمارے دوستوں کی بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ اور پھر آخر تک اسی جماعت نے حسین آباد ہائی اسکول میں زندگی کی روح پھونکی۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا۔ البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔"[2]

اس قسم کے شگفتہ اسلوب میں شوکت تھانوی نے یہ آپ بیتی تحریر کی ہے۔

شوکت تھانوی کی دوسری خود نوشت سوانح حیات "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے نام سے ادارہ فروغ اردو لاہور نے ان کے انتقال کے بعد ۱۹۶۳ء میں شائع کی۔ "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے نام سے شوکت تھانوی نے روزنامہ جنگ راولپنڈی میں ایک کالم شروع کیا تھا جس میں وہ اپنی گذری ہوئی زندگی کے واقعات لکھا کرتے تھے۔ نسیم تھانوی نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> "کچھ یادیں کچھ باتیں"۔ یہ عنوان تھا شوکت مرحوم کے اس مضمون کا جو وہ اخبار جنگ راولپنڈی میں گذشتہ چند ماہ سے لکھ رہے

---

[1] شوکت تھانوی: "مابدولت"، ص ۱۲، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

[2] ایضاً، ص ۳۸۔

تھے اور جس کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ علیل ہو کر لاہور کے میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور پھر اپنی دوسری شریک زندگی زہرہ بیگم کے مکان میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا والوں سے رخصت ہو گئے ۔ اس مضمون میں شوکت صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر آج تک کے احباب کا تذکرہ ایک نئے انداز میں لکھنا شروع کیا تھا ۔ یہ تذکرہ وہ مصور شائع کر رہے تھے تاکہ جن احباب کا ذکر آئے ان کی تصویر بھی پڑھنے والے دیکھ سکیں ۔''[1]

'' کچھ یادیں کچھ باتیں '' روزنامہ 'جنگ' راولپنڈی میں ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ شائع ہوتا تھا جس پر ابراہیم جلیس نے ایک خط کے ذریعہ ان سے گذارش کی کہ اسے ہر ہفتہ شائع کرنے کے بجائے ہر روز شائع ہونا چاہیے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''آپ 'کچھ یادوں اور کچھ باتوں' کے ذریعے اپنی پچھلی ساری زندگی کو جس سلیقے سے سمیٹ رہے ہیں وہ مجھے بہت پسند آیا ۔ آپ کی یہ تصنیف اردو ادب کی ایک دلچسپ اور مستند تاریخ بن جائے گی ۔ مشورہ ہے کہ آپ ''پرواز نامے'' کے کالم کی بجائے روزانہ بھی یادیں اور باتیں لکھا کریں کیونکہ مجھ سے ہفتہ بھر کا انتظار نہیں ہوتا ۔''[2]

'' کچھ یادیں کچھ باتیں '' کا سلسلہ شوکت تھانوی کو ۱۹۳۸ء کے بعد کے واقعات سے شروع کرنا چاہیے تھا ۔ چونکہ ۱۹۳۸ء تک کے واقعات ''ما بدولت'' میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے تھے ۔ لیکن شوکت تھانوی نے ایسا نہیں کیا ۔ اس میں بھی وہی موضوعات ہیں جو ''ما بدولت'' میں ہیں ۔ اس کا آغاز شاعری کی ابتداء اور مولانا اسی کی شاگردی سے ہوا ۔ چند مشاعروں کا تذکرہ کیا ۔ پھر والد صاحب کا انتقال اور روزنامہ 'ہمدم' کی ملازمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد صحافتی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ آخر میں سودیشی ریل کی مقبولیت کو اپنے لیے وبال جان قرار دیا ہے ۔

[1] نسیم انہونوی : ماخوذ '' کتاب'' لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، جولائی ۱۹۶۳ء ، ص ۱۶ ۔

[2] ابراہیم جلیس : ماخوذ ماہنامہ '' کتاب'' لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، جولائی ۱۹۶۳ء ، ص ۵۹ ۔

شوکت تھانوی کا یہ منصوبہ ابھی زیر تکمیل ہی تھا کہ خالق حقیقی نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور اس طرح یہ کتاب ادھوری رہ گئی۔ اگر شوکت صاحب کو معلوم ہوتا کہ ان کی زندگی اتنی جلد ختم ہو جائے گی تو وہ یقیناً اسے ''ما بدولت'' کے بعد سے شروع کرتے اور ایک خاص تسلسل کے ساتھ ان کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے آتے۔ ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کو چونکہ اخبار میں قسط وار چھاپا جاتا تھا اس لیے اس میں تسلسل کی کمی نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں اپنی ذات کو اجاگر کرنے کی بجائے دوسروں کی ذات کو زیادہ موضوع بحث بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مصنف کی خود نوشت سوانح حیات کی بجائے مصنف کے عہد کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے ماحول کی جا بجا تصویر کشی کی گئی ہے۔ آسان اور عام فہم اسلوب نے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے شوکت تھانوی نے اپنے حالات دو کتابوں میں قلمبند کیے۔ ''ما بدولت'' ان کی زندگی میں (۱۹۳۵ء) میں شائع ہوئی جبکہ ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' ان کے انتقال کے بعد ۱۹۶۳ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئی۔ ان دونوں کتابوں کے حوالہ سے ہمیں اس بات کا تجزیہ کرنا ہے کہ شوکت تھانوی نے آپ بیتی کے اصولوں یعنی سچائی، شخصیت اور فن کا کہاں تک خیال رکھا ہے اور یہ کہ ان کی خود نوشت سوانح عمریاں اردو ادب میں کیا مقام رکھتی ہیں؟

خود نوشت سوانح حیات میں سچائی ہی وہ روح ہے جو انسانی زندگی کو متحرک و جاندار بنا کر سامنے لے آتی ہے۔ آپ بیتی دلکش تب ہی ہو سکتی ہے جب اس کے پڑھنے والے کو اس کے صحیح ہونے کا یقین ہو۔ شوکت تھانوی نے ''ما بدولت'' کے آغاز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سچ بولنا اقدام خود کشی کے مترادف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نہ میں مہاتما گاندھی ہوں اور نہ مجھے ''تلاش حق'' نے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رخ کو اس قدر سچائی کے ساتھ پیش کر دوں کہ وہی سچ میری شامت بن کر میرے سامنے آ جائے۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے سچ بولنے کی نہایت خطرناک کوشش کی ہے اور دراصل ایسے ان حالات کو پیش کرنا ہی ایک قسم کا اقدام خود کشی ہے۔ مہاتما گاندھی کا کیا ہے وہ تو بچپن ہی سے مہاتما چلے آ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑا جرم انہوں نے یہ کیا ہے کہ

> گوشت کھا لیا یا کسی دوست کے بہکانے سے کسی بیسوا کے یہاں چلے گئے اور وہاں سے صاف نکل آئے۔ لیکن یہ خاکسار نہ تو کبھی مہاتما تھا نہ اب ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے“۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی کو اس بات کا احساس تھا کہ آپ بیتی لکھتے وقت تمام باتوں کو سچائی کے ساتھ بیان کرنے میں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ اگر سچ کہہ دیا جائے تو اپنی شخصیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے اور اگر سچ نہ کہا جائے تو قارئین اسے زندگی کی سپاٹ کہانی تصور کرکے پسند نہیں کریں گے۔ شوکت تھانوی نے ”ما بدولت“ میں سچ بول کر اپنے قارئین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ بھی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے میں پوری کوشش یہی کروں کہ جہاں تک ہو سکے سچ بولوں۔ البتہ شبہ اس سلسلہ میں یوں ہے کہ اگر مہاتما گاندھی کی طرح میری زندگی بھی معصوم ہوتی تو میں جھوٹ موٹ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرتا مگر یہاں تو سوائے جرائم کے اور کچھ ہے ہی نہیں“۔[2]

شوکت تھانوی کی اس خود نوشت سوانح عمری میں ایک ملی جلی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ کہیں تو انہوں نے خطرناک حد تک سچ بولنے کی کوشش کی ہے اور کہیں واقعات پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ”مابدولت“ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ

> ”ایک حسین و جمیل اور تمیز دار خاتون ان کے یہاں دو تین مہینے مہمان رہیں۔ بیگم شوکت تھانوی کو کسی ضروری کام کے سلسلہ میں زرد کوٹھی جانا پڑا اور تمام گھر کی چابیاں ان محترمہ کے حوالہ کر دی گئیں۔ شوکت تھانوی رات کو تو زرد کوٹھی میں بیوی کے ساتھ رہتے تھے مگر دن کو سرپنچ کے دفتر کی وجہ سے اس گھر میں بھی آنا پڑتا تھا اور یہی آنا جانا آخر ایک دن ہم کو لے ڈوبا۔

۱۔ شوکت تھانوی: ”ما بدولت“، ص ۹، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۔

ادھر سے پسندیدہ نظریں، ادھر سے ان نظروں کی پذیرائی۔ شیطان نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہوگئے''۔[۱]

اس واقعہ سے شوکت تھانوی کی جرأت اور بے باکی ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ واقعہ لکھنے کے فوراً بعد انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ پڑھنے والے مصنف کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کر لیں، اس لیے اس طرح بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں:

''ہم ڈوب چکے تھے، پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مگر اس گناہ کے بعد ہی آنکھیں کھل گئیں۔ سب سے پہلے اپنی اس معصوم بیوی کا خیال آیا جس کی ہم نے خیانت کی تھی اور جو ہم پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کرتی تھی . . . . نتائج سے قطعاً بے فکر ہو کر ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح اپنے آپ کو بیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ بیوی کے پاس پہنچ کر ہم اس قدر روئے کہ وہ بیچاری بھی پریشان ہوگئی اور رو رو کر ہم نے تمام قصہ من و عن بیان کر دیا''۔[۲]

راقم نے اس واقعہ کے بارے میں بیگم سعیدہ شوکت سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے سامنے تو وہ نہ کبھی روئے نہ دھوئے اور نہ کسی جرم کا اقرار کیا۔ یہ واقعہ میں نے بھی آپ کی ہی طرح ''مابدوات'' میں پڑھا ہے۔ شوکت تھانوی کی شخصیت کا ایک اور اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کی انتھک کوششوں کے باوجود تعلیم مکمل کرنے میں ناکام رہے۔ میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کر سکے۔ دوسری شادی کے موقع پر سسرال والوں کو اپنی تعلیمی قابلیت ایف۔ اے بتائی، چونکہ زہرہ بیگم اس وقت ایف۔ اے کی طالبہ تھیں۔ ''مابدولت'' میں انہوں نے جب بھی اپنی تعلیم کا ذکر کیا ہے، ہمیشہ استاد کو ہی مورد الزام ٹھہرایا۔ اپنی تعلیم مکمل نہ ہونے کا سبب اپنے اساتذہ کی نالائقی بتائی۔ اپنے ایک استاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے، معلوم ہوتا تھا بندر کا تماشہ شروع کریں گے، ویسی ہی سر پر پگڑی، وہی الجھی ہوئی داڑھی، ہو بہو

---

[۱] شوکت تھانوی: ''مابدولت''، ص ۱۴۸، ۱۴۹، بار چہارم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

[۲] ایضاً، ص ۱۴۹۔

آلدی نما چہرہ، معلوم نہیں وہ خود بھی کچھ پڑھے لکھے تھے یا نہیں۔ بہر صورت ہمارے لیے ان سے بہتر معلم بھوپال میں گویا کوئی اور نہ مل سکا۔ ان حضرت سے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا۔ مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر صاحب آئے جو چوتھے دن اس لیے نکال دیے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا''۔۱

تحلیل نفسی کے عمل اور اصولوں کی روشنی سے شوکت تھانوی کی شخصیت اور نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں شوکت تھانوی نے اپنی محرومیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

خود نوشت سوانح حیات کی طرف بیشتر لکھنے والوں نے بڑھاپے میں توجہ کی ہے کیونکہ یہ پختگی کا زمانہ ہوتا ہے۔ پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں پہنچنے کے بعد ماضی کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ انتخاب آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنی شخصیت کا کون سا پہلو گفتنی ہے اور کون سا ناگفتنی۔ شوکت تھانوی نے ''ما بدولت'' تقریباً چالیس برس کی عمر میں لکھی اور اسے اپنی لغزشوں کا اعتراف کہا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب زندگی کا اعتبار روز بروز اٹھتا جاتا ہے۔ کنپٹی کے اوپر اور ناک کے عین نیچے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں۔ قلب کی شکایت روز افزوں ترقی پر ہے۔ عینک کا نمبر بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سب آثار ہیں وہاں پیشی کے، اور حال یہ ہے اب تک کہ دنیا کسی طرح چھوڑتی ہی نہیں نہ روزے کے نہ نماز کے۔ سوائے مصیبت کے کسی وقت خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا۔ اب اگر خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ کم سے کم اپنی لغزشوں کا اعتراف ہی کر لیں تو اس توفیق سے دنیا والوں کے ڈر کے مارے ہم آخر کیوں باز رہ جائیں۔ ہم اگر سچ بولنے کے بعد قابل نفرت ثابت ہوتے ہیں تو یہ قصور ہمارا نہیں بلکہ اس سچ کا ہوگا جس سے اب تک بچنے کی ہم نے ایمانداری کے

۱۔ شوکت تھانوی: ''ما بدولت'' ص ۲۱، ۲۲، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

ساتھ پوری کوشش کی''۔[1]

شوکت تھانوی نے اپنے حالات لکھنے سے پہلے ''کچا چٹھا'' میں بار بار اس عزم کو دہرایا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے اعتراف کے طور پر ان واقعات کو لکھ رہے ہیں۔ شوکت تھانوی کی شخصیت میں اہم تبدیلی ان کے والد صاحب کے انتقال کے بعد آئی۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے، شوکت تھانوی لکھنؤ کی رنگ رلیوں اور شعر و شاعری میں مصروف رہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو پوری شدت سے محسوس کیا اور معمولی تنخواہ پر ملازمت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ صحافت کو ذریعۂ معاش بنانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ماموں سے کہا کہ انہیں خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی، مینیجنگ ایڈیٹر روزنامہ ''ہمدم'' کے پاس لے جائیں۔ اگر انہوں نے اپنے اخبار میں ملازمت دے دی تو وہ اتنی زیادہ محنت کریں گے کہ ترقی کے راستے ان پر کھلتے چلے جائیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری عزیز دارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانۂ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا۔ وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو''۔[2]

شوکت تھانوی کی ''مابدولت'' اور ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں ہمیں شوکت تھانوی کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ اپنے ہم عصروں کا تذکرہ اتنا ہی کیا ہے جتنی اس کی ضرورت تھی۔

خود نوشت سوانح حیات کو ادبی کارنامہ بنانے کے لیے زبان و بیان پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ شوکت تھانوی کی ''مابدولت'' اور ''کچھ یادیں

۱۔ شوکت تھانوی: ''مابدولت'' ص ۱۳، ۱۴، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

کچھ باتیں'' دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شوکت تھانوی زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اپنی کہانی کو دل کش اور خیال انگیز کس طرح بنایا جاتا ہے وہ جزئیات کے حسن ترتیب سے مکمل مرقع بنانے میں بھی مہارت رکھتے ہوئے شوکت تھانوی روزنامہ ''ہمدم'' کے مینیجنگ ایڈیٹر کا خط لے کر روزنامہ ''ہمدم'' کے ایڈیٹر سید جالب کے پاس پہنچے تو دیکھا: ''ترکی ٹوپی پہنے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے نیچے سفید بالوں کا گچھا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم، میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر۔ اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میرے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ لکھتے رہے برابر لکھتے رہے۔ نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا۔ بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آ جانے سے گردن اوپر اٹھی، موقع دیکھ میں نے عرض کیا ''السلام علیکم'' نہایت کرخت آواز میں جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہا۔ میں نے خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا۔ پڑھ کر دزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا۔ اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا''[1]

خود نوشت سوانح حیات میں اسلوب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ آپ بیتی کا گھروندا شخصیت کی بنیاد پر بنتا ہے۔ مگر اس گھروندے کی آب و تاب کا انحصار ادبی کارے اور مسالے پر ہوتا ہے۔ عمدہ پچی کاری اور آرائش ہو تو گھروندا محل بھی بن سکتا ہے۔ خود نوشت میں حسن بیان اور انداز بیان کی بہرحال اہمیت ہوتی ہے۔ یہ کام منجھا ہوا ادیب ہی آسانی سے کر سکتا ہے''[2]۔

انداز بیان کے اعتبار سے شوکت تھانوی ایک منجھے ہوئے ادیب تھے۔

[1] شوکت تھانوی۔ ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' ص ۷۴، ۷۵، ۱۹۶۴ء، بار اول، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

[2] ڈاکٹر صبیحہ انور: اردو میں خود نوشت سوانح حیات، ص ۲۵۱، ۲۵۲، نامی پریس، لکھنؤ۔

ن کی بیشتر کتابوں کی طرح ’’مابدولت‘‘ بھی پبلشر کے تقاضے کی وجہ سے لکھی گئی۔ ’’مابدولت‘‘ میں وہ لکھتے ہیں کہ

> ’’ادارۂ فروغ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل صاحب اس وقت لکھنؤ میں موجود ہیں۔ آپ کا اس خاکسار کے متعلق جو کچھ بھی خیال ہے اس کو تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔ مگر آپ اس نیازمند سے کام لیتے ہیں ٹائپ رائٹر کا اور خیال آپ کا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے آ کر محض آپ کا یہ کہہ کر بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ اے ٹائپ رائٹر لکھ دے ایک کتاب جلدی سے۔ چنانچہ آپ بیٹھے رہتے ہیں اور ٹائپ رائٹر لکھتا رہتا ہے۔ یہ کتاب بھی آپ نے اسی ٹائپ رائٹر سے اسی طرح لکھوائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے متعلق ہمارے ذہن میں کچھ نوٹ پہلے سے تیار تھے۔ مگر ان کو تحریری شکل میں ترتیب کے ساتھ لانا اور وہ بھی اس صورت میں کہ پاسبان عقل کسی وقت بھی دل کو تنہا نہ چھوڑے، ایک عجیب قسم کی سزا ہے‘‘۔[1]

شوکت تھانوی کو ’’مابدولت‘‘ ایک ٹائپ رائٹر کی طرح لکھنی پڑی۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے ’’مابدولت‘‘ کو مزاحیہ خود نوشت کہا ہے[2]۔ ہماری رائے میں یہ مزاحیہ خود نوشت نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنجیدہ خود نوشت ہے اس میں شوکت تھانوی نے اپنی زندگی کے حالات سنجیدگی سے شگفتہ اسلوب بیان میں لکھے ہیں۔

خود نوشت سوانح حیات دوسری اصناف کے مقابلے میں ایک اہم اور مشکل صنف ادب ہے۔ شوکت تھانوی نے اس مشکل صنف ادب کا ایک حصہ ’’مابدولت‘‘ کے نام سے لکھا۔ یہ شوکت تھانوی کا ابتدائی کارنامہ ہے وہ اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کرنا چاہتے تھے:

> ’’ ’’مابدولت‘‘ کے بعد دوسرا حصہ ابن جانب ابھی پیش ہونے والی چیز نہیں بلکہ اس کو ہم برابر مرتب کرتے رہیں گے اور غالباً وہ اس وقت پیش ہو سکے گی جب پیش کرنے والا دنیا کی جوابدہی کے بجائے کسی اور جوابدہی میں مبتلا ہوگا‘‘۔[3]

۱۔ شوکت تھانوی: ’’مابدولت‘‘ ص ۵، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔
۲۔ ڈاکٹر صبیحہ انور: اردو میں خود نوشت سوانح حیات، ص ۳۴۲، نامی پریس، لکھنؤ۔
۳۔ شوکت تھانوی: ’’مابدولت‘‘ ادارۂ فروغ اردو، لاہور

شوکت تھانوی کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ درست ثابت ہوئے۔ ان کی دوسری خود نوشت سوانح حیات ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے نام سے ان کے انتقال کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس دوسرے حصہ میں بھی ۱۹۳۸ء سے پہلے کے حالات بیان ہوئے، بعد کے حالات وہ لکھنا چاہتے تھے لیکن مرض الموت میں مبتلا ہوگئے اور یہ داستان ناتمام رہ گئی۔ اس ناتمام آپ بیتی ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کی بہ نسبت ''مابدولت'' کی زیادہ اہمیت ہے اس میں واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جب کہ ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں یہ ربط و تسلسل مفقود نظر آتا ہے۔

آٹھواں باب

صحافت

صحافت یا جرنلزم حقائق سے راست طور پر آگاہی کا نام ہے ۔ اس میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے کالم نگار کا بیان ہے کہ انگریزی لفظ جرنل Journal لاطینی لفظ Diurnalis سے ماخوذ ہے ۔ فرانسیسی میں جرنل کے اصلی معنی ''روزانہ'' کے ہیں ۔[1]

جدید عربی میں اخبار کے لیے ''جریدہ'' کی اصطلاح مستعمل ہے اس کا مترادف ''صحیفہ'' ہے جو بہ صورت واحد کم استعمال ہوتا ہے لیکن بصیغہ جمع یعنی صحف کا استعمال جرائد کی نسبت عام ہے[2] ۔

مشہور ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا نے کہا ہے کہ اعلیٰ ادب اور بلند پایہ ادبی شہ پارے درحقیقت ''صحافت'' ہیں ۔

All Great Literature is Journalism

صحافت کا زندگی سے اور زندگی کا ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ آج مغرب میں ادب اور صحافت نہ صرف دوش بدوش ہیں بلکہ زندگی کی ہوا بھی میں دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی واقعات کے گرد و پیش سے اپنا واسطہ نہیں توڑ سکتی ۔ صحافت کا انسانی جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہے ۔ بعض مرتبہ ایک افسانہ یا نظم سے زیادہ کسی اخبار کی سرخی ہمارے جذبات و احساسات کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہے ۔ اخبار کا ایک کارٹون تک لوگوں کی قسمت بناتا یا بگاڑتا ہے ۔

دنیا کے اکثر ادیبوں نے پہلے پہل اخباروں اور رسالوں کے لیے مضامین لکھنے شروع کیے اور بعد میں ان کی تحریروں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی ۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ، جلد ۱۳ ، صفحہ ۴۹ ، مطبوعہ امریکہ ، ۱۹۷۰ ۔

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، جلد ۶ ، ص ۱۷۹ ، مطبوعہ ، لاہور ۱۹۷۱ ۔

امریکہ ، برطانیہ ، فرانس اور جرمن وغیرہ میں ایسے بے شمار صحیفہ نگار ملیں گے جنہوں نے صحافت کے ذریعہ ہی ادب اور سیاست میں نمایاں شہرت اور کامیابی حاصل کی ۔ ان میں مشہور امریکی سائنس داں ، مصنف ، سفیر ، سیاست داں بنجامن فرینکلن Benjamin Franklin ، مشہور ناول نگار مارک ٹوین Mark Twain، امریکی صدر جمہوریہ روزولٹ Roosevelt، مشہور ناول نگار ڈینیل ڈیفو Deniel Defoe، مشہور مفکر، مقرر ، ناول نگار چارلس ڈکنس Charles Dickens ، مشہور سیاست داں و وزیراعظم انگلستان ولیم گلاڈ اسٹون William Glad Stone ، ممتاز ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا G. B. Shaw اور مشہور سیاست داں برطانیہ کے وزیراعظم چرچل Churchill خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

اردو زبان کے متعدد ادیبوں ، شاعروں ، محققوں اور نقادوں کا بھی صحافت سے گہرا تعلق رہا ہے ۔ صحافت کے ذریعہ ہی انہیں شہرت و عزت ملی ۔ شوکت تھانوی بھی اسی قسم کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۰ء میں ہو چکا تھا ۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے ۔ اس زمانے میں وہ اپنے اسکول کے دوستوں کے لیے ''قلمی رسالہ'' نکالتے تھے ۔ ''ماہدولت'' میں انہوں نے اس بات پر اس طرح روشنی ڈالی :

> ''اسی زمانہ میں ہم نے اپنے اسکول کے دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا ۔ اس رسالہ کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے ۔ اس میں کارٹون بناتے تھے ۔ نظمیں ہوتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوا کرتی تھیں ۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا ۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا ، احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کرکے پھر ہمارے پاس آ جاتا تھا ۔ پندرہ دن کے بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے ۔''[1]

۱۹۲۵ء میں شوکت تھانوی ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا ۔ ''رسالہ حسن

۱۔ شوکت تھانوی : ماہدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، بار چہارم ، ص ۷۰ ۔

ادب لکھنؤ" اور سامنے ہی ایک صاحب کرتا اتارے، پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا، بیٹھے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے، خود ہی مدیر تھے، خود ہی کاتب اور خود ہی پریس مین تھے اور آپ کا نام منشی واحد علی لطف لکھنوی ہے۔ دوران گفتگو انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک معقول آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ کافی دیر گفتگو کرنے کے بعد شوکت تھانوی نے ایک سے زیادہ مضامین دینے کا وعدہ کیا اور دوسرے ہی دن اس وعدے کو وفا بھی کر دیا۔ منشی واحد علی نے ان مضامین کو دیکھ کر کچھ غور کرنے کے بعد فرمایا:

> "اگر میں آپ کا نام ایڈیٹری میں دے دوں۔ ہم کو اس کی امید بھی نہ تھی کہ ہمارے حصہ میں یہ اعزاز آنے والا ہے۔ ہم نے کچھ دیر تامل کیا۔ غور کرتے رہے کہ یہ اعزاز قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔۔۔ مختصر یہ کہ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلا ہے تو سرورق پر لکھا تھا، ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لیے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کی بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گذر چکا تھا۔ لہذا ہم نے اپنے لیے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔"[1]

صحافتی زندگی میں کالم نویسی ایک بہت مشکل فن ہے۔ ہر کالم نویس کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ہر روز نئے موضوع پر نئے افکار و خیالات اور نیا مواد کس طرح مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے اس کا مشاہدہ اور مطالعہ اس کی مدد کرتے ہیں۔ جتنی اس کے مشاہدہ میں گہرائی اور مطالعہ میں وسعت ہوگی اتنا ہی اچھا وہ کالم نویس بن سکے گا۔ فکاہی کالموں میں ہمیشہ ایسے واقعات و معاملات کو بنیاد بنایا جاتا ہے جن سے مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکلتا ہو۔ ان کالموں میں قارئین کو دلچسپی اور تفریح کا مواد بہم پہنچانے کے لیے الفاظ سے کھیلا جاتا ہے۔ زبان کی چاشنی کو اولیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کے کالم عموماً زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے اچھے ادیب ہی لکھ سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے فکاہی کالم لکھنے کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۸ء

---

[1] شوکت تھانوی: مابدولت، مطبوعہ نقوش پریس لاہور، بار چہارم، ص ۸۸، ۸۹۔

میں کیا۔ جب انہوں نے مولانا ارشد تھانوی کے ہفتہ وار ”تحریک“ میں فکاہی کالم ”لالہ زار“ لکھنا شروع کیا۔ لکھنؤ کے ماحول سے شوکت تھانوی کی زبان میں اتنی چاشنی پیدا کر دی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص صرف فکاہیہ کالموں کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ فکاہیہ کالم نگاری کے جس سلسلے کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا، وہ تا حیات جاری رہا۔ ”پہاڑ تلے“ شوکت تھانوی کا آخری کالم ان کے انتقال کے تیسرے دن ۷ مئی ۱۹۶۳ء کو ”جنگ“ راولپنڈی کی اشاعت میں شامل ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنی مختصر غیر حاضری کی معذرت کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ کیا ہے۔

شوکت تھانوی کے والد کا انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہوا تو انہیں ملازمت کا خیال آیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲، ۲۳ برس تھی۔ ان کے رشتہ دار ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ خود شوکت تھانوی کے ایما پر ان کے ماموں انہیں خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی، مینجنگ ایڈیٹر روزنامہ ”ہمدم“ کے پاس لے کر گئے تو انہوں نے پوری عزیز دارانہ ہمدردی فرما کر اس وقت شوکت تھانوی کو ”ہمدم“ میں گویا ملازم رکھ لیا۔ اور کہا کہ فی الحال تمہاری تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے جتنی زیادہ محنت کرو گے اتنی ترقی حاصل کرتے چلے جاؤ گے۔

شوکت تھانوی اپنی تقرری کا پروانہ لے کر دوسرے دن جالب دہلوی ایڈیٹر روزنامہ ”ہمدم“ کے پاس پہنچے تو وہ بہت خندہ پیشانی سے ملے اور انہیں قاضی محمد حامد حسرت کے پاس بھیج دیا۔ آپ ”ہمدم“ کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی۔ قاضی صاحب بھی ان سے اس طرح ملے جیسے وہ ان سے پہلے سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنے ہی کمرے میں شوکت تھانوی کے لیے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔

> ”بعد میں معلوم ہوا کہ خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے قاضی صاحب کو کل ہی بلا کر ان سے کہہ دیا تھا کہ شوکت تھانوی میرے عزیز ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے۔۔۔۔ سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ”ہمدم“ کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ اور شذرات پڑھ ڈالیے تا کہ آپ کو حالات حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے۔۔۔ آخر تین

> دن میں ہم نے دو مہینے کے فائل پڑھ ڈالے ، مقالات افتتاحیہ کو پڑھا ، شذرات پر نظر ڈالی اور مزاحیہ کالم ، دو دو باتیں بھی پڑھ ڈالیں ۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا ۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیے جاتے تھے اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی ۔"[1]

روزنامہ "ہمدم" کی ملازمت سے شوکت تھانوی نے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا ۔ ابتداء ہی میں انہیں سید جالب دہلوی جیسے مہربان اور تجربہ کار انسان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ۔ انہوں نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی ۔ وہ ہر تحریر پر اصلاح دینا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ بعض اوقات شوکت تھانوی ان کی اصلاحوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتے تھے ۔ ایک مرتبہ شوکت تھانوی نے اپنی کسی تحریر میں "نقطۂ نظر" لکھا تو سید جالب دہلوی نے اسے کاٹ کر "زاویۂ نظر" کر دیا ۔ شوکت تھانوی اس کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور سید صاحب کے پاس پہنچ کر کہا کہ

> "میں یہ سمجھا نہیں کہ آپ نے نقطۂ نظر کاٹ کر زاویۂ نظر کیوں بنا دیا ہے ۔ میرے نزدیک تو کوئی ایسا فرق ان دونوں میں نہیں ہے ۔ سید صاحب نے اسی طرح نہایت بے پروائی سے بغیر سانس لیے فرمایا بہت بڑا فرق ہے ۔ نقطۂ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس کی اصلیت پر آپ کی نگاہ یقین کے ساتھ پہنچ چکی ہے اور اب اس میں آپ کے نزدیک کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور زاویۂ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی نظر اس نقطہ کے ارد گرد منڈلا رہی ہے یعنی وہ بات جو آپ بیان کر رہے ہیں غلط بھی نکل جائے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا نقطۂ نظر نہیں بلکہ زاویۂ نظر تھا ۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ذمہ داری صرف اسی بات کی لیں جس کے متعلق آپ کو واقعی یقین ہو کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ کچھ

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس ، ص ۱۱۲ - ۱۱۳ -

اور ہو ہی نہیں سکتا۔''[۱]

سید جالب دہلوی بہت صاحب نظر اخبار نویس تھے۔ ایسے شخص کی شاگردی اختیار کرنا یقیناً قابل فخر بات ہے۔ سید صاحب کے بارے میں تمام عملہ کو یہ شکایت تھی کہ وہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ وہ صرف ذہانت اور محنت کی قدر کیا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی کی ذہانت اور ان کی سنجیدہ تحریروں میں شگفتگی کو دیکھ کر انھوں نے اپنے اخبار کا فکاہیہ کالم ''دو دو باتیں'' ان سے لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ مزاحیہ کالم لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مزاح نگار کو نہایت باریک پگڈنڈی پر چلنا پڑتا ہے اس طرف ذرا سا ہٹ جائے تو پھکڑ بن کر رہ جاتا ہے اور اس طرف ہٹ جائے تو سنجیدہ بن جاتا ہے۔ مزاح نگاری کے لیے فطری رجحان کا ہونا ضروری ہے اور ان کی دوربین نگاہ نے یہ فطری رجحان شوکت تھانوی کے ہاں پا لیا تھا۔ انھوں نے شوکت تھانوی کو شوکت تھانوی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شوکت تھانوی ان کی علمیت سے ہر جگہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ ان کا تذکرہ بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے ''شیش محل'' میں ان کا خاکہ لکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''میر صاحب کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا تھا۔ کسی موضوع پر گفتگو کیجیے، بات کریں گے بات کی جڑ بتائیں گے یہاں تک کہ پھنگی بھی بتا جائیں گے۔ حلوہ سوہن، خمیرہ، سرطان، مثنوی مولانا روم، خاندان پہلوی، گاماں پہلوان، پلاؤ کی پخت، غرض تو کیا، کوئی موضوع لے لیجیے گھنٹوں تقریر کریں گے اور اس وثوق سے موضوع کے ہر پہلو کو نمایاں کریں گے گویا یہ آپ کا خاص سبجیکٹ رہا ہے۔''[۲]

۱۹۳۰ء میں سید جالب دہلوی ''ہمدم'' سے علیحدہ ہوئے تو چوہدری رحم علی ہاشمی باضابطہ طور پر اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ وہ اردو اور

۱۔ شوکت تھانوی: ما بدولت، مطبوعہ نقوش پریس لاہور، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔

۲۔ شوکت تھانوی: شیش محل، مطبوعہ استقلال پریس لاہور، ص ۸۲۔

انگریزی صحافت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ شوکت تھانوی نے ان کے ساتھ کام کرکے ان کے تجربہ سے استفادہ کیا۔ "دو دو باتیں" کا کالم اب بھی شوکت تھانوی ہی کے سپرد رہا۔ اس زمانہ میں علامہ سیماب اکبر آبادی سے "دو دو باتیں" میں "ہمدم" کی معاصرانہ نوک جھونک جاری تھی اور اب اس ناخوشگوار بحث نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علامہ نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر ہفت روزہ "فرشتہ" سے بھی "ہمدم" کے خلاف آتش فشانی شروع کرا دی۔ "فرشتہ" کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے تھانوی نے لکھ دیا کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں کہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گندے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار بھی جواب دے سکیں تو بھی ہفتہ کے باقی چھ دن سہلانے گذر جایا کریں گے۔ علامہ سیماب نے "تاج" آگرہ میں اس کا فوراً جواب دیا کہ

ادب باقی ہے اب ان میں نہ استعداد باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی فکر مادر زاد باقی ہے
کوئی ہمدم کے "کانوی" سے جا کر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطاں مر گیا، اس کی مگر اولاد باقی ہے[۱]

سنجیدہ قسم کے بزرگ اس ناخوشگوار بحث کو ختم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چوہدری رحم علی ہاشمی نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے شوکت تھانوی سے اصرار کیا۔ شوکت تھانوی نے رسالہ "پیمانہ" میں سیماب کی تازہ غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے لیکن اس کے مقطع جس کا ایک مصرعہ یہ تھا، ع: سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھ دیا کہ اب جبکہ مولانا نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اب ہم مولانا کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے اور آج سے ہم اس بحث کو ختم کر رہے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں رسالہ "انکشاف" لکھنؤ نے "ظریف نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا تو "انکشاف" کے ایڈیٹر نسیم انہولوی، چوہدری رحم علی ہاشمی کی

---

[۱] احمد جمال پاشا: شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۲۹۔

معرفت شوکت تھانوی سے ملنے اور مضمون لینے کے لیے آئے ۔ ہاشمی صاحب نے نسیم انہونوی کو شوکت تھانوی سے ملوا دیا ۔ اس ملاقات کے بعد دونوں کی دوستی اتنی بڑھی کہ یک جان و دو قالب والا معاملہ ہو گیا ۔ نسیم انہونوی نے "انکشاف" کا سالنامہ "ظریف نمبر" فروری ۱۹۳۰ء میں بڑے دھوم دھام سے نکالا ۔ اس نمبر کو شوکت تھانوی نے مرتب کیا تھا اور ہندوستان کے تمام مزاح نگاروں کی تخلیقات اس میں چھپی تھیں ۔ اس نمبر کے اداریے میں شوکت تھانوی نے "بیگار" کے عنوان سے لکھا تھا :

> "کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس ، یعنی رسالہ ایک آنہ فنڈ کا ، ایڈیٹر اس کے میاں نسیم صاحب اور شذرات لکھیں مولانا شوکت تھانوی ، گویا مولانا شوکت تھانوی نہ ہوئے کرایہ کے بلکہ بیگار کے ٹٹو ہو گئے کہ چاہے ٹمٹم میں جوت دیا ، چاہے تانگہ میں لگا دیا ، ہم کو دلکی چلنے سے کام ، یہ رمضان شریف کا زمانہ دیکھیے ، یہ عید کی آمد اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے رسائل کے عید نمبر میں ہمارے مضامین کا شریک ہونا ملاحظہ فرمائیے اور پھر مرے پر سو درّے یہ شذرات لکھنا دیکھیے ، شذرات کیا لکھ رہے ہیں حق دوستی بھگت رہے ہیں ۔"[1]

"انکشاف" کا یہ ظریف نمبر بے حد مقبول ہوا مگر نسیم انہونوی صاحب کا اس کی پالیسی سے اختلاف ہو گیا اور وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے ۔ ایک سال کے بعد شوکت تھانوی کے مشورے سے ہفتہ وار "سرپنچ" نکلا جس کی ادارت شوکت تھانوی کے سپرد کی ۔ ہفت روزہ "سرپنچ" لکھنو کا پہلا شمارہ شوکت تھانوی کی ادارت میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں نکلا ۔ "اودھ پنچ" اس زمانے میں مائل بہ زوال تھا اس لیے اودھ پنچ کے بہت سے لکھنے والے "سرپنچ" کے صفحات پر نظر آنے لگے ۔ ان میں ظریف لکھنوی ، چودھری محمد علی دہلوی اور شہباز بلند پرواز کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں "سرپنچ" کا آغاز "اودھ پنچ" کے انداز میں کیا گیا تھا اس لیے اس کا سائز ، سرورق، تہذیب و ترتیب ، شذرات، کالم، تبصرے، کارٹون وغیرہ میں مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے ۔ معیار کے اعتبار جب ہم ان دونوں پرچوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں کی تحریریں

---

[1] اداریہ از شوکت تھانوی ، ماہنامہ "انکشاف" لکھنؤ ، ظریف نمبر فروری ۱۹۳۰ء ۔

بہت معیاری معلوم ہوتی ہیں ۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین ، شیخ ممتاز حسن عثمانی ، رتن ناتھ سرشار ، اکبر الہ آبادی ، مچھو بیگ ستم ظریف ، نواب سید محمد آزاد کی تحریروں میں طنز و مزاح کے علاوہ علمیت بھی نظر آتی ہے جبکہ "سرپنچ" کے لکھنے والوں کی تحریروں میں لاابالی سا انداز نظر آتا ہے ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اودھ پنچ کے بعد طنز و ظرافت کا سب سے بڑا خزانہ ہمیں سرپنچ ہی میں نظر آتا ہے ۔ احمد جمال پاشا اپنی کتاب میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> "اودھ پنچ کے بعد سرپنچ کا ہمارے مزاحیہ ادب میں سب سے اہم مقام ہے ۔ سرپنچ نے مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل کو جنم دیا ، شائستہ ظرافت اور مزاح کے لیے فضا پیدا کی اور کاروان طنز و ظرافت کو ایک نئی منزل عطا کی ۔ سرپنچ کے خس و خاشاک میں بھی زعفران کی آمیزش اور خوشبو ہے ۔ غرض "سرپنچ" شوکت تھانوی کا ایک ایسا محترم کارنامہ ہے جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ اور سربلند رکھے گا ۔"[1]

۱۹۳۲ء میں "ہمدم" کی انتظامیہ نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا تو شوکت تھانوی کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی ۔ ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ روزنامہ "اودھ اخبار" میں ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی اسامی کا پتہ چلا ۔ لہذا شوکت تھانوی اس اخبار کے قائم مقام ایڈیٹر سید نور الحسن سے ملے ۔ ابھی ادھر ادھر کی باتیں جاری تھیں اور شوکت تھانوی نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر نہیں کیا کہ سید نور الحسن نے انہیں "اودھ اخبار" میں ملازمت کی پیش کش کی ۔ شرائط طے ہوئیں اور شوکت تھانوی "اودھ اخبار" کے عملہ ادارت میں شامل ہوگئے ۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے ہمدم والا کام "دو دو باتیں" جاری کیا ۔ کبھی کبھی اداریہ لکھنے کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا جاتا تھا ۔ اس اخبار کے شب و روز شوکت تھانوی نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیے ہیں :

۱۔ احمد جمال پاشا : شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ، ص ۳۷ ۔

''دراصل اس وقت اس اخبار کی حیثیت اخبار کی تھی ہی نہیں بلکہ مالکان اخبار کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا، لہذا یہ سرنامہ پر ان کی تصویر کے ساتھ نکلتا رہے، جس طرح بھی نکلے۔ البتہ چونکہ بہت پرانا اخبار تھا لہذا ولایتی کمپنیوں کے اشتہارات اس کے پاس کافی تھے۔ مگر پھر بھی غالباً خسارہ میں چل رہا تھا۔ ہم نے اس اخبار کے دفتر میں کام کرکے یہ تماشا دیکھا کہ جس کا جس وقت جی چاہا چلا آیا اور جو جی چاہا کام کیا، کوئی پرسان حال نہ تھا۔ خود ایڈیٹر صاحب اس قدر کم سخن تھے کہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ سکتے تھے۔ عملۂ ادارت والے یہ کرتے تھے کہ قلم سے زیادہ قینچی سے کام لیا جاتا تھا''۔[1]

سید نورالحسن نے اس اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو شوکت تھانوی کو ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹر جیل گئے ہوئے تھے، نورالحسن صاحب قائم مقام ایڈیٹر تھے، اسی طرح شوکت تھانوی کو بھی قائم مقام ایڈیٹر بنایا گیا۔ اسی زمانہ میں منشی بشن نرائن کا انتقال ہو گیا جو نولکشور اسٹیٹ کے مالک تھے اور تمام اسٹیٹ مع اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا، اس لیے کہ نئے مالک کے بالغ ہونے میں کچھ عرصہ تھا۔ اس انقلاب کا شوکت تھانوی کو یہ فائدہ ہوا کہ جیل سے آنے کے باوجود اودھ اخبار کے اصل ایڈیٹر ادارت پر واپس نہ آسکے اور شوکت تھانوی بحیثیت ایڈیٹر کام کرتے رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد کورٹ آف وارڈس کے افسران نے انہیں اسسٹنٹ ایڈیٹری پر واپس کر دیا اور ایک نئے صاحب کو ایڈیٹر بنا کر بھیج دیا۔ شوکت تھانوی نولکشور اسٹیٹ کی ملازمت کو ایک قسم کی پنشن سمجھتے تھے اس لیے اسسٹنٹ ایڈیٹری کو بھی قبول کر لیا۔

شوکت تھانوی لکھنؤ کی زرد کوٹھی میں رہ کر بیک وقت یہ دو ملازمتیں یعنی اودھ اخبار کی ملازمت اور سرپنچ کی ادارت نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں لاٹوش روڈ کے ایک مکان میں آنا پڑا۔ اس مکان کے دو حصے تھے اندر کے حصہ میں شوکت تھانوی نے رہائش رکھی اور باہر کے حصہ کو

[1] شوکت تھانوی: ''ما بدولت''، مطبوعہ نقوش پریس، لاہور، ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

سرپنچ کا دفتر بنا دیا۔ ''سرپنچ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہولوی تھے۔ شوکت تھانوی اپنی کتاب ''مابدولت'' میں ''سرپنچ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پہلا ہی پرچہ بازار میں آیا تھا کہ لوگوں کو دوسرے اور پھر تیسرے اور آخر ہر نمبر کا مسلسل انتظار رہنے لگا۔ نئے نئے کالم اس میں جاری کیے۔ تمام اطراف ملک کے مزاح نگاروں سے بہتر سے بہتر مضامین لکھوائے، نئے نئے مزاح نگار پیدا کیے اور کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے ایک خاص حلقہ بنا لیا اور خریداروں کی تعداد میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار کی ایک خاص وقعت اخباری برادری میں بھی قائم ہوگئی۔ اس کے مضامین معاصرین نے نقل کرنا شروع کر دیے اور اس کے تبصروں سے بڑے بڑے سورما چوکنا رہنے لگے کہ معلوم نہیں کب کس کی کس رنگ میں خبر لے لی جائے''۔[1]

شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، چودھری محمد علی رودلوی، ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی اور شہباز بلند پرواز ''سرپنچ'' کے نو رتن کہلاتے تھے۔ سرپنچ کی فائلوں میں سب سے زیادہ تخلیقات ان ادیبوں کی نظر آتی ہیں۔ پانچ شاعر خاص طور سے اپنی تخلیقات ''سرپنچ'' میں بھیجا کرتے تھے جنہیں ''سرپنچ'' کے ''پنچ'' کہا جاتا ہے، ان میں علامہ عبدالباری آسی، امین سلونوی، منور آغا مجنوں لکھنوی، احتشام ماہلی اور عبداللہ ناصر شامل تھے۔ ''یہاں یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ ہے کہ سید احتشام حسین افسانہ نگاری سے قبل سرپنچ کے باقاعدہ مزاح نگار تھے اور مزاحیہ شاعری میں حیران تخلص کرتے تھے''۔[2]

سرپنچ کے اداریوں میں سنجیدہ مسائل پر شگفتہ انداز میں بحث کی جاتی تھی۔ اس اداریے میں شوکت تھانوی نے ادبی بے راہ روی کی نشاندہی کی ہے وہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کی تحریریں ہماری معاشرت پر ضرور اثر انداز

۱۔ شوکت تھانوی: ''مابدولت''، مطبوعہ نقوش پریس، لاہور، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

۲۔ احمد جمال پاشا: ''شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت''، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ، ص ۴۸۔

ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ادیبوں کو اس قسم کے اخلاق سوز افسانے لکھنے سے باز رہنا چاہیے۔

سرپنچ کے نورتن اور پنچوں کے علاوہ اس کی برادری پورے برعظیم میں پھیلی ہوئی تھی۔ عام طور پر کوشش تو نئی تحریریں لکھوانے کی ہوتی تھی لیکن بعض حالتوں میں دوسرے رسائل اور اخبارات سے بہترین تخلیقات کا انتخاب بھی چھاپا جاتا تھا۔ سرپنچ میں لکھنے والوں کے اسمائے گرامی میں خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، حکیم ممتاز حسین عثمانی، مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، علامہ جمیل مظہری، سلطان حیدر جوش، ایم۔ اسلم، فلک پیما، ارشد تھانوی، فرقت کاکوروی، ملا حضوری، خان محبوب طرزی، علامہ ہنر اور محشر عابدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سرپنچ کے ان لکھنے والوں کو سرپنچ برادری کہا جاتا تھا۔

شوکت تھانوی کا ''سرپنچ'' اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار ہے جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم تھے، اسی لیے ان کالموں کی مزاحیہ کالم نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت رہے گی۔ سرپنچ کے قابل ذکر کالم دو دو باتیں، قامزار، چٹکیاں، تیر بہدف، کہکشان، دیوار قہقہہ، گرما گرم، عقلمندیاں، بے پر کی، گپ شپ، ٹیلی فون، کٹ پیس، حضرت عشق، الم غلم، پھبتیاں، تو تو میں میں، اِدھر اُدھر کی، ایڈیٹر کی ڈائری اور اقوال مولانا سرپنچ تھے۔ اقوال مولانا سرپنچ کے تحت مولانا شوکت تھانوی ایسے اقوال تیار کرتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند اقوال ملاحظہ کیجیے:

(۱) ''شادی کے بعد سسرال میں پڑے رہیے تاکہ کچھ عرصہ کے بعد میکے کی قدر ہو سکے۔

(۲) دوسروں کی بیویوں کو اپنی والدہ سمجھیے تاکہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں۔

(۳) پلاؤ زردہ سے کم پر شکر ادا نہ کیجیے ورنہ اللہ میاں سمجھیں گے کہ یہ بندہ دال اور روٹی میں خوش ہے اسے اس سے بہتر کھانے کیوں دیے جائیں۔

(۴) وقت کا پابند ہونا حبس دوام کی سزا بھگتنے کے برابر ہے۔

(۵) آج کا کام کل پر ٹالیے اس لیے کہ ممکن ہے کہ کل کا کام پرسوں

ہو ٹل جائے"۔[1]

"اودھ پنچ" کے بعد ہمیں کارٹونوں کا سب سے بڑا خزانہ شوکت تھانوی کے "سرپنچ" میں ہی ملتا ہے۔ سرپنچ کے کارٹون بہت نوکیلے، تیکھے، جاندار، بولتے ہوئے اور دلاویز ہوتے تھے۔ کامل لکھنوی اور سمیع فرنگی علی اپنے فن میں یکتا تھے۔ یہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات کو ہدف بناتے تھے۔ خاص نمبروں میں مزاح نگاروں کے کارٹون بھی ہوتے تھے۔ چوڑیاں پہنے ہوئے پولیس، حامد کا ہوا، مولانا شوکت علی، افقر موہانی، عنایت دہلوی، مدیر ریاست اور "لیگ اقوام" کے کارٹون اس میں بے حد مقبول ہوئے۔ سرپنچ اکثر انگریزی رسائل و اخبارات کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا[2]۔

"سرپنچ" میں شوکت تھانوی کے کمالات اپنے عروج پر تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کالم خود لکھا کرتے تھے اور ہر کالم میں کوئی نہ کوئی جدت ہوتی تھی۔ وہ اپنے کالم کا موضوع اردگرد بکھری ہوئی خبروں سے اپنے مزاج کے مطابق حاصل کیا کرتے تھے اسی لیے ان کے موضوعات میں ہمیں تنوع نظر آتا ہے۔

شوکت تھانوی اودھ اخبار کی ملازمت اور سرپنچ کی ادارت میں مصروف تھے کہ لالہ وش بندھو گپتا کے اخبار روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر شری رام لال ورما، مالکان تیج سے کسی بات پر ناراض ہو کر لکھنؤ آ گئے اور لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ "ہند" نکالنے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ وہ امین سلونوی کی معرفت شوکت تھانوی سے ملے اور اس قسم کی ادارت کی پیش کش کی کہ روزنامہ "ہند" کی ادارت تو شوکت تھانوی کریں لیکن نام لکھا ہو شری رام لال ورما کا۔ امین سلونوی کے اصرار پر ان سے شرائط طے ہوئیں اور جب انہوں نے ہر شرط منظور کر لی تو شوکت تھانوی اخبار "ہند" سے وابستہ ہو گئے اور اودھ اخبار کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ شوکت تھانوی اودھ اخبار کی ملازمت سے بد دل ہو چکے تھے۔ وہ بہت عرصہ تک قائم مقام ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن اودھ اخبار کی

---

[1] احمد جمال پاشا: "شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت"، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ، ص ۷۲، ۷۳۔

[2] نقوش لاہور، شوکت نمبر۔ شوکت تھانوی، ایک صحافی از احمد جمال پاشا، ص ۶۰۸۔

انتظامیہ نے نہ تو کسی قسم کا سپیشل الاؤنس دیا اور نہ ہی ان کی محنت کی قدر کی۔ کچھ عرصہ کے بعد نئے ایڈیٹر کو تعینات کر دیا گیا اور شوکت تھانوی کو اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر شوکت تھانوی نے اودھ اخبار چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور روزنامہ ہند کی ایڈیٹری قبول کر لی۔ یہ اخبار زیادہ دیر نہ نکل سکا صرف دو مہینے کے بعد ہی بند کر دیا گیا۔

روزنامہ ہند بند ہو گیا تو ”سراج جرنلس“ نے ”شباب“ کے نام سے ایک ادبی ماہنامے کا اجرا کیا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو مقرر کیا گیا۔ اس ادبی ماہنامے میں اس وقت کے اہم ادیبوں کی تخلیقات چھپتی تھیں۔ شوکت تھانوی نے اس کے کئی اہم نمبر نکال کر دنیائے ادب میں دھوم مچا دی۔ لیکن یہ ایک سال کے بعد بند ہو گیا۔

۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار ”حق“ کی انتظامیہ نے اسے روزانہ اخبار بنانے کا فیصلہ کیا۔ عبدالرؤف عباسی کی ادارت میں یہ اخبار نکلتا تھا۔ شوکت تھانوی کو اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پیش کش کی گئی۔ دوستوں کے مشورہ سے شوکت تھانوی نے اسے قبول کر لیا۔ روزنامہ ”حق“ کی مناسبت سے شوکت تھانوی نے اپنے فکاہیہ کالم کا نام ”حق و باطل“ تجویز کیا۔ اس کالم کے علاوہ خبروں کا ترجمہ، شذرات کا لکھنا بھی ان کی ذمہ داری ٹھہری، شوکت تھانوی تقریباً تین سال اس اخبار سے وابستہ رہے اور اپنا فکاہیہ کالم ”حق و باطل“ باقاعدگی سے لکھتے رہے۔

روزنامہ ”حق“ کی ملازمت کے دوران شوکت تھانوی کو قادیان جانا پڑا۔ لکھنؤ میں ان دنوں احمدیت کے خلاف پروپیگنڈہ ہو رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد عثمان احمدی نے ”حقیقت“ کے ایڈیٹر انیس احمد عباسی اور شوکت تھانوی کو دعوت دی کہ آپ لوگ قادیان چل کر وہاں کے حالات کا خود مطالعہ کریں اور اپنے اس مطالعہ کی روشنی میں اگر مناسب سمجھیں تو کچھ لکھیں۔ یہ دعوت منظور کر لی گئی اور قادیان پہنچ کر ہر شعبہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ لکھنؤ میں ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا حقیقت اس کے برعکس تھی۔

روزنامہ ”حق“ کی ملازمت کا تذکرہ ”مابدولت“ میں شوکت تھانوی اس طرح کرتے ہیں:

> ''عبدالروف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عباسی سے دوستانہ تعلقات پہلے تھے اور ملازمت بعد میں شروع کی تھی ۔ ڈر یہ تھا کہ کبھی دوستی ختم نہ ہو جائے اور صرف خادم اور آقا کے تعلقات نہ رہ جائیں ۔ مگر یہ صورت نہ ہو سکی بلکہ دوستانہ تعلقات نے عزیز دارانہ تعلقات کی صورت اختیار کر لی ۔''[1]

عبدالروف عباسی نے ۱۹۳۷ء میں یہ طے کیا کہ ایک ماہنامہ نکالا جائے جس کا نام ''کائنات'' تجویز ہوا ۔ شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا ۔ دو تین پرچوں کے بعد ہی اس کے خریداروں کی تعداد کافی پیدا ہو گئی اور رسالہ نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی ۔ روزانہ اخبار کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ اس رسالہ پر توجہ دینا بہت مشکل نظر آ رہا تھا ۔ اسی لیے اس کے ۵ یا ۹ شمارے ہی نکلے ہوں گے کہ عباسی صاحب نے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا ۔ حالانکہ اس کے بند ہونے کے بعد بھی اس کی مانگ برابر جاری رہی ۔

شوکت تھانوی تقریباً تین سال تک روزنامہ ''حق'' سے وابستہ رہے اور ۱۹۳۸ء کے اوائل میں بعض نزاکتوں کے تحت ''حق اخبار'' سے علیحدہ ہو گئے ۔ ''مابدولت'' میں اپنی اس علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> ''ہم نے اپنی شکایت کے ساتھ استعفیٰ پیش کر دیا ۔ ''حق'' کی ملازمت کے زمانہ میں جو محنت ہم نے کی تھی اور جس خلوص سے کام کیا تھا اس کے پیش نظر ہم کو ایک وہم یہ بھی تھا کہ ہم نے بھی تھوڑا بہت استحقاق پیدا کر لیا ہے اور حق کے حق داروں میں ہم بھی ہیں ، مالی حیثیت سے نہ سہی اخلاقی حیثیت سے سہی کم سے کم اتنا حق تو ہمارا بھی تھا کہ ہمارے اس استعفیٰ پر ہمدردانہ غور کیا جاتا ۔ مگر بجائے اس کے ہوا یہ کہ عبدالروف صاحب عباسی نے ایک دم ہی نظریں ایسی پھیر لیں کہ گویا کبھی مراسم تھے ہی نہیں ۔ لہٰذا ہم نے اپنے باقی مطالبات سے بھی ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے رہے سہے تعلقات کو بھی ختم کر دیا جاتا ، ہم نے ملازمت ہی کو

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص ۱۹۹ ۔

ختم کر دیا۔‘‘[1]

شوکت تھانوی کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے دوستوں کو جب معلوم ہوا کہ شوکت تھانوی ان حالات میں ’’روزنامہ حق‘‘ سے علیحدہ ہوئے ہیں تو ان میں سے کچھ نے عبدالروف صاحب عباسی سے صلح کروانے کی کوشش کی۔ رفیع احمد خان ان سب میں پیش پیش تھے۔ عباسی صاحب کا رویہ حوصلہ افزا نہیں تھا اس لیے رفیع احمد خان ان کی طرف سے بد دل ہوگئے۔

خان بہادر سید عین الدین کو جب شوکت تھانوی کی ’’حق اخبار‘‘ سے علیحدگی کا پتہ چلا تو انھوں نے شوکت تھانوی کو اپنے پاس بلا کر اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا مشورہ دیا۔ اس کی مالی اعانت کا بوجھ اپنے سر لیا۔ مالی مسائل حل ہوتے دیکھ کر شوکت تھانوی نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور ایک اسکیم بنائی۔ اس اسکیم کو کچھ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے پیش کیا گیا انھوں نے خان بہادر سید عین الدین صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اخبار کو سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ علی گڑھ کے نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خان سے بھی سید عین الدین نے گراں قدر عطیہ دلوایا۔ اس طرح شوکت تھانوی کے پاس اتنی رقم اکٹھی ہوگئی کہ وہ اخبار نکال سکتے تھے۔

چودھری خلیق الزماں نے اخبار کا نام ’’ہنگامہ‘‘ تجویز کیا تھا مگر اکثریت کی رائے ’’طوفان‘‘ کے حق میں رہی۔ اس لیے شوکت تھانوی کے اخبار کا نام ’’طوفان‘‘ طے پایا۔ لاٹوش روڈ پر ایک بہت عمدہ مکان ’’طوفان‘‘ کے دفتر کے لیے اور شوکت تھانوی کی رہائش کے لیے کرایہ پر لیا گیا۔ ’’طوفان‘‘ کا بہت عمدہ سائن بورڈ تیار کروا کر آویزاں کیا گیا۔ خان بہادر شیخ احمد علی کی بیگم صاحبہ نے اس دفتر کے لیے تمام فرنیچر بطور عطیہ دیا۔

’’طوفان‘‘ کے لیے عملہ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو شوکت تھانوی نے حسن محبوب طرزی کو اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا اس لیے کہ وہ ان کے ساتھ ’’ہمدم‘‘، ’’اودھ اخبار‘‘ اور ’’سرپنچ‘‘ میں کام کر چکے تھے۔

۱۔ شوکت تھانوی: مابدولت، مطبوعہ نقوش پریس لاہور، ص ۲۱۳۔

قسم تھانوی کے انتظامی مشورے اور امین سلونوی کی انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کی خدمت ''طوفان'' کے لیے موجود رہی۔ اس قسم کے تمام ابتدائی انتظامات مکمل کرنے کے بعد ١٠ ربیع الاول ١٣٥٧ھ مطابق ١١ مئی ١٩٣٨ء کو ''طوفان'' کا نمونے کا پرچہ نکلا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون ١٩٣٨ء سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے، خریدار فراہم کرنے، ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات مکمل کرنے میں صرف کیے گئے۔ یکم جون ١٩٣٨ء کو اس کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔

١١ مئی ١٩٣٨ء کو نمونے کا پرچہ نکالا گیا۔ اس کا اداریہ ''روزنامہ ''طوفان'' کا اجراء اور اس کے مقاصد'' کے موضوع پر لکھا گیا جس کا آغاز اس شعر سے کیا گیا:

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اک ہلکی سی موج
ہاں ابھرنے کے لیے موجوں میں طوفان چاہیے

اس شعر کے بعد شوکت تھانوی اداریے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

> ''روزنامہ طوفان کا اجراء میرے اس مسلسل خواب کی ایک خوشگوار تعبیر ہے جو اپنی صحافتی زندگی میں اپنی بیدار آنکھوں سے میں برابر دیکھتا رہا ہوں اور اخبار نویسی کا ہر تلخ تجربہ جس شیریں توقع اور جس خوشگوار مستقبل کے سہارے مجھ کو اس مشغلہ سے مایوس ہونے سے ہمیشہ باز رکھتا رہا وہ شیریں توقع آج پوری ہو رہی ہے اور وہ خوشگوار مستقبل آج میرے پیش نظر ہے۔ آج میرے ہاتھ میں میرا ہی قلم ہے اور میرے دماغ میں میرے ہی خیالات۔ میں آج مسلم لیگ کا حامی ہوکر کانگرس کی ہمنوائی کے لیے مجبور نہیں ہوں اور نہ کانگریس کے مقاصد پر ایمان رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی جانبداری کے لیے مجھ کو کوئی مجبور کر سکتا ہے۔ میں نے اپنی صحافتی زندگی کے کم و بیش بارہ سال اپنے قلم سے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی میں بسر کیے۔ اکثر مجھ کو ضمیر فروشی بھی کرنا پڑی اور اکثر اس سے بھی زیادہ ذلیل قسم کی قلمی تجارت۔ مگر میں جانتا تھا کہ میرا قلم دراصل قلم نہیں بلکہ پھاوڑہ ہے اور میرا کام صرف یہ ہے کہ دماغ کو بالکل معطل کرکے صرف اپنے

سرمایہ دار کے اشاروں پر چلوں اور قلم کو چلاؤں ۔ ۔ ۔ بہرحال بارہ سال کی اس ضمیر فروشی نے مجھ کو بہت سے قیمتی سبق بھی پڑھائے ہیں اور ان ہی قیمتی اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں سیاسی عقائد کے اعتبار سے ایک اخبار کا اپنے کو کسی ایک عقیدہ کے لیے وقف کر دینا اصول صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں۔ کسی اخبار کا اپنے کو کسی جماعت کا آرگن کہنا اس کی اخباری شان کے شایان نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس قسم کے جماعتی آرگن اخبار کی تعریف سے علیحدہ ہو کر اشتہار کی تعریف میں آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ طوفان ہر جماعت کا اخبار ہے اور ہر جماعت کے جائز حقوق کا محافظ مگر اسی کے ساتھ ہر جماعت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس ارادہ میں نیک نیتی کو دخل ہے تو میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اسی جادہ پر استقلال اور ہمت عطا کر کے کامیابی کی منزل کی طرف سلامت روی کے ساتھ گامزن رکھے گا۔ آمین

اس کو طوفان حوادث سے بچانا یا رب
آرزو پھول لیے پھرتی ہے داماوں میں"

یہ اداریہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں شوکت تھانوی نے اپنا نظریہ' صحافت پیش کیا ہے۔ صحافی اور اخبار کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پیشتر اپنی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے اور واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ پہلے میرا قلم ضمیر کی آواز کی بجائے سرمایہ دار کی آواز کا ساتھ دیا کرتا تھا لیکن آج جبکہ وہ اپنا ذاتی اخبار نکالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں تو وہ یہ عہد کرتے ہیں کہ ان کا اخبار کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بننے کی بجائے ہر جماعت کو اس کی برائیوں اور بھلائیوں سے نہایت دیانت داری کے ساتھ آگاہ کرتا رہے گا تا کہ ان کی اصلاح بھی ہو سکے اور وہ اپنی حقیقت سے بھی باخبر رہیں۔ اداریہ کے بعد اس نمونے کے پرچے میں شوکت تھانوی نے "مد و جزر" کے نام سے ایک فکاہیہ کالم بھی تحریر کیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو

۱۔ روزنامہ "طوفان"، لکھنؤ، ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء، جلد نمبر (۱)، ص ۲۔

مصالحتی کمیٹی بن چکی تھی اور ہر طرف مصالحت کروانے اور حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس نمونے کے پرچہ میں ایک کارٹون بنا ہوا ہے اور یہ قطعہ لکھا ہوا ہے۔

یہ شیخ و برہمن کو لڑانے والے
ہیں مسجد و مندر کے بھی ڈھانے والے

طوفان یہ اٹھا ہے اٹھانے کو انہیں
طوفاں میں ہیں طوفان اٹھانے والے[1]

یہ اخبار چھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ آخری صفحہ پر شوکت تھانوی کے دو ناولوں ''خانم خاں'' اور ''موتیا چاہ'' کا اشتہار ہے۔ اس کے علاوہ وہی وہانوی کی کتاب ''شرمناک افسانے'' کا بھی اشتہار ہے۔

روزنامہ ''طوفان'' کا باقاعدہ اجراء یکم جون ۱۹۳۸ء مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۵۰ ہجری یوم چہار شنبہ سے ہوا۔ اس اخبار کے پہلے صفحہ پر اہم خبروں کے علاوہ ''طوفان کی حیات بخش موجیں'' کے عنوان کے تحت اشرف الحکماء حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی کی چھبیس اشعار کی نظم میں روزنامہ طوفان کا خیر مقدم کیا گیا۔ دوسرے صفحہ پر خواجہ حسن نظامی نے روزنامہ ''طوفان'' کا خیر مقدم ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

> ''مولانا تفریح الملک شوکت صاحب تھانوی کا روزانہ اخبار طوفان آج میرے پاس آیا۔ آسمان پر گرد و غبار کا طوفان ہے، زمین پر حرارت شمسی کا طوفان ہے، کل رات مولانا تفریح الملک کی تقریر لکھنؤ ریڈیو میں سنی تھی۔ مریخ کے دم دار آدمی کی بیوی نے ریڈیم کے حروف کے اشعار کا ذکر کیا تھا۔ اگر وہ خواب تھا تو اس کی تعبیر آج طوفان اخبار کی صورت میں سامنے آ گئی۔ خدا کرے کہ یہ اخبار مفرد طوفان رہے کیونکہ مرکب طوفان کے لیے اردو زبان میں پہلا لفظ جھوٹ لگایا جاتا ہے یعنی جھوٹ طوفان۔ مگر یہ اخبار سچ طوفان ثابت ہو۔ مولانا کی تحریر و تقریر کے طوفان مسلسل آتے رہتے ہیں لیکن یہ اخبار ان کی دلچسپ اور فرحت بخش

۱۔ روزنامہ ''طوفان''، لکھنؤ، ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء، ایڈیٹر شوکت تھانوی، ص ۲۔

> تحریروں کا ایک ذخیرہ ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ وہ اس کو ادبی اخبار بنانے کی کوشش کریں اور پنجابی تجارت کے سیلاب میں بہنے سے انکار کر دیں۔"[1]

اس اخبار میں زیادہ جگہ راجہ صاحب جہانگیر آباد، صدر مجلس استقبالیہ زمیندار کانفرنس کے خطبہ صدارت کو دی گئی ہے جس میں زمینداروں کے مسائل اور ملک و ملت کی ترقی میں زمینداروں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اخبار کے آخری صفحہ پر شوکت تھانوی کی کتابوں سوتیاہ چاہ، دن پھینک، سودیشی ریل، بڑھیں، خانم خاں، موج تبسم، کہرستان اور سیلاب تبسم کے اشتہارات دیے ہوئے ہیں۔

۲ جون ۱۹۳۸ء مطابق ۲ ربیع الثانی ۱۳۵۷ ہجری کے اخبار میں پہلے صفحہ پر مہاراج دھراج دربھنگہ کے خطبہ صدارت کے ساتھ ساغر نظامی کی طرف سے آٹھ اشعار پر مبنی ایک نظم میں روزنامہ طوفان کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ دوسرے صفحہ پر خان بہادر نواب بہادر ڈاکٹر نواب سر محمود مزمل اللہ خان صاحب بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای، او۔ بی۔ ای، ایل۔ ایل۔ ڈی رئیس اعظم بھیکم پور (علی گڑھ) نے طوفان کا خیر مقدم ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

مخدومی و مکرمی۔ سلامت۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

> اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں اس سے زیادہ قوت عطا فرمائے، جس طرح سے کہ "طوفان" کے انجام میں خوشگوار بارش اور معتدل موسم ہوتا ہے اسی طرح اس کا نتیجہ خدا کرے کہ خوشگوار ہو۔
>
> خاکسار
>
> محمد مزمل اللہ خان[2]

۲ جون کے اخبار میں "مد و جزر" کا کالم سر المرتھ رائٹ کے اس نظریہ کے بارے میں ہے کہ آنسو میں نہایت قیمتی جوہر ہوتا ہے جو ہر قسم کے جراثیم کو مار سکتا ہے۔ شوکت تھانوی اسے اپنے کالم کا موضوع بنائے

---

[1] روزنامہ "طوفان"، لکھنؤ، ایڈیٹر شوکت تھانوی، یکم جون ۱۹۳۸ء ص ۲۔

[2] ایضاً، ۲ جون ۱۹۳۸ء، ص ۲۔

ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "اگر سر المرتھ رائٹ کا یہ نظریہ درست ہے تو گھر بیٹھے اچھی تجارت ہاتھ آئی اور رونا بھی گویا ایک قسم کا بیوپار ہوگیا کہ جب مفلسی نے تنگ کیا، لگے آنسو بہانے۔ اپنے آنسوؤں سے بوتلیں بھر کر "عرق جراثیم کش" کا لیبل لگا دیا اور دوا فروشوں کے یہاں بیچ آئے۔ ہندوستانیوں کے لیے رونے کے امکانات خدا کے فضل سے یوں ہی کیا کم ہیں۔ دوسرے ممالک کے باشندے تو شاید کوشش کرنے کے بعد آنسو بہا سکتے ہیں مگر یہاں تو یہ کاروبار نہایت آسانی کے ساتھ چل سکتا ہے اس لیے کہ آلام و مصائب نے ہر ہندوستانی کی صورت ہی رونی بنا دی ہے اور ہر نوک مژگاں میں مستقل واٹر ورکس کھول رکھے ہیں کہ جہاں پلک دبائی اور سیلاب امنڈ آیا۔"[1]

٣ جون ١٩٣٨ء کے اداریہ میں شوکت تھانوی نے مسلمانوں کی مرکزیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار کی ایک سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ انتشار اور خود غرضی کی وجہ سے مسلمان بکھر چکے ہیں حالانکہ اسلام نے مرکزیت کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے مگر اسی کو آج غیر اہم سمجھا جا رہا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھتے ہیں اور اسی نا اتفاقی کی وجہ سے دوسری قومیں انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

یہ اخبار بھی چھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری یعنی چھٹے صفحہ پر شوکت تھانوی کی کتابوں سوتیاہ چاہ، دل پھینک، سودیشی ریل، بڑھس، خالم خان، موج تبسم، کہرستان اور سیلاب تبسم کے اشتہارات ہیں۔

٤ جون ١٩٣٨ء کا اخبار پہلے اخبارات کی طرح پانچ کالمی ہے۔ تمام اخبارات میں شوکت تھانوی نے پہلے صفحہ کی اہم سرخی کو زیادہ سے زیادہ تین کالمی بنایا ہے۔ اس اخبار کی اہم سرخی کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] روزنامہ "طوفان"، لکھنؤ، ایڈیٹر شوکت تھانوی، ٢ جون ١٩٣٨ء، "مد و جزر"، ص ٢۔

''برطانیہ کی شرائط صلح ہٹلر کی ٹھوکروں میں'' دوسری لائین میں برطانیہ کے لیے صرف ایک صورت باقی ہے یعنی جنگ'' اور تیسری لائن میں ''مسٹر چرچل جرمنی کی اس گستاخی پر آتش زیرپا ہیں۔''

یہ سرخی تین لائنوں میں لکھی گئی ہے۔ پہلی لائن کے لیے جلی قلم استعمال کیا گیا ہے، دوسری لائن کے لیے اس سے کم اور تیسری لائن کے لیے اور کم — اس سرخی کو پڑھنے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ کسی ادیب کی عبارت ہے۔

۵ جون ۱۹۳۸ء کے اداریہ میں بھی ہمیں شوکت تھانوی کا ادبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی سرخی بنائی ہے ''پنڈت جواہر لال نہرو کی زمینداروں کو دھمکیاں'' اور چھوٹی سرخی اس کے نیچے یہ ہے کہ ''ملاح در فرنگ و کشتی در ہند'' اس کے بعد حسب دستور یہ شعر تحریر کیا گیا ہے:

مرا چاک گریباں دیکھ کر تم بعد میں ہنسنا
ہنسے گی تم پہ دنیا تم خبر لو اپنے داماں کی

پنڈت جواہر لال نہرو پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خود آپ اپنی تقریروں کو ملاحظہ فرمائیے اور کانگریسی حکومت کے قیام سے قبل کی پوری زندگی کا مطالعہ کر جائیے تو آپ کو اپنی ہر جنبش اور ہر حرکت بالکل وہی بلکہ اس سے بہت زیادہ بھدی نظر آئے گی جس کو آج اپنی مجنونانہ اور بدمستانہ حرکت کہہ رہے ہیں:
>
> اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
> جس قدر کرنا ملامت اور کو آسان ہے''[۱]

شوکت تھانوی کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ اس لیے وہ جب اخبار کے لیے بھی کوئی چیز لکھتے ہیں تو اس میں لاشعوری طور پر برمحل اشعار کا استعمال

۱- روزنامہ ''طوفان'' لکھنؤ، ایڈیٹر شوکت تھانوی، ۵ جون ۱۹۳۸ء، ص ۲۔

ان کی تحریر میں ادبیت پیدا کر دیتا ہے۔

اپنے کالم ”مد و جزر“ میں شوکت تھانوی نے لکھنؤ کے شیعہ و سنی فساد کو موضوع کالم بنایا ہے۔ انہوں نے نہایت چابکدستی سے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فساد حکومت کے ایماء پر ہو رہا ہے تاکہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور وہ آسانی سے ان پر حکومت کرتے رہیں۔

۷ جون ۱۹۳۸ء کے طوفان کا اداریہ اسپین کی خانہ جنگی کے بارے میں لکھا گیا ہے، عنوان ہے ”اسپین کے جنازہ میں برطانیہ کا کندھا —— اب بھی پوچھا تو مہربانی کی ——“ اپنے کالم ”مد و جزر“ میں شیعہ سنی فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

(ضمیمہ) ۸۔ جون کے اداریہ میں لکھنؤ کی زمیندار کانفرنس کے کانگریس پر اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ایسا سنجیدہ کانگریسی بھی زمینداروں کی اس بیداری پر اپنے قابو سے باہر نظر آتا ہے اور زمیندار کانفرنس کی تجویزوں کو دیکھ کر ایک ایسا بیان دیتا ہے جو کسی طرح بھی اس کی شان کے شایان اور اس کی سیاسی عظمت کے مطابق نہیں کہا جا سکتا۔

۸ جون کے مد و جزر میں حیدرآباد کی ایک خبر کو موضوع بنایا ہے کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر میونسپل کمشنر اپنے رفقائے کار کی ایک جماعت کے ساتھ ۳ جون کی صبح کو جھاڑو، پنجہ اور ٹوکری لے کر نکلے اور سڑکوں کی صفائی اپنے دست مبارک سے شروع کر دی۔ اپنے اس طرز عمل سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ایک لاجواب سبق پڑھایا ہے اور ان کا یہ کارنامہ صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان بھر کے میونسپل کمشنروں کے لیے باعث تقلید ہونا چاہیے۔

۸ جون ۱۹۳۸ء کو روزنامہ ”طوفان“ کا ایک ضمیمہ بھی چھاپا گیا جس کے ”مد و جزر“ میں زمیندار کانفرنس کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں کہا گیا کہ زمیندار غفلت کی نیند سوتے رہے اور کانگریس نے کسانوں کو زمینداروں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور اس طرح کسانوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں، لیکن اب زمیندار جاگ گئے ہیں اور انہوں نے دیہات میں جا کر کسانوں کو کانگریس کے مذموم ارادوں سے باخبر کر دیا ہے اور

ایک والنٹیئر کور بنانے کا فیصلہ بھی کیا ہے جو زمینداروں کے جان و مال کی حفاظت کر سکے۔ کانگریس کو بھی اپنے والنٹیئر پر ناز ہے، لیکن زمینداروں کے والنٹیئر دیہات میں جا کر کسانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں گے۔ اسی کالم کے آخر میں زمینداروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی مرکزیت اور اجتماعیت کو قائم رکھیں اور کسانوں کو بھی اس اجتماعیت میں اپنے ساتھ شریک کریں۔

۹ جون کے اداریہ میں ''کرفیو آرڈر—حکومت وقت کے لیے ایک لمحۂ فکریہ کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں ساڑھے سات بجے شام سے کرفیو آرڈر لگا دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے مسلمان مسجد میں جا کر عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ شوکت تھانوی نے اپنے اداریہ میں حکومت وقت کی توجہ اس اہم مسئلہ کی جانب مبذول کروائی ہے اور حکومت سے اپیل کی ہے کہ اگر کرفیو آرڈر لگانا ایسا ہی ضروری ہے تو اس کا وقت ساڑھے نو بجے رات سے کر دیا جائے تا کہ مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

۱۰ جون ۱۹۴۸ء کے ''طوفان'' کے فکاہیہ کالم ''مد و جزر'' میں شوکت تھانوی نے حکومت پنجاب کے اس فیصلہ کو موضوع بنایا ہے جس میں حکومت نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے چند مزید ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک نیا ٹیکس ''شادی ٹیکس'' کے نام سے بھی عائد کیا گیا تھا جو ہر شادی کرنے والے سے وصول کیا جائے گا۔ شوکت تھانوی اپنے مخصوص انداز میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر غور کیجیے تو شادی بجائے خود ایک دائمی ٹیکس کی حیثیت رکھتی ہے اور شادی کے بعد اس ٹیکس میں روزانہ اضافے ہی ہوتے رہتے ہیں کہ آج صاحبزادے تولد ہوئے ہیں، کل صاحبزادی صاحبہ نے ولادت با سعادت فرمائی ہے۔ آج بیگم صاحبہ اختناق الرحم کے دورہ میں مبتلا ہیں۔ کل ان کی ہمشیرۂ محترمہ کی شادی کا حادثہ درپیش ہے۔ آج صاحبزادے صاحب طولعمرہ' کا ختنہ ہے، کل صاحبزادی صاحبہ کی روزہ کشائی ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا بھر کے ہنگامے شادی کے بعد ہی سے شروع ہوتے ہیں اور شادی ہی ان تمام مصائب کی جڑ ہے۔ اس سے لوگ یوں ہی پناہ مانگتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے

> ہیں پھر جب ٹیکس عائد ہو جائے گا تو لوگ اور بھی "واحد حاضر" رہنا پسند کریں گے"۔[۱]

اس اہم موضوع پر اتنا شگفتہ انداز اختیار کرکے انہوں نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنی آمدنی کے لیے آپ شادی ٹیکس ضرور لگائیں لیکن صرف ان لوگوں پر جو اپنے نابالغ بچوں کی شادیاں کر دیتے ہیں یا ان بوڑھوں پر جو بوالہوسی کا شکار ہوکر شادیاں رچائے بیٹھ جاتے ہیں۔

۱۴ جون کے "مد و جزر" میں انٹرنس کے نتائج پر گفتگو کی گئی ہے۔ برعظیم میں انٹرنس پاس کرنے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ جتنی تعلیم عام ہو رہی تھی اتنی ہی بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شوکت تھانوی نے اس بے روزگاری کے مسئلہ پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۳۸ء کے "مد و جزر" میں شوکت تھانوی نے پنجاب کے اخباروں سے گلہ کیا ہے کہ بمبئی میں کانگریس اور مسلم لیگ کا قصہ اہم نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے لیکن پنجاب کے اخبار اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ان اہم مسائل پر قلم اٹھانے کی بجائے آم اور خربوزہ پر کالم اور اداریہ لکھ رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مولانا عبدالمجید سالک مدیر "انقلاب" اور ملک نصراللہ عزیز مدیر "زمزم" آج کل اپنے پورے انہماک کے ساتھ سیاست امبہ کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں۔ بمبئی میں کانگریس اور مسلم لیگ کا قصہ چھڑا ہوا ہے۔ ادھر لاہور میں یہ نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے کہ آم اور خربوزے کے معاملات کو کس طرح طے کیا جائے۔ یہ دراصل کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ ہم تو اس کو کانگریس اور مسلم لیگ کے قضیہ سے کم اہمیت نہیں دیتے۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں جو مناسبت ہے تقریباً وہی مناسبت ہم کو آم اور خربوزے میں نظر آتی ہے"۔[۲]

۱۔ روزنامہ "طوفان"، لکھنؤ، ۱۰ جون، ۱۹۳۸ء، کالم "مد و جزر"، ص ۲۔

۲۔ روزنامہ "طوفان"، لکھنؤ، ۱۷ جون، ۱۹۳۸ء، ایڈیٹر شوکت تھانوی، "مد و جزر"، ص ۲۔

۱۸ جون ۱۹۳۸ء کے اداریہ کی سرخی ہے ''کانگریس کے چار شکار — مسلمان، اچھوت، زمیندار اور مزدور'' کانگریس اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کہتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے نہ مزدوروں کا اعتماد حاصل ہے نہ زمینداروں کا اور اس سے نہ مسلمان مطمئن ہیں نہ اچھوت۔ پھر یہ نمائندہ جماعت کیسے ہو سکتی ہے۔ شوکت تھانوی نے اسے ایک ایسا جھلملاتا ہوا چراغ کہا ہے جسے چاروں طرف سے آندھیوں نے گھیر لیا ہو۔

۲۰ جون کے اداریہ کا موضوع ہے ''کانگریسیوں کی اردو دشمنی'' شوکت تھانوی نے قائد اعظم محمد علی جناح کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قائد اعظم نے اپنی تقریر میں کانگریس کی اردو دشمنی اور ہندی نوازی کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد نے حسب معمول کانگریس کی حمایت میں دیا ہے۔ ان کا یہ بیان شاید کانگریسیوں کے لیے تو اہم ہو لیکن کانگریسی حدود کے باہر کسی نے اسے قابل غور بھی نہیں سمجھا۔

۴ جولائی ۱۹۳۸ء کے ''مد و جزر'' میں شوکت تھانوی نے کانگریسی مسلمانوں پر بھرپور طنز کیا۔ اسلامی روایات کو چھوڑنے اور مذہب سے مغائرت برتنے پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''کانگریس میں جو مسلمان شریک ہیں ان کا بھی عجیب عالم ہے۔ شکل و صورت ایسی بنائے پھرتے ہیں کہ کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئے کہ یہ آدمی ہیں یا ہندو۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہیں اور السلام علیکم کو کانگریس کی شان میں گالی سمجھتے ہیں۔ مسجد اور باجے کا قضیہ ہو تو وہ سارے رواداری کے باجہ بجانا شروع کر دیں گے مگر مسجد میں محض اس لیے نہ جائیں گے کہ اس سے فرقہ وارانہ رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے کو حضرت اور جناب وغیرہ کے بجائے شریمان لکھا ہوا دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔ سبزی کھاتے ہیں اور چپل پہنتے ہیں۔ خیر یہ تمام باتیں تو یوں ہی سی حماقت کی ہیں مگر عبرت انگیز اور حد درجہ افسوس ناک حالت یہ ہے کہ یہ کلمہ گو کانگریسی حضور سرور کائنات صلعم کو بھی صرف ''محمد صاحب'' کہتے ہیں اور اس طرح اسلام سے اپنی مغائرت کا ثبوت دیتے ہیں۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ''۔[1]

روز نامہ ''طوفان'' کی مصروفیات کے علاوہ شوکت تھانوی دوسرے رسالوں کے لیے مضامین اور افسانے بھی تحریر کرتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے لیے بھی بہت کچھ لکھتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں شوکت تھانوی کے دوست نسیم انہونوی نے عورتوں کے لیے ایک رسالہ ''حریم'' نکالا۔ اس کے ایڈیٹر نسیم انہونوی تھے اور سرپنچ جرنلس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے یہ رسالہ نکلتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں شوکت تھانوی کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا۔ زنانہ رسالہ کی مناسبت سے شوکت تھانوی نے لکھنؤ کی بیگمات کے چند گھریلو الفاظ کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ یہ سلسلہ مضامین بہت دلچسپ ثابت ہوا اور اس کی مقبولیت کے پیش نظر نسیم انہونوی نے ان تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا اور اس کتاب کا نام ''مونڈی کاٹے'' رکھا۔ اس کتاب میں بارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے موضوعات یہ ہیں۔ (۱) نگوڑے مونڈی کاٹے، (۲) اوئی۔ نوج، (۳) نگاو، زہر مار کرو، (۴) دور، دفعان، (۵) چولہے میں جاؤ۔ بھاڑ میں جاؤ، (۶) چل، ہٹ، (۷) موئے، مردے، (۸) اے ہے، ہے ہے، (۹) اوں، وہ، (۱۰) توبہ، اللہ، (۱۱) آگ لگے، جھاڑو پھرے، (۱۲) اینی اللہ، اوئی اللہ، ہائے اللہ۔

نسیم انہونوی نے ''مونڈی کاٹے'' کا تعارف کراتے ہوئے شوکت تھانوی کی مزاح نگاری پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''شوکت صاحب کی مزاح نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر بات میں مزاح پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ اوئی، نوج! مونڈی کاٹے، موئے، مردے! چل، ہٹ! دور، دفعان وغیرہ میں بظاہر کوئی مذاق معلوم نہیں ہوتا۔ ہم نے خود ان الفاظ کو عورتوں کے منہ سے بار بار سنا اور سنتے رہتے ہیں لیکن کبھی ہنسی نہیں آئی لیکن شوکت صاحب نے ان الفاظ کو سن کر ان میں مزاح کا زبردست پہلو نکال لیا اور انہیں مضامین کی صورت دے کر ایک دلچسپ کتاب لکھ ڈالی۔''[2]

۱۔ روزنامہ ''طوفان''، لکھنؤ، ۴ جولائی، ۱۹۳۸ء، ''مد و جزر''، ص ۲۔

۲۔ مونڈی کاٹے، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ، تعارف نسیم انہونوی، ص ۳-۴۔

اس کتاب کا پہلا مضمون ''نگوڑے، مونڈی کاٹے'' ہے۔ یہ خواتین کی وہ مہذب گالیاں ہیں جن کو شریف زادیاں رائج الوقت گالیاں نہ بک سکنے کی وجہ سے گالیاں بکنے کے موقع پر استعمال کرتی ہیں اور انہیں اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ یہ گالیاں نہیں ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں نے اپنے غصہ کے اظہار کے لیے یہ گالیاں ایجاد کی ہیں اور انہیں شرفاء کے یہاں بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے۔ نگوڑے اور مونڈی کاٹے کے معنی لغات میں تلاش کے باوجود ہمیں نہیں مل سکتے۔ یہ لکھنؤ کے ماحول میں وضع کیے گئے چند الفاظ صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو لکھنوی تہذیب اور معاشرت کو جانتے ہوں۔ شوکت تھانوی اپنے مضمون میں ''نگوڑے'' کے معنی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''جہاں تک ہم کو معلوم ہے نگوڑے کے معنی تنہا کے ہیں لیکن بعض موقعوں پر نکمے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے مگر جس وقت عورتیں خود اپنی ذات کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتی ہیں اس وقت اس کے معنی خاکسار کے بھی ہوتے ہیں اور کبھی کمبخت کے بھی۔ مثلاً ساس اور بہو کی قیامت خیز جنگ کے بعد جب پڑوسن بیچ بچاؤ کے لیے آتی ہیں اس وقت ساس کا بیان ہوتا ہے کہ ''میں نگوڑی نہ اچھائی میں نہ برائی میں، بیگم صاحب ہاتھ دھو کے میرے سفید چونڈے کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ ہر وقت یہی کل کل ہے'' اور بہو بھی آواز ملا کر اپنا بیان دیں گی'' تو بُوا نگوڑی نے آخر اس وقت کیا کیا تھا جو تم بڑبڑانے جاتی ہو''۔ ان دونوں بیانوں میں مہذب ساس اور مہذب بہو نے بجائے ایک دوسرے کو کہنے کے خود اپنے کو کمبخت کہا ہے۔''[۱]

ہندوستان میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً عورتوں اور مردوں کی زبان میں کچھ اختلاف ہے اور اس حد تک اختلاف ہے کہ اگر کسی باقاعدہ اردو داں سے ان الفاظ کا مطلب پوچھ لیا جائے تو وہ بھی بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ شوکت تھانوی نے اپنے ایک اور مضمون ''اوئی، نوج'' میں ان دونوں الفاظ کے مختلف معنی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں الفاظ اپنے اندر معنی کی تہیں رکھتے ہیں اسی لیے اپنی روزمرہ کی گفتگو میں لکھنؤ کی خواتین اکثر ان الفاظ کا استعمال کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ''اوئی'' ایک وسیع

---

[۱] شوکت تھانوی: مونڈی کاٹے، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ، ص ۸، ۹۔

المعنی لفظ ہے۔ اس کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> ''اوئی'' کو استعمال کرنے والیاں اس سے بخوبی واقف ہوں گی کہ ''اوئی'' کے کوئی ایک معنی نہیں بتا سکتا مگر ''اوئی'' کے سننے والے اس کو سوائے ایک مہمل لفظ کے اور کچھ نہیں سمجھتے لیکن آپ ہی بتائیے کہ اگر یہ لفظ مہمل ہوتا تو اس کے لیے اتنا اہتمام کیوں، کہ کلمہ کی انگلی کو لب زیریں کے قریب لا کر یا ناک کے پاس پہنچا کر اس کو ادا کیا جاتا ہے اور کچھ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ اس کو مہمل کہنے کو دل نہیں چاہتا بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ اگر بیگم قسم کی عورتیں ''اوئی'' کہنا چھوڑ دیں تو ان کا اول تو عورت رہنا مشکل ہے اور اگر رہیں بھی تو لیڈیز ہو کر رہ جائیں گی۔''[۱]

اسی مضمون میں ''نوج'' کے معنی تلاش کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> ''اسی خاندان کا لفظ ایک اور بھی ہے جس کو ''نوج'' کہتے ہیں اور اس کو ہوش سنبھالنے کے وقت سے تا دم تحریر مضمون ہذا سننے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ''خدا نہ کرے'' مثلاً کوئی بیگم صاحبہ کہیں ''نوج ہوا میں ریل پر بیٹھوں'' تو اس کے معنی ہوں گے ''خدا نہ کرے ہوا میں ریل پر بیٹھوں'' لیکن استعمال کی کثرت کے اعتبار سے ''اوئی'' کے بعد اگر کسی کا نمبر آتا ہے تو وہ یہی ''نوج'' ہے جس کو ایک سوائے اردو کے اور زبانوں کی کتب لغات چھان چکنے کے بعد بھی کہیں نہ پا سکیں گے۔''[۲]

اوئی اور نوج کی زبان مردوں کے لیے مہمل سہی لیکن عورتوں کے لیے یہ کوئی مضحک چیز نہیں ہے البتہ اگر کوئی مرد عورتوں والی اوئی، نوج شروع کر دے تو وہ عورتوں کے نزدیک بھی تماشا ہو جائے گا اور مرد بھی اس کی ہنسی اڑائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ الفاظ صرف عورتوں نے ہی اپنی ضرورت کے مطابق ایجاد کیے ہیں اور انھی کی زبان پر اچھے لگتے ہیں۔

۱۔ شوکت تھانوی: مونڈی کاٹے، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ، ص ۱۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۱۹۳۵ء میں شوکت تھانوی نے اسی رسالہ میں قسط وار مسلسل افسانہ ''سوتیلا چاہ'' کے نام سے لکھنا شروع کیا جسے بعد میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

شوکت تھانوی کا اخبار ''طوفان'' ایک سال نکلنے کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قائم ہو چکا تھا۔ اب شوکت تھانوی لکھنؤ ریڈیو کے باقاعدہ ملازم ہوگئے۔ پھر فلم سے وابستہ ہو کر لاہور آ گئے۔ اس عرصہ میں بھی وہ اپنے مضامین اور افسانے رسالوں میں چھپواتے رہے۔ ۱۵- اگست ۱۹۵۷ء کو روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں کالم نگار کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور فکاہیہ کالم ''وغیرہ وغیرہ'' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ۱۷- اگست ۱۹۵۷ء کو روزنامہ جنگ کراچی میں شوکت تھانوی کا پہلا فکاہیہ کالم ''وغیرہ وغیرہ'' کے عنوان کے تحت شائع ہوا۔ شوکت تھانوی سے پہلے ''جنگ'' کراچی میں مجید لاہوری فکاہیہ کالم لکھتے تھے۔ ان کے کالم کا نام ''حرف و حکایت'' تھا۔ روزنامہ ''جنگ'' کے علاوہ کئی اخبارات میں فکاہیہ کالم اسی نام سے چھپتا تھا، اس لیے شوکت تھانوی نے اپنے کالم کا نام بدل دیا۔ اس کالم کا نام ''وغیرہ وغیرہ'' کیوں رکھا گیا؟ اس سوال کا جواب شوکت تھانوی نے اس طرح دیا ہے:

> ''طے یہ پایا کہ اس کالم کا نام کچھ اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اس کالم سے مجید لاہوری کی وابستگی بھی ظاہر ہوتی رہے اور عنوان کی انفرادیت بھی قائم رہے چنانچہ غور و فکر کے بعد اس کالم کا نام ''وغیرہ وغیرہ'' اس لیے طے کیا گیا کہ یہ عنوان بھی مجید لاہوری کا اپنایا ہوا تھا اور اسی عنوان کے تحت وہ ریڈیو پاکستان سے ہفتہ وار گل افشانیاں فرما رہے تھے اور اس عنوان کی ہمہ گیری سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔''[1]

اسی کالم میں روزنامہ ''جنگ'' سے اپنی وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جہاں تک میرا تعلق ہے میں اخبار ''جنگ'' سے اپنی وابستگی کے متعلق صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ:

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اب سے تقریباً بیس سال قبل ریڈیو نے جبکہ ریڈیو مشرف بہ پاکستان نہ ہوا

---

[1] شوکت تھانوی: ''وغیرہ وغیرہ'' روزنامہ جنگ، ۱۷- اگست ۱۹۵۷ء۔

تھا اور آل انڈیا ریڈیو تھا ، مجھ کو صحافت سے چھینا تھا اور آج ریڈیو پاکستان نے صحافت کی یہ امانت پوری صحافت کو سونپ دی ہے چنانچہ میں اپنے مرکز کی طرف واپس آ کر بارگاہ خداوندی میں سر بسجدہ ہوں ۔ معلوم نہیں یہ سجدۂ شکر ہے یا سجدۂ سہو، بہرحال میری زبان پر اس بارگاہ میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں'

روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں رہ کر شوکت تھانوی نے اس اخبار کے لیے کیا کچھ لکھا ، اس کا اظہار انھوں نے ایک کالم میں اس طرح کیا ہے کہ

''۱۵۔ اگست ۱۹۵۷ء کو جب میں بر سر جنگ آیا ہوں اور اس کے عہدۂ ادارت میں آ کر ادرتی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو مجھ کو میرے فرائض بتاتے ہوئے میر خلیل الرحمان صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ ایڈیٹوریل اور شذرات وغیرہ لکھتے رہیں گے ۔ میں نے وضاحت چاہی کہ وغیرہ وغیرہ سے کیا مراد ہے آپ کی ؟ میر صاحب نے فرمایا کہ مثلاً مزاحیہ کالم''[1]

۱۸۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو شوکت تھانوی نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے تحت ''وغیرہ وغیرہ'' کے سلسلے کا آخری کالم لکھا اور آئندہ کے لیے اپنے اس ذمہ کو ابراہیم جلیس صاحب کے حوالہ کیا ۔ انھوں نے اپنے آخری کالم میں لکھا کہ

''میں یہ کالم اگر پورے اعتماد کے ساتھ کسی کے سپرد کر سکتا تھا تو وہ صرف ابراہیم جلیس ہی ہو سکتے تھے جو میری طرح آپ کو بھی بہت جلد اپنی تحریروں کا گرویدہ بنا لیں گے اور آپ کو مجھ سے یہ شکایت پیدا نہ ہوگی کہ میں نے محض اپنے سر کا بوجھ اتارا ہے۔ ''[2]

ابراہیم جلیس نے اپنے پہلے کالم میں شوکت تھانوی کی تائید اس طرح

۱۔ شوکت تھانوی : ''وغیرہ وغیرہ'' روزنامہ جنگ کراچی ۱۷ اگست ۱۹۵۷ء ۔

۲۔ ایضاً ، ۱۸ مارچ ۱۹۵۹ء ۔

کی کہ ''جنگ'' میں آنے میں میرے محترم دوست جناب شوکت تھانوی صاحب کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ انہیں عرصۂ دراز سے پتہ تھا کہ مجھے ''جنگ'' کا بڑا شوق ہے اسی لیے انہیں ہر وقت میرے مستقبل کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ چنانچہ بالآخر انہوں نے نہ مجھے ''تھانے'' جانے دیا اور نہ میدان جنگ پر بلکہ بڑے ہی مشفقانہ انداز میں نصیحت کی ''بھیا۔ جنگ پر جاؤ گے تو ''کام آ جاؤ گے'' لیکن اگر جنگ میں آؤ گے تو ''کالم'' لکھو گے دام کماؤ گے نام پاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔''[1]

حکومت نے کراچی کی بجائے اسلام آباد کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تو روزنامہ ''جنگ'' کا ایڈیشن راولپنڈی سے بھی نکلنا شروع ہوا۔ اور شوکت تھانوی کو راولپنڈی کے لیے اس کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ راولپنڈی سے روزنامہ جنگ کا پہلا پرچہ بارہ صفحات پر مشتمل ۱۳۔ نومبر ۱۹۵۹ء کو نکلا جس میں شوکت تھانوی نے ''پہاڑ تلے'' کے نام سے ایک فکاہیہ کالم لکھنا شروع کیا۔

''پہاڑ تلے'' لکھنے کا سلسلہ شوکت تھانوی نے تادم مرگ جاری رکھا۔ ۷ مئی ۱۹۶۳ء کے روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی میں ان کا آخری ''پہاڑ تلے'' چھپا جس میں ادارے کی جانب سے یہ وضاحت کی گئی تھی۔

> ''آج جناب شوکت تھانوی کو رحلت فرمائے دو دن گزر گئے مگر یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ان کا آخری کالم نذر قارئین ہے۔''[2]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ۷ مئی ۱۹۶۳ء کو انتقال کا تیسرا دن تھا چونکہ شوکت صاحب کا انتقال ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا۔ اس طرح یہ کہنا کہ ''ان کو رحلت فرمائے دو دن گزر گئے'' درست نہیں ہے۔ ''پہاڑ تلے'' کے آخری کالم کا پہلا پیراگراف:

> ''مجھے افسوس ہے کہ میں کئی دن کی غیر حاضری کے بعد آج حاضر خدمت ہو رہا ہوں اور بے حد نادم ہوں کہ بغیر معزز قارئین کی اجازت حاصل کیے بیمار ہو کر صاحب فراش رہا ہوں۔ آج جبکہ بستر علالت سے اٹھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے

۱۔ ابراہیم جلیس: وغیرہ وغیرہ، روزنامہ جنگ کراچی، ۱۹ مارچ ۱۹۵۹ء۔

۲۔ روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی ''پہاڑ تلے''، ۷ مئی ۱۹۶۳ء۔

> محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس وقت بھی کرسی پر نہیں بیٹھا ہوں بلکہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہوں اور بار بار ایک ایسا غوطہ کھا جاتا ہوں کہ ہاتھ غیر ارادی طور پر حفاظتی بند ٹٹولنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بہرصورت یہ ''پھنک'' ہوائی سفر میں موسم کی خرابی کے باعث نہیں ہے بلکہ سفر زندگی میں صحت کی خرابی کے باعث ہے اور چونکہ علالت کو صحت کی زکوٰۃ کہتے ہیں لہذا اس زکوٰۃ میں تھوڑا بہت میں خود تقسیم ہو کر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں اور ہر چند کہ آپ کو اپنے لیے میں نے دعا کی زحمت نہیں دی مگر خود آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ جو نوعیت میری بیماری کی تھی اللہ تعالیٰ اس سے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔ اس لیے کہ یہ مرض تھا ہی عجیب و غریب ۔''

اسی کالم کا آخری پیراگراف یہ ہے :

> ''آپ بھی کہیں گے کہ اتنے دن تک ایک تو غیر حاضر رہا اور اب حاضر ہوا ہے تو شفاخانہ کھول کر بیٹھ گیا ہے مگر یہ تفصیلات بھی عرض کرنا ضروری تھیں کہ آپ کو میری رخصت علالت منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو اور اگر اب بھی آپ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ طلب کریں تو میں ایک چھوڑ دو سرٹیفکیٹ پیش کر سکتا ہوں ۔ ایک ایسا دوسرا اس مریض کا جس کی دوا بھی مجھ ہی کو پینا پڑی ۔ دعا فرمائیے ، اب میں آپ کی خدمت میں حاضر رہوں اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے پائیں کہ میں مارے غم خواری کے عوام الناس کی دوا پی کر اپنا ستیاناس کرتا پھروں ۔ میں قوم کا غم کھانے کو تیار ہوں مگر قوم کی دوا پینے کو ہرگز تیار نہیں ہوں ۔''[1]

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے ایک کامیاب صحافی تھے اور اردو صحافت کی تاریخ میں ان کو ایک ممتاز مقام ملنا چاہیے ۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک کامیاب اخبار نویس میں ہونی چاہییں ۔ ایک اخبار نویس کے لیے زبان و بیان پر قدرت ، مشاہدہ کی گہرائی ، قوت امتیاز اور احساس ذمہ داری کی صفات کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے ۔

۱- روزنامہ جنگ راولپنڈی ، ۷ مئی ۱۹۶۳ء ۔

شوکت تھانوی نے لکھنؤ کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ لکھنؤ کے صاحبان علم و ادب کی صحبت نے ان کو اپنی فطری صلاحیتوں کے ابھارنے اور نکھارنے کے ایسے مواقع فراہم کیے کہ بہت جلد ان کا شمار اردو زبان و ادب کے ممتاز ادیبوں میں کیا جانے لگا اور ملک کے مشہور رسائل میں ان کے مضامین، افسانے اور شاعری چھپنا شروع ہو گئی۔ فکاہیہ کالم نگاری کا آغاز شوکت تھانوی نے ۱۹۲۸ء میں کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء تک جاری رہا۔ اس قسم کے کالموں میں چھوٹی سی بات کو شگفتہ انداز میں بڑا بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کالم نگار زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ شوکت تھانوی زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے، اس لیے فکاہیہ کالم نگاری کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔

زبان و بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی کے لیے وسیع مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اخبار نویس کا دماغ اس کیمرے کی مانند ہونا چاہیے جو چیزوں کو دیکھتے ہی ان کے نقوش اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ شخص جو اپنے گرد و پیش ہونے والی تبدیلیوں کا شعور نہیں رکھتا، ایک کامیاب اخبار نویس نہیں بن سکتا۔ شوکت تھانوی نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۳ء تک اخبار میں مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ مدیر کی حیثیت سے بہت سے اخبارات میں کام کیا۔ ”طوفان“ کے نام سے اپنا اخبار نکالا اور آخر میں روزنامہ ”جنگ“ راولپنڈی سے وابستہ رہے۔ ان سب اخبارات کے ادارتی مقالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت تھانوی گرد و پیش کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ اس دور کا کوئی اہم قومی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس تک ان کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔

تیسری صفت جو ایک صحافی میں ضروری سمجھی جاتی ہے وہ قوت امتیاز ہے۔ اسی قوت کے باعث اخبار نویس ضروری اور غیر ضروری باتوں میں تمیز کرتا ہے۔ شوکت تھانوی کے اخبارات دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ قوت امتیاز کتنی زیادہ تھی۔ شوکت تھانوی کو اداریہ لکھنا ہو یا فکاہیہ کالم، سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہے۔ شوکت تھانوی کے موضوعات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ماضی کے مسائل کے بجائے اپنے عہد کے قومی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں کہیں کوئی غیر ضروری بات نظر نہیں آتی۔

احساس ذمہ داری کی صفت میں ہم شوکت تھانوی کو ان کے معاصرین سے بہت آگے پاتے ہیں ۔ وہ خوب جانتے تھے کہ صحافت ایک کاروباری فن ہے اور وہ صحافی جو اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے کبھی صحافتی دنیا میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اخبار نویس مالی منفعت کی خاطر اخبار میں اشتہارات کی اتنی بھرمار کر دیتے ہیں کہ اس میں خبروں ، ادارتی مقالات اور مضامین کے لیے پوری گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ کبھی کبھی اخباروں کے کئی کئی کالم صرف ایسے مضامین سے پر کر دیے جاتے ہیں جن کا تعلق باہمی جھگڑوں سے ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین نہ ناظرین کے لیے دلچسپ ہوتے ہیں اور نہ مفید ۔ شوکت تھانوی کا خیال تھا کہ اخباروں کے کالم اخبار نویسوں کے ذاتی حملوں اور شخصی تنازعوں کے بجائے قومی مفادات کے لیے محفوظ ہونے چاہییں ۔ شوکت تھانوی نے صحافت میں قدم رکھا تو انہیں سید جالب جیسے مشہور و معروف صحافی کی صحبت اور تربیت سے استفادہ کا موقع ملا ۔ انہوں نے شوکت تھانوی جیسے شاعرانہ مزاج رکھنے والے شخص کی تربیت کچھ اس طرح سے کی کہ ان میں ذمہ داری کا احساس روز بروز بڑھتا چلا گیا اور انہوں نے اپنے اخبار کو ذاتی لڑائیوں کا اکھاڑہ نہیں بننے دیا ۔ وہ اس طریقہ کار کو انتہائی برا سمجھتے تھے کہ اخبارات میں ایک دوسرے کی ذات پر حملہ کیا جائے اور ایک دوسرے کے متعلق پبلک میں غلط فہمی پھیلائی جائے ۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر ایک اخبار نویس اتفاقاً دوسرے اخبار نویس پر کوئی ذاتی حملہ کرتا ہے تو دوسرے اخبار نویس کو حتی الامکان جوابی کارروائی نہیں کرنی چاہیے ۔ اس قسم کی جوابی کارروائی کو وہ صرف اس صورت میں جائز قرار دیتے ہیں جب کہ کسی اخبار یا اس کے قدردانوں کی نسبت کوئی غلط فہمی پھیلائی جائے مگر ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس جواب میں سنجیدگی اور متانت سے بے نیاز ہو جانا کس طرح درست نہیں ۔

ہم عصروں سے تعلقات کے بارے میں شوکت تھانوی فراخ دل اور روشن خیال واقع ہوئے تھے ۔ وہ ان کے لیے اپنے دل میں رشک و رقابت کے جذبات نہیں رکھتے تھے ۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم عصر اخباروں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے اخبار میں ان کی تعریف فراخدلی کے ساتھ کرتے رہے ۔ ہم عصروں سے تعلقات کے سلسلہ میں یہ فراخدلی شوکت تھانوی کی صحافتی

زندگی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو اخبار نویسوں کو آج بھی مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اخبارات میں قومی ہمدردی کے جذبات کا اظہار ایک ایسی عام بات ہوگئی ہے جس کو اگر مگرمچھ کے آنسوؤں سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر اخبار نویس ضروری سمجھتا ہے کہ قومی مصیبت کے زمانے میں پرجوش اداریے لکھے اور ایسے زوردار خیالات کا اظہار کرے کہ قوم اس کی غمخواری کی قائل ہو جائے اور اخبار کو ہاتھوں ہاتھ خریدنے لگے لیکن ایسے اخبار نویسوں کی تعداد بہت کم ہے جو اپنے دل میں قوم کا حقیقی درد رکھتے ہوں اور تحریری غم خواری کے علاوہ عملاً بھی کوئی قومی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ شوکت تھانوی کا شمار ایسے اخبار نویسوں میں ہوتا ہے جو تحریری غم خواری کے ساتھ ساتھ عملی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ شوکت تھانوی بھارت سے آنے والے بدحال مہاجرین کی ہر خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ”پاکستان ہمارا“ اور ”قاضی جی“ میں انھوں نے قومی اتحاد و اتفاق پر ہمیشہ زور دیا ہے۔

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کی ایک ممتاز خصوصیت ان کا وہ طرز تحریر ہے جس میں انھوں نے اعتدال اور توازن کو اپنے پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غیر معتدل انداز تحریر اختیار کرنے والے اخبار نویس معتدل اور متوازن انداز بیان والے اخبار نویسوں کے مقابلے میں جلدی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ شوکت تھانوی اس طریقہ کار کو سستی شہرت کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے باوجود زبردست اہل قلم ہونے کے اپنی تحریروں میں اعتدال اور توازن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے صحافتی کارنامے شاہد ہیں کہ اگر ایک طرف وہ مدح و معائب میں مبالغے سے گریز کرتے رہے تو دوسری طرف انھوں نے نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کی ان خصوصیات کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کے ارتقاء میں شوکت تھانوی کا ایک اہم حصہ ہے اور وہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کے اخبار نویس بھی ہیں۔